ولی۔ شخصیت اور فن

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودہ کی

پی ایچ. ڈی. ڈگری (اردو)

کے لئے تحریر کردہ

تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

مسیح الزماں ایچ. انصاری

نگراں و رہنما

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری

ایم۔اے، ایم۔فِل، پی ایچ. ڈی. (اردو)

ولی

شعبۂ فارسی، عربی اور اردو

فیکلٹی آف آرٹس

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودہ

وڑودرا، گجرات۔

ستمبر۔ ۲۰۰۶

WALI
SHAKHSIYAT AUR FAN

Summary of the Ph.D. Thesis Submitted to
The Maharaja Sayajirao University of Baroda
For the Award of Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN URDU

BY
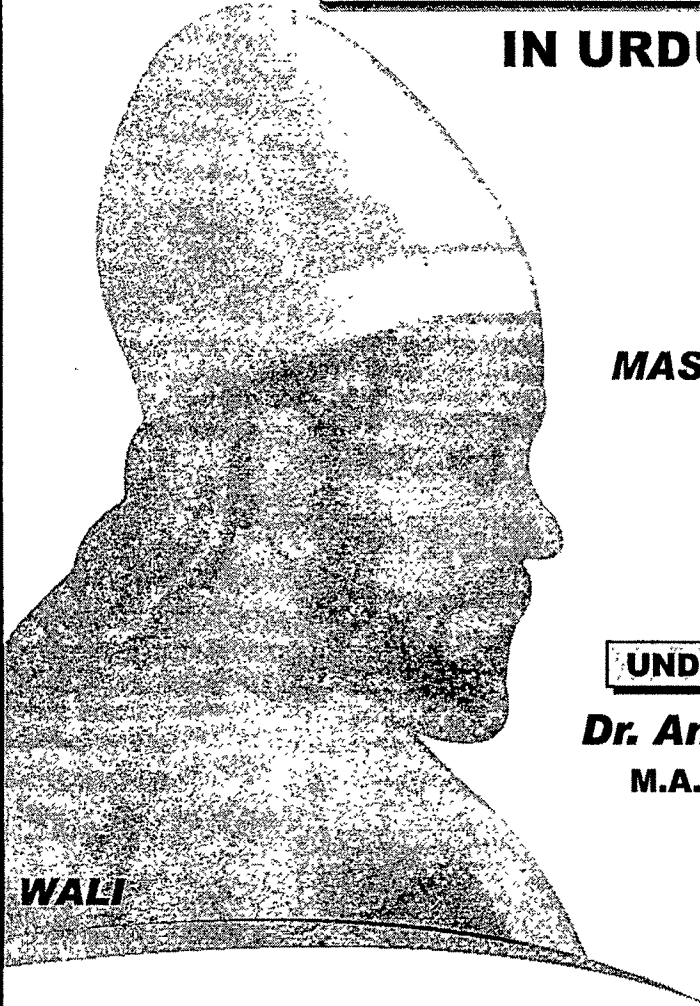
MASIHUZZAMA ANSARI

UNDER THE GUIDANCE OF

Dr. Anwar Zaheer Ansari
M.A., M.Phil., Ph.D. (URDU)

Department of Persian, Arabic and Urdu
Faculty of Arts
Maharaja Sayajirao University of Baroda
Vadodara, Gujarat.

September - 2006

ولیؔ۔ شخصیت اور فن

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودہ کی

پی ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اردو)

کے لئے تحریر کردہ

تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

مسیح الزماں ایچ۔ انصاری

نگراں و رہنما

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری

ایم۔اے، ایم۔فل، پی ایچ۔ ڈی۔ (اردو)

شعبۂ فارسی، عربی اور اردو

فیکلٹی آف آرٹس

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودہ

وڑودرا، گجرات۔

ستمبر۔ ۲۰۰۶

Dedication

انتساب

اپنی شریکِ حیات

ناظمہ کے نام

جن کی پُر خلوص وفاؤں نے

مجھے عزم وحوصلہ بخشا۔

Content

فہرست ابواب

Acknowledgement

ہدیۂ تشکر

میں بے حد شکر گزار ہوں اُس پاک پروردگار کا جس نے مجھ ناچیز کو علم وادب کی خدمت کرنے کی سعادت بخشی۔

اُردو میں پی ایچ۔ڈی کرنے کی میری دیرینہ خواہش تھی، لہٰذا اس خواہش کی تکمیل کے اِس یادگار موقع پر، جب کہ میرا یہ تحقیقی مقالہ پی ایچ۔ڈی ڈگری کے لئے عملہ جامہ پہن کر اِس یونیورسٹی کو سپرد کیا جارہا ہے، لہٰذا اِس مقالے کی تکمیل کے آخری مرحلے میں، میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے بزرگوں، کرم فرماؤں اور احباب کا شکریہ ادا کرنا اپنی اخلاقی ذمّہ داری اور خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ سچّی لگن اور نیک نیت ہو تو منزلِ مقصود ضرور ملتی ہے۔ اور میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرے والدین کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ اپنی کم علمی کے باوجود اِس اہم لیکن متنازعہ موضوع پر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقالہ مکمل کرنیکی توفیق عطا فرمائی۔

اِس مقالے کی تیاری میں اپنے نگراں ورہنما محترم ڈاکٹر انور ظہیر انصاری صاحب کی پُر خلوص کوششوں کا احسان مند ہوں جن کی شفقت، کرم فرمائیوں اور گراں قدر مشوروں کی بدولت نا مساعد حالت میں بھی مجھے روشنی ملتی رہی ہے۔ مجھے اِس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ میں اُن کی غیر معمولی توجہ، شفقت آمیز اعانت اور ہدایات ورہنمائی سے بہت سی تیرہ وتاریک وادیوں میں بھٹکنے سے بچتا رہا ہوں۔ نیز یہ کہ اُستاذی محترم نے اِس مقالے کے ابواب کی ترتیب وتشکیل میں ہمہ جہت رہنمائی فرمائی اور اپنی ہر طرح کی امداد سے مجھے اِس قابل بنایا کہ میں اِس مقالے کو مقررہ مدّت کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچا سکا۔ استاذی محترم نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود انتہائی خلوص ومحبت کے ساتھ مجھے اپنا تعاون دیا اور ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں ان کی خدمت میں خلوصِ دل کے ساتھ ہدیۂ تشکّر پیش کرتا ہوں اور اس لئے اور بھی کہ انھوں نے اِسی یونیورسٹی سے اُردو کی پہلی پی ایچ۔ڈی کر کے اُردو میں ریسرچ کی راہ ہموار کی۔

میں محترم المقام ڈاکٹر وجیہ الدین صاحب کا بھی سراپا ممنون ہوں کہ انھوں نے ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے اس راہ میں حائل تمام دشوار مرحلوں میں میری معاونت فرمائی۔ اُن کی یہ پرخلوص معاونت میرے اِس کام کو

آخری انجام تک پہنچانے میں بے حد معاون ثابت ہوئی۔ اِن کے علاوہ صدرِ شعبہ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر آر۔ جے۔ شاہ کا خصوصاً منّت کش ہوں کہ انھوں نے میرے رجسٹریشن میں ذاتی دلچسپی لی اور پروفیسر محمود صدیقی صاحب نے اس کام کو جلد پورا کرنے کی صلاحوں اور دعاؤں سے نوازا۔ اور ڈاکٹر مقصود احمد صاحب نے وقتاً فوقتاً اپنے چند مفید مشوروں سے بہرہ ور کیا۔ اِن حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

محترم جناب نصیر میاں قاضی صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو - فارسی، گجرات کالج، احمد آباد) کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ موصوف کی شفقت اور حوصلہ افزائی نے کبھی بھی مجھے شعبۂ اردو میں تنہائی اور کم علمی کا احساس نہیں ہونے دیا، اُن کی یہ سرپرستی نہ صرف میرے لئے طمانیت اور ذہنی آسودگی کا سبب بنتی رہی ہے بلکہ مشکل حالات کی آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے حوصلہ بھی بخشتی رہی ہے۔

محترم جناب ندیم انصاری صاحب کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جن کی خصوصی توجہ اِس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں رہی۔ موصوف نے نہایت شفقت اور حوصلہ افزائی کے ساتھ میری علمی اور ادبی رہنمائی فرمائی۔ اُن کی گفتگو اور مباحث سے مجھے اصلاح اور خود احتسابی کے مواقع فراہم ہوتے رہے۔

میری ذہنی اور ادبی تربیت میں جو لوگ اپنی نیک دعاؤں اور مشوروں کے ساتھ شریک رہے اُن کا بھی شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ خصوصاً عالی جناب پروفیسر وارث حسین علوی اور پروفیسر محی الدین بمبئی والا صاحبان کی خصوصی کرم فرمائیوں اور بیش قیمت مشوروں نیز تعاون کا ذکر ضروری ہے۔ پرفیسر محی الدین بمبئی والا صاحب نے ”حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر“ سے بہت سی کتابیں فراہم کرنے میں میری اعانت کی۔ اور اس لائبریری کے زیرِ اہتمام ہونے والے نیشنل سیمیناروں میں مجھے مقالات پڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔

حالانکہ اپنی اہلیہ ناظمہ (لیکچرر- اردو، گجرات کالج، احمد آباد) کا سپاس گزار مجھے پہلے ہونا چاہیئے تھا کہ اُنھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے ساتھ ساتھ میری اپنی تمام گھریلو ذمّہ داریوں کو بھی اِس عرصے میں تنِ تنہا بحسن و خوبی انجام دیا اور میری عدم توجّہی کو برداشت کرتے ہوئے اِس مقالے کی تکمیل میں سازگار ماحول بنائے رکھا۔ میں اِن تمام دوست واحباب کا بھی شکر گزار ہوں جو میری ترقّی اور کامیابی کے خواہاں ہیں اور میری کامیابی پر اپنی مسرّت کا اظہار کرتے ہیں۔

مسیح الزماں انصاری

ولؔی
پیدائش : ۱۶۶۸ء
وفات : ۱۷۴۴ء
شہرت ہوئی ہے جب سے ترے شعر کی ولؔی
مشتاق تجھ سخن کا عرب تا عجم ہوا

Preface

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میں اِسے اپنی عین خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ بفضلِ خدا میری ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت ایک علمی گھرانے میں ہوئی ہے۔ میرے والدین اعلیٰ سند یافتہ تو نہیں ہیں لیکن مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کے ضرور خواہش مند تھے۔ اِس لئے میری تعلیم اور تربیت پر انھوں نے خصوصی توجّہ بھی دی۔ میرے والدِ بزرگوار کو اُردو ادبیات کے مطالعوں کا بے حد ذوق رہا ہے اور اپنے اِس ذوق کے تسکین کی خاطر وہ ابتداء سے ہی کتابیں خریدتے رہے ہیں۔ جس نے آہستہ آہستہ ایک چھوٹی سی لائبریری کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اِس طرح مختلف ادبیات و ادبی کتب اور رسائل وجرائد کے مطالعے نے ابتداء سے ہی مجھ میں اُردو زبان وادب سے دلچسپی پیدا کردی۔ لہٰذا بچپن سے ہی گھر پر ذوقِ علم وادب اور شوقِ مطالعہ کو پروان چڑھانے کے خوب مواقع ملے اور ۱۹۸۹ء میں ہائی اسکول سے فراغت کے بعد اُردو ادب کی تعلیم کی طرف رجحان نے سنجیدہ صورت اختیار کرلی لیکن عدم رہنمائی کے باعث میں نے بی۔کام میں داخلہ لے لیا اور تین سال بعد ۱۹۹۲ء میں ڈگری بھی مل گئی۔ لیکن چونکہ ابتداء سے ہی اُردو میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش ذہن ودل میں موجزن تھی لہٰذا ازسرِ نو ۱۹۹۵ء میں گجرات یونیورسٹی سے اُردو میں بی۔اے اور ۱۹۹۸ء میں اردو سے ایم۔اے بھی کرلیا اور یہ میری خوش بختی تھی کہ ایم۔اے سے فراغت کے فوراً بعد احمدآباد کے قدیم ترین کالج ''گجرات کالج'' میں عارضی طور پر بحیثیت لیکچرر میرا تقرر بھی ہوگیا۔ لیکن محض ایم۔اے کے ساتھ لیکچرر شِپ جاری رکھنا وہ بھی اس زمانے میں اور بہت دور تک مشکل تھا کیوں کہ پی ایچ۔ڈی۔ کے علاوہ نیٹ (Net) کا بار بھی وراثت میں ملا تھا چنانچہ پی ایچ۔ڈی۔ کرلینے کی نیّت اور دیرینہ خواہشات کی تکمیل کی خاطر عمل پیرا ہوا لیکن اس راہ میں حائل سب سے بڑا مرحلہ موضوع کا تھا۔ متعدّد عنوانات ذہن میں آتے لیکن طبیعت کو راس نہ آتے، لہٰذا اِس سلسلے میں اپنے نگراں ڈاکٹر انورظہیر انصاری صاحب سے رجوع کیا، ان کی قابلِ قدر ہدایات اور رہنمائی نے میری ہمت افزائی کی۔ لیکن اسی اثناء میں ۲۰۰۲ء میں گودھرا کے حادثے کے بعد پورے گجرات میں قتل وغارت گری کا آتشیں سلسلہ

شروع ہوگیا۔ احمد آباد میں اِس کا زور کچھ زیادہ ہی تھا لٰہذا زندہ تو زندہ مردوں کو بھی نہیں بخشا گیا اور احمد آباد میں شاہی باغ انڈر برج کے پاس واقع وؔلی کی مبیّنہ قبر کو بھی شر پسندوں نے منہدم کر دیا اور اس واقعے کے بعد اردو ادب وشاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے نہایت افسوس کے ساتھ اِس حادثے کی مذمّت کی، ساتھ ہی اُردو اخبارات، اردو تنظیموں، نیز دیگر زبانوں کی ادبی تنظیموں اور ساتھ ہی ادبی اداروں نے اِس مزار کے منہدم ہونے پر گجرات سرکار سے اِس کو دوبارہ تعمیر کرانے کا پر زور مطالبہ کیا۔ اِس واقعے کے بعد ''گجرات اردو ساہتیہ اکادمی'' اور ''درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر'' کے زیرِ اہتمام وؔلی پر کئی نیشنل سیمینار منعقد ہوئے۔ اور ان سیمیناروں میں راقم الحروف کو مقالے کی صورت میں اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔

احمد آباد میں موجود وؔلی کے مزار کو منہدم کر دینے کے بعد سے ہی وؔلی موضوعِ بحث بن گئے چنانچہ اِن سیمیناروں میں بھی علمائے ادب اپنے مقالات میں وؔلی کے متعلق مذکور متنازعات کو زیرِ بحث لاتے رہے جن میں وؔلی کی جائے پیدائش، نام، جائے وفات وغیرہ کا ذکر خصوصی طور پر ہوا۔ یوں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اِن علمائے ادب نے، وؔلی کے متعلق مذکور اختلافات پر اپنی آراء کا اظہار کیا۔

وؔلی کے ان متنازعات کے متعلق چونکہ میرے ذہن میں پہلے سے ہی تجسّس قائم تھا اور پھر اِن تمام حالات کے رونما ہونے سے یہ بات میرے ذہن نشین ہوئی کہ آخر اُردو کا اتنا بڑا شاعر اِن متنازعات میں کیوں کر الجھا ہوا ہے؟ مذکورہ تمام حالات کے مدّ نظر یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وؔلی پر ہی تحقیقی کام کیا جائے۔ یوں تو اپنے تعلیمی سفر کے دوران وؔلی کے مطالعے کا اکثر موقعہ ملا تھا اور اُردو کے اِس مایۂ ناز شاعر کے کلام سے بے حد محظوظ بھی ہوا تھا لیکن چونکہ مطالعہ بہت وسیع نہیں تھا لٰہذا تجسّس فطری تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ایک پرچے کی حیثیت سے پڑھنے پر کچھ متضاد بیانات میرے ذہن میں ضرور سوالیہ نشان بناتے رہے تھے، وہ یہ کہ کچھ لوگ وؔلی کو ''گجراتی'' بتاتے ہیں اور کوئی اُنھیں ''دکنی'' کہتے ہیں۔

دوسری ایک بات میرے ذہن میں یہ بھی تھی کہ وؔلی نے ایک طویل عرصے تک ''مدرسہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ (احمد آباد، گجرات)'' میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یوں وؔلی کا شہر احمد آباد سے کسی نہ کسی طرح تعلق قائم تھا اور راقم خود بھی ساکنِ احمد آباد ہونے کی وجہ سے یہ بات شدّت سے محسوس کیا کرتا تھا کہ کسی ایسے عنوان پر تحقیق کی جائے جس کا براہِ راست تعلّق گجرات سے ہو۔ لٰہذا وؔلی کے شہر احمد آباد اور گجرات کے تعلّقات کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا کہ وؔلی جن متنازعات کے خار زار میں الجھے ہوئے ہیں اُن کا تحقیقی مطالعہ کیا

جائے اور تمام ممکن الحصول گواہیوں، ثبوتوں، بیانوں اور مستند کوائف کی بنیادوں نیز مخالفین کی تمام تر آراء کا جائزہ لے کر وؔلی کی زندگی کے تمام متنازعات کا صحیح اور مدلّل انکشاف کیا جائے اور اُن کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے۔

وؔلی جیسے عظیم المرتبت شخص کا اتنے سب متنازعات میں گھرا ہونا اور اِن سلگتے ہوئے مسئلوں کا حل تلاش کرنا اور اُس پر قلم اُٹھانا مجھ جیسے طالبِ علم کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا کیوں کہ وؔلی کی زندگی کے حالات ایسے سردرد اور غم شدہ واقعات، نیز نام، وطنیت اور مدفن کے تعلق سے اِس قدر اختلافی تحریروں پر مبنی ہے کہ اُن کو پڑھ کر وؔلی پر تحقیق کرنے والا کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی اِن اختلافات کا شکار ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ مؤرّخین، مصنّفین اور محققین نے وؔلی کو نہ گجرات کا رہنے دیا اور نہ ہی دکن کا۔ لہٰذا وؔلی پر تحقیق کرنے والے ہر طالبِ علم کے لئے یہ اختلافات، متضاد بیانات، واقعات کا اختلاف وانتشار ایک ایسا طوفان ہے جس کی بھنور میں تحقیق کار الجھ کر رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ ان تمام علمائے ادب نے جب چاہا وؔلی کو مار دیا اور جہاں چاہا دفن کردیا۔ ایسا انھوں نے وؔلی کی محبت میں کیا یا علاقائیت کے جذبے سے معمور ہوکر لیکن وؔلی کے تعلق سے تحقیق، تلاش اور جستجو کو دشوار گزار اور ناہموار ضرور کردیا گیا۔

وؔلی کی شخصی زندگی یعنی اُن کے حالات، نام، وطنیت، حیات اور وفات کے تعلق سے محققین، مؤرّخین اور تذکرہ نگاروں کی پیدا کردہ اِن غلط فہمیوں کو ادب کا کوئی بھی طالبِ علم آسانی سے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ جس نے وؔلی کی زندگی کو اِن بھول بھلیّوں میں گم کردیا ہے۔ لہٰذا اِن گمراہ کن اختلافات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وؔلی کی سوانح حیات میں اتنے تضادات اور اختلافات کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ یہی وہ بنیادی سوال ہیں جو دراصل اِس تحقیقی مقالے کی بنیاد بنے۔

غرض یہ کہ وؔلی جیسی متنازع فیہ شخصیت کو موضوعِ بحث بنانا راقم الحروف کے لئے ایک مشکل امر تھا کیوں کہ وؔلی کی زندگی اُن کی شہرت کے سبب ادبی سیاست کا حصّہ بنی رہی ہے۔ اور موجودہ حالات کی روشنی میں وؔلی کی زندگی کے گذشتہ واقعات وحالات جو پردۂ خفا میں پڑے ہوئے ہیں اُن تک رسائی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ باوجود اِن تمام مشکلات کے راقم الحروف نے اُن تمام تذکروں کو جو وؔلی کے متعلق دستیاب ہوئے ہیں، اُن کا اور علمائے ادب کی تمام اختلافی اور متضاد تحریروں کا بغور مطالعہ کیا نیز وؔلی کے کلام کی ورق گردانی کر کے غیر جانب دارانہ طور پر وؔلی کی متنازع فیہ شخصیت سے متعلق شکوک وشبہات اور تضادات کو اُجاگر کرنے کے

لئے مختلف دلائل اور تاریخی حوالوں کے ذریعے سے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں وؔلی کے نام، وطنیت اور مدفن کے سلسلے میں بعض مشتبہ تحریروں کو تنقیح وتنقید کے بعد دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں وؔلی کے تعلق سے ہوئی ادبی لغزشوں کا نہایت ہی عرق زیری سے مطالعہ کر کے دیانت داری کے ساتھ شواہد کی روشنی میں حقیقت کا انکشاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اپنے دائرۂ اختیار میں آنے والے وؔلی کے کم وبیش اور ممکن الحصول ماٰخذات جہاں تک اس ناچیز کی رسائی ممکن تھی فیض اُٹھایا ہے اور اپنی ذہنی وسعت کے مطابق وؔلی پر تحقیق کی یہ ادنیٰ سی سعی کی ہے۔

آج وؔلی کی وفات کے تین سو سال بعد بھی اُن کی عظمت کا سکّہ قائم ہے اور کلامِ وؔلی کی مقبولیت اور معنویت کا چراغ ہنوز روشن ہے اور آج اگر اُردو شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اُن کے کلام کا دلدادہ ہے تو اُس کی وجہ یہ رہی ہے کہ وؔلی کی طبیعت جدّت پسند واقع ہوئی ہے۔ یوں تو وؔلی سے قبل غزل ضرور موجود تھی لیکن اُس کا دائرہ نہایت تنگ تھا اور اُسے محض عورتوں سے بات کرنے اور اِس قسم کے عاشقانہ خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں اُردو غزل عام طور سے خواتین کے حسن وجمال، ناز وادا، اٹھکھیلیاں، اقرار وانکار، وصل اور جنس جیسے خارجی موضوعات کے بیانات تک محدود تھی۔ یہ وؔلی کا ہی کارنامہ تھا کہ اُنھوں نے اپنی جدّت پسند طبیعت سے غزل میں نت نئے تجربات پیش کئے اور غزل کو خارجیت اور نسوانیت کی بے لطفی کے سحر سے آزاد کر کے اُس کا دامن اتنا وسیع کر دیا کہ اِس میں ہر طرح کے خیالات کی گنجائش پیدا ہوگئی اور اُردو غزل کی ترقی کے امکانات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئے۔ وؔلی نے غزل کو جدید زبان اور پیرایۂ اظہار کے نت نئے طریقوں سے ایسا مالامال کیا کہ اُن کے اِس رنگِ تغزّل کی تقلید اُن کے زمانے اور بعد کے شعراء کے لئے باعثِ فخر بن گئی۔ اِس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ وؔلی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے رنگین مضامین تو باندھے ہیں لیکن اس کے پردے میں اُنھوں نے اصلی روحانی واردات کو بھی قلم بند کیا ہے۔

وؔلی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں میں ایک نئی زبان استعمال کی ہے۔ وؔلی کا یہ لسانی تجربہ بڑا ہی کامیاب رہا ہے کیوں کہ وؔلی نے اُس زمانے کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کو مدِّ نظر رکھ کر اپنی شاعری میں دکنی اور عجمی روایات کے انضمام سے ایک نئی زبان پیش کرنے کی کوشش کی اور اُردو غزل کی دنیا ہی بدل دی۔ یہی سبب ہے کہ دہلی کے علاوہ ہندوستان کے دیگر شعراء بھی وؔلی کی طرف متوجّہ ہوگئے اور اُن کے رنگ

میں رنگ گئے۔ یہاں تک کہ قوّالوں، فقیروں اور محفلِ سماع کے لئے ولی ہی کے کلام کا انتخاب کیا جاتا۔ یوں ولی کے کلام کو دیکھ کر یہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ زبان ولی نے آج سے تقریباً تین سو برس پہلے استعمال کی تھی۔ لیکن آپ ولی کی اِس ذہنی اختراع اور لسانی تجربے کا احساس اِس بات کیجئے کہ موجودہ زمانے بھی ولی کا کلام پرانے طرز کا معلوم نہیں ہوتا بلکہ اِس بات کا شدّت سے احساس ہوتا ہے کہ اُن کا کلام موجودہ دور میں ہی کہا گیا ہے۔

اُردو کے اِتنے عظیم شاعر جن کو اُردو شاعری اور خصوصاً غزل کو نئی جلا دینے اور اُردو زبان کو نئے تجربوں سے مزیّن کرنے کا فخر حاصل ہے وہیں اِس ضمن میں ولی کے اِس فخر اور شاعری میں غزل کی نئی داغ بیل ڈالنے میں مجتہد ہونے کے باوجود اُن کی عظمتوں اور ان کے وقار وافتخار کو یہ کہہ کر معطون کرنے کی بھی ادبی سازش کی گئی ہے کہ۔۔۔

''ولی کی شاعری ''شاہ سعد اللہ گلشن'' کے مشورے کی مرہونِ منّت ہے۔''

اِس سلسلے میں ولی غالباً سب سے پہلے بدنصیب شاعر ہیں جن کی شاعری کو کسی کے مشورے کی گراں بار بتا کر اُن کے شاعرانہ وقار کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ راقم الحروف کا قوی ماننا ہے کہ ولی تو خود ہی اپنے طرزِ خاص کے مالک ہے اور اُن کی شاعری میں لسانی تبدیلیوں کا جو عکس دکھائی دیتا ہے، وہ اُس سیاسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے جو ولی کی اِس اختراعِ نو کی ذمّہ دار ہے اور ولی کے اِس نئے لسانی تجربے میں کسی کے مشورے کا عمل دخل نہیں ہے۔ کیوں کہ بنیادی بات یہ بھی رہی ہے کہ ''شاہ سعد اللہ گلشن'' فارسی کے شاعر ہیں اور ولی اُردو کے۔ اِس لئے ولی کی شاعرانہ عظمت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مذکورہ بیان قابلِ قبول نہیں لگتا۔ چونکہ یہ قصّہ ایک قدیم زمانے سے مشہور ہے اِس لئے اِس قصّے کو چاہے جتنے دلائل سے قطع کیا جائے لیکن یہ واقعہ ولی کے شاعرانہ وقار پر ہمیشہ ایک بدنما داغ کی طرح نظر آتا رہے گا۔

گویا یہ کہ ولی جیسی تاریخ ساز اور جامع الکمالات شخصیت نے اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا، اِس اعتبار سے خصوصاً اُردو غزل میں اُن کی حیثیت مخترع اور موجّد کی ہے اور موجودہ غزل ترقی کے جس مقام پر فائز ہے اس کا سرچشمہ ولی ہی ہیں۔ بااِیں ہمہ ولی کے فن اور اُن کے شعری کارناموں اور زبان وادب کی خدمات کا احاطہ کرنا فی زمانہ مشکل امر ہے اور اُس کی اہم وجہ یہ کہ ولی کی زندگی کے متنازع فیہ معاملات کا احاطہ کرنا اور تاریخ کے گم شدہ اوراق میں سے اُن کی شخصی زندگی کے شب وروز تلاش کرنا ایسا ہے کہ ایک طوفانی سمندر میں غوطہ زن ہوکر لعل وگہر تلاش کیا جائے۔ تاہم مقالہ نگار نے اِس پر پیش قدمی کی ہے

اور ولی کی شخصیت اورفن کا مفصّل جائزہ لیا ہے اور اپنے اِس تحقیقی مقالے کوعملی جامہ پہنانے کی خاطر حسبِ ذیل طریقے پر ولی کے فن اور اُن کی شخصیت کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اِس تحقیقی مقالے میں راقم الحروف نے اپنی بساط کے مطابق ولی کی شاعری، حیات، نام، وطنیت، مدفن اور دیگر متنازعات کا جائزہ لینے کی طالبِ علمانہ کوشش کی ہے تاکہ ولی کے ضمن میں ان اختلافی امور کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے جو اُن کی شخصیت کے سلسلے میں درآئے ہیں اور ولی کی ذات کو اِن متنازعات سے پاک کر کے اُنھیں صرف اُردو زبان کا شاعر رہنے دیا جائے اور کسی مخصوص علاقے کے شاعر کی حیثیت سے اُنھیں مقیّد نہ کیا جائے۔ ولی کو اِس سے بڑھ کر ہماری کوئی اور خراجِ عقیدت نہیں ہوسکتی۔

زیرِ نظر مقالہ چھ (٦) ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ولی کے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات پر منحصر ہے۔ دوسرا باب ولی کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔ اِس باب میں ولی کی وطنیت، نام، جائے پیدائش اور مدفن پر طویل بحث کی گئی ہے۔ تیسرا باب ولی سے قبل دکن میں صنفِ غزل کا فروغ پر محیط ہے۔ چوتھا باب ولی کی شاعری سے متعلق ہے جس میں ولی کی صوفیانہ شاعری کے لئے ضمنی عنوان مقرر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب ولی اور سفرِ دہلی ہے جس میں ولی کے سفرِ دہلی کی وجوہات بیان کی گئی ہیں ساتھ ہی اِس باب میں ''ولی اور شاہ سعد اللہ گلشن'' کے عنوان سے ذیلی عنوان مقرر کر کے اِن دونوں کے تعلقات کے نوعیت پر بحث کی گئی ہے۔ چھٹا باب آخری باب ہے جو ماحصل پر مشتمل ہے۔ ابواب کی تقسیم حسبِ ذیل ہے۔

باب اوّل :-

اِس باب میں ولی کے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ساتھ ہی اُردو زبان کا ابتدائی خاکہ پیش کرتے ہوئے دکن اور گجرات کے مابین لسانی تغیّرات کا جائزہ بھی لیا گیا اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کون سے سماجی اور ادبی وثقافتی حالات تھے جنھوں نے ولی کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

باب دوم :-

اِس باب میں ولی کے احمد آباد (گجرات) میں آنے کے اسباب کے ساتھ اُن کے نام، وطنیت، حیات، موت اور مدفن جیسے متنازع فیہ عنوانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور موافق اور متضاد بیانوں کا مطالعہ کر کے اُن کے نام، وطنیت، حیات اور مدفن کے متعلق نئے انکشافات کئے گئے ہیں۔ یہ باب کچھ طویل ہے۔ لہٰذا ولی کی

شخصی زندگی کے متعلق دستیاب موجودہ تمام مآخذات سے استفادہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے وؔلی کے اِن متنازع فیہ معاملات میں اپنے دلائل سے اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وؔلی کی وطنیت کے متعلق کورانہ تقلید سے اجتناب کرتے ہوئے دلائل کے ساتھ حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم :-

اِس باب میں وؔلی سے قبل دکن میں ادب اور شعری صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کن حالات میں اردو غزل کا ہیولا تیار ہوا اور اُردو غزل کے خاکے کی تشکیل میں جو عوامل کارفرماں تھے اُن کا جائزہ لیا گیا ہے اور وؔلی سے قبل صنفِ غزل کی نامقبولیت کے اسباب پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب چہارم :-

اِس باب میں وؔلی کی شاعری کے اہم پہلوؤں کا سراغ لگایا گیا ہے اور وؔلی کے شعری محاسن کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں وؔلی کی شاعری کے موضوعات، اسلوب اور فکری وفنّی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اِسی کے ساتھ وؔلی کی شاعری میں پیدا ہونے والی حیرت انگیز تبدیلیوں کی وجوہات کی بھی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے۔

اِس باب میں وؔلی کی صوفیانہ شاعری کے عنوان سے ضمنی باب بھی ترتیب دیا گیا ہے اور وؔلی کی صوفیانہ شاعری کی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اُن کی مذہب دوستی کا اُن کی شاعری کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے اور ایک مکمل صوفی کی حیثیت سے اُن کی شخصیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب پنجم :-

اِس باب میں وؔلی کے سفرِ دہلی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور اِس سفر کے اسباب اور وجوہات کی اُس وقت کے حالات کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اِسی کے ساتھ وؔلی کے اِس سفرِ دہلی کے متعلق اپنی آراء کو ثابت کرنے کے لئے مختلف دلائل سے حتّی الامکان کوشش کی گئی ہے۔

اِس باب میں ''وؔلی اور شاہ سعد اللہ گلشن'' کے عنوان سے ضمنی باب بھی شامل کیا گیا ہے اور جیسا کہ وؔلی کی شاعری کے متعلق مشہور ہے کہ ۔۔۔ ''اُن کی شاعری ''شاہ سعد اللہ گلشن'' کے احسانوں اور مشوروں کی مرہونِ منّت ہے''۔ اِس بیان سے متعلق مختلف حقائق کے مدِّ نظر لیکن قوی دلائل سے اِس بیان کی نفی کی گئی ہے

اور جن حالات وواقعات میں یہ مفروضہ بات پیدا ہوئی اُس پر روشنی ڈالتے ہوئے وضاحت کے ساتھ اِس بیان کی عقدہ کشائی کرنے کی محققانہ انداز میں کوشش کی گئی ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے اُس زمانے میں اور اُس کے بعد کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب ششم :-

یہ باب بطور ''ماحصل'' شاملِ مقالہ کیا گیا ہے جس میں اپنے مطالعے اور تحقیق وتجزیہ سے حاصل شدہ نتائج پیش کئے گئے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے کی تیاری میں ولؔی کے کلّیات اور اُن تمام تذکروں سے جن میں ولؔی کا ذکر ملتا ہے، اِس کے علاوہ ولؔی کے متعلق دیگر مصنفین کی وہ تمام تصانیف جو اب تک منظرِ عام پر آئی ہیں، مختلف ادبی اداروں سے شائع ہونے والے رسائل وجرائد جن میں ولؔی پر مقالات پیش ہوئے، نیز وہ تمام تصانیف خواہ اُن کا تعلق تاریخِ ادبِ اردو سے ہو یا اُن میں ولؔی کا ذکر ضمنی اور جزوی طور پر کیا گیا ہو، اُن تمام کتابوں سے استفادہ کر کے میں نے اپنی بساط کے مطابق اِس مقالے کے تانے بانے بُنے ہیں۔ جس میں ولؔی کی شخصی زندگی پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے اور ولؔی کے تمام متنازع فیہ پہلوؤں کو موضوعِ بحث بنا کر اپنے نقطۂ نظر سے ولؔی کے متعلق رائج ہو چلی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اِس مقالے کی تیاری میں درجِ ذیل لائبریریوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۱) ایم۔ایس۔ یونیورسٹی لائبریری (بڑودہ)

(۲) گجرات یونیورسٹی لائبریری (احمد آباد)

(۳) گجرات ودھیا پیٹھ لائبریری (احمد آباد)

(۴) حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر (احمد آباد)

(۵) ایم۔جے لائبریری (میونسپل کارپوریشن، احمد آباد)

(۶) گجرات کالج سیڈن ہام لائبریری (آشرم روڈ، احمد آباد)

مسیح الزماں ایچ۔ انصاری

بابِ اوّل

ولؔی کے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات

باب اوّل

ولی کے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات

ہندوستان ہمیشہ سے مختلف نسلوں، مذہبوں، قوموں، زبانوں، تہذیبوں اور تمدنوں کا گہوارہ رہا ہے۔ از منۂ قدیم کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے آریوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور اپنی فتوحات سے اس ملک کے مختلف خطّوں میں آباد ہوگئے۔ آریہ اپنے ساتھ علٰحیدہ مذہب، زبان اور تہذیب وتمدن لائے تھے۔ مقامی باشندوں نے ان بیرونی حملہ آوروں کو بزورِ طاقت روکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے چنانچہ ان حملہ آوروں کی بالادستی قبول کر کے رہنا منظور کرلیا۔ لیکن اپنی اور اپنے مذہب کی بقا وتحفظ کی خاطر بڑی تعداد میں ہندوستان کے ایک علاقے سے دیگر علاقوں میں ہجرت کرتے رہے۔ تاہم انھوں نے اسی ملک کو اپنا مسکن جانا، اپنی عبادت گاہیں تعمیر کیں اور یہاں کی سیاسی اور سماجی تحریکوں میں شامل ہوئے چنانچہ ہندوستان مختلف مذاہب، مختلف طریقۂ عبادت اور مختلف رسم ورواج کا گہوارہ بن گیا۔

ساتویں صدی میں مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور سب سے پہلے سندھ کو اپنے زیرِنگیں کر کے وہاں بودوباش اختیار کی اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے دیگر علاقوں پر قابض ہوتے گئے۔ ان فاتحین میں سلطان محمد بن قاسم (۷۱۲ء) سے لے کر مغلیہ سلطنت تک مسلمانوں کے مختلف قبائل مختلف اوقات میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور سلطنتِ دہلی ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی رہی۔ یہ تمام کے تمام نووارد مسلمان یہیں کی خاک میں رچ بس گئے، مذہبِ اسلام کی سادگی، تعلیمِ وحدانیت، توہم پرستی سے نفرت، بھائی چارگی، ملنساری نے یہاں کے باشندوں کو حد درجہ متاثر کیا۔ ہندوستانی تہذیب پر مسلم ثقافت کے اثرات اس وقت پوری طرح اجاگر ہوئے جب مسلمان شمال مغرب سے اپنے مخصوص تصوّرات اور تمدّنی روایات کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے۔ ہندوستان کی سرزمین پر جہاں اس نووارد قوم نے قدم رکھا وہاں اس کے تصوّراتِ حیات، تہذیب زبان اور فلسفۂ زندگی کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ تہذیبی اور لسانی سطح پر یہ ردِّعمل واضح طور پر نمایاں ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ مقامی تصوّرات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

جو مقامی میلانات اور بیرونی اثرات کے اشتراک کا مظہر تھا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی مقامی رجحانات کو اپنے تہذیبی افکار میں سمولیا اور دونوں اس طرح شیر وشکر ہوگئے کہ ایک نئی گنگا جمنی تہذیب کا ہیولا تیار ہوگیا۔ باہمی رفاقت، خلوص ومحبت کے رشتوں اور یکجائی موانست سے ایک مخلوط تمدن کی تشکیل ہوئی اس مشترکہ اور مخلوط تہذیب کی نشونما اور صورت گری میں جو تاریخی محرکات کارفرما رہے ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تیرہویں صدی کے آخر سے شمال سے جنوب کی طرف فوجی حملے شروع ہوئے اور سترہویں صدی کے آخر تک جاری رہے۔ مغل حکمرانوں کی فوجوں میں مختلف مقامات کے سپاہی ہوتے تھے جن میں عربی، ایرانی، پنجابی، ہریانی اور شمالی ہندستان سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ جب ان فوجوں نے جنوب کی طرف پیش قدمی کی تو انہیں مختلف مقامات پر جلد یا دیر ٹھہرنے کی ضرورت پیش آئی اس طرح ان کی زبان مقامی زبان سے متاثر ہوئی اسی طرح مقامی افراد بھی ان فوجیوں کی زبان سے اثر پذیر ہوئے۔ فوجیوں کے علاوہ علماء، شرفاء اور صوفیا بھی دکن جاتے رہے جن کی زبان اور تہذیب نے دکن پر دیرپا لسانی اور تہذیبی اثرات مرتب کیے۔ صرف اتنا ہی نہیں مختلف مقامات پر فوجیوں نے عرصۂ دراز تک قیام کیا اور بعض مستقل طور پر رہائش پذیر ہوگئے۔

مغل حکمراں حکومت کی توسیع کے لئے دکنی ریاستوں پر حملہ آور ہوئے تو عوامی زندگی میں غیر معمولی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں، اور یہ تبدیلی نہ صرف تہذیبی وسماجی زندگی سے نظر آئی بلکہ علاقائی زبانیں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ان حملوں کے سبب عوامی زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا اس کے زیرِ اثر عوام نے سکون کی تلاش میں مختلف علاقوں کا رُخ کیا۔ زبانوں کا ایک دوسرے سے اختلاط کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔

جب مغل فوجوں نے دکنی ریاستوں پر یلغار شروع کی تو وہاں کا امن وامان غارت ہوکر رہ گیا۔ جس سے متاثر عوام امن وسکون کی تلاش میں گجرات اور دکن کے مختلف علاقوں میں منتقل ہوتے رہے۔ نتیجتاً ان علاقوں کی زبانیں اور طرزِ رہائش میں نمایا تبدیلیاں ہوئیں ان ہی اسباب وعمل سے ایک نئی زبان جسے اردو کہیں یا دکنی وگجری یا ہندوستانی زبان میں ''ریختہ'' کا خمیر تیار ہوا اس زبان کی آبیاری میں مغل حکمرانوں کے صوبے دار، اعلیٰ وادنیٰ ملازمین اور فوجیوں کی بڑی تعداد نے (جو دکن میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوگئے تھے) اہم رول ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں کے مقامی بولیوں کے شعراء نے اس نو زائیدہ زبان کو اپنایا اور اس زبان کو ادبی روپ دینے کی ابتداء کی۔

اردو زبان کے اس ابتدائی دور میں، گجرات، خاندیش، برار وغیرہ جب مغلوں کی قلم رَو میں آئے تو

وہاں کے کچھ خاندان بیجاپور اور گولکنڈہ چلے گئے۔ ان مہاجرین کے ساتھ شمالی ہند کی کھڑی بولی بھی دکن پہنچی۔

کھڑی بولی کیا ہے؟ آگے بڑھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہوگا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

''کھڑی بولی کے معنی ہندوستان میں عام طور پر گنوار بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچّہ بچّہ جانتا ہے نہ وہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ ہی زبان کی کوئی شاخ''[۱]

جدید ماہرینِ لسانیات عام طور سے یہ کہتے ہیں کہ اپ بھرنشوں کے آخری دور میں دلّی، میرٹھ، مرادآباد، رام پور وغیرہ میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں کھڑی بولی اُسی کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں۔

''تاریخی اور لسانی اعتبار سے اردو، ہندی یا سنسکرت زدہ کھڑی بولی کا ترمیم شدہ مسلّم روپ نہیں سچ اس کے برعکس ہے فارسی زدہ ہندوستانی جو دلّی میں مغل درباروں کے حلقوں میں پیدا ہوئی (اس سے پہلے ہم اس کا آغاز دکن کی دکنی بولی اور جنوبی ہند کی مسلم سلطنتوں احمدنگر، بیجاپور، برار، بیدر اور گولکنڈہ میں پاتے ہیں) اسے ہندوؤں نے اختیار کرلیا چونکہ عربی فارسی الفاظ ان کے لئے بے مصرف تھے انھوں نے دیوناگری ہی کو اختیار کر کے بہت زیادہ سنسکرت زدہ لفظیات کو لیا اور باہر کے فارسی عربی الفاظ سے پرہیز کیا''[۲]

ہر زندہ اور فعّال زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف خواص وعوام بلکہ شہروں اور قصبوں میں بولی جاتی ہو بلکہ اس کا حلقۂ اثر دیہاتوں تک بھی پھیلا ہوا ہو۔ سنتی کمار نے کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکلوں میں اردو اور ہندی نیز سنسکرت کا شمار کیا ہے اسی طرح ''گریرسن'' کھڑی بولی کو ''ورنا کیولر'' ہندوستانی زبان کہتا ہے۔ لہذا ہمیں اردو زبان کے آغاز کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہوگا کہ کھڑی بولی ہندوستان کے کن خطّوں میں بولی جاتی تھی دراصل کھڑی بولی کا علاقہ انبالہ، دہلی، یوپی، دہرہ دون، سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ، بلند شہر، بجنور، مرادآباد، رام پور وغیرہ ہیں۔

مغل شہنشاہوں کی فوج کشی کے درمیان شمالی ہند کی کھڑی بولی بھی دکن پہنچی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس پر متعدد اثرات مرتب ہوتے رہے شمالی ہند کی کھڑی بولی عوام کی بولی تھی جو اپنے آس پاس کی بولیوں سے متاثر تھی اور اسی طرح اس کا فطری ارتقاء بھی ہوتا رہا۔ دکن پہنچ کر کھڑی بولی نے جو شکل اختیار کی اسے دکنی یا

دکھنی کہتے ہیں۔

مقامی خصوصیات کے باعث اس کی پانچ بولیاں ہیں :

(۱) گجری :- گجرات میں بولی جانے والی گجری جس کا مرکز احمد آباد ہے۔

(۲) دکنی :- دکنی مراٹھواڑے کی جس کا مرکز اورنگ آباد ہے

(۳) تلنگانہ کی دکنی جس کا مرکز شہر گولکنڈہ تھا

(۴) کرناٹک کی دکنی جس کا مرکز بیجاپور تھا

(۵) تامل ناڈو کی دکنی جس کا مرکز ادکاٹ تھا

واضح ہو کہ اوّل الذکر گجری، گجراتی زبان نہیں ہے بلکہ گجراتی ایک علاحدہ زبان ہے۔ اگر دکنی کو کھڑی بولی کی ہی ایک بولی کہا جائے تو گجری کو بھی دکنی کی ہی ذیلی بولی یا زبان کہنا چاہئے۔ دراصل گجری زبان کو گجراتی سے ممیّز کرنے کے لئے اُسے گجری یا گوجری کہا گیا۔ دکن پر سب سے زیادہ اثر مراٹھی کا ہے۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں مہاراشٹر کا پایۂ تخت دیوگیری (دولت آباد) تھا۔ جب محمد بن تغلق اپنا دار السلطنت وہاں لے گیا تو زبان کا مراٹھی سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ دولت آباد کے نزدیک اورنگ آباد، مراٹھواڑے کا اہم شہر ہے۔

محمد بن تغلق سے قبل علاءُ الدین خلجی نے گجرات فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا جس وجہ سے گجرات بھی براہِ راست طور پر سلطنتِ دہلی کے زیرنگیں آگیا۔ فتح گجرات نے اس کے حوصلے اور بڑھادیے۔ اور اب اس کی نظریں مغربی ہندوستان سے ہٹ کر جنوب کے علاقے پر جم گئیں۔ جنوب میں علاءُ الدین خلجی نے دکن و گجرات دونوں علاقوں کو فتح کر کے تہذیبی اور لسانی اعتبار سے ان دونوں علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب کردیا۔ اس نے اپنے نائب ملِک کافورے کو ایک بھاری فوج کے ساتھ دکن کی مہم پر روانہ کیا اور بالآخر ۱۳۱۰ء میں دکن اور مالوہ کے علاقے بھی تسخیر کرلیے گئے اور انھیں سلطنیت دہلی کا جزو بنادیا گیا۔ ظاہر ہے اس وسیع وعریض اور دور دور پھیلے ہوئے مقبوضہ علاقوں پر بہ طورِ خاص توجہ رکھنی تھی اس لئے اس کے انتظامات کو مؤثر بنانے کے لئے گجرات سے لے کر دکن تک کے علاقوں کو سوسو مواضعات میں تقسیم کردیا گیا۔ اور اس کے ہر حصّے پر حکومت کا نمائندہ ایک ترک افسر متعیّن کردیا گیا جو ان علاقوں کے تمام امور کا ذمہ دار قرار

دیا گیا۔ یہ نگراں کار ''امیرانِ صدہ'' کہلاتے تھے۔ ان امیرانِ صدہ کے ساتھ ان کے افرادِ خاندان اور متوسلین بھی دکن پہنچے۔ ظاہر ہے کہ ان ترک افسروں کا پہلے پہل مقامی باشندوں سے ربط قائم ہوا ہوگا۔ یہ ترک امیر جو پہلے دہلی میں رہ بس چکے تھے اپنے ساتھ وہ ذخیرۂ الفاظ لائے تھے جو دہلی کے بازار اور گلی کوچوں میں بولے جاتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں فارسی کا چلن عام تھا۔ لہذا ان ترک امیروں کا مقامی لوگوں سے گفتگو کرنا دشوار گزار عمل تھا۔ اور معاشرتی سطح پر رابطہ کرنا ہر حال میں ضروری تھا۔ ان ترک امیروں کے ساتھ ان کے اہلِ خانہ اور دیگر افرادِ خاندان نے اپنے ساتھ لائی ہوئی دہلوی زبان میں مقامی الفاظ شامل کر لیے اور اس طرح ابلاغ وترسیل کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تا کہ امورِ سلطنت اور دیگر سماجی معاملات حل کئے جاسکیں۔

علاؤ الدین خلجی اور ملک کافور کی دکن اور جنوب پر فوج کشی اور باقاعدہ اثر ورسوخ نے مرہٹی اور تلگو علاقوں میں شمال کی ایک نوخیز زبان کی اشاعت اور نشوونما کے لئے امکانات روشن کر دیے۔ ۱۳۲۷ء میں سلطان محمد بن تغلق نے دیوگیری (دولت آباد) کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو کثیر تعداد میں علماء، رفقاء، شعراء اور اہلِ علم دہلی سے دولت آباد روانہ ہونے لگے۔ محمد بن تغلق کے پایۂ تخت منتقل کرنے کے بعد دلّی ایسی سنان ہوگئی کہ محمد بن قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ۔۔۔

''آواز ہیچ متنفّس بجز شغال وروباہ وجانورانِ صحرائی بگوش نمی رسید'' [۳]

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ۔۔۔

''شہر میں صرف ایک نابینا باقی رہ گیا تھا اُسے بھی دولت آباد پہنچا دیا گیا تھا'' [۴]

دہلی کو خیر باد کہنے والے ان تمام علماء وفضلاء، شعراء یہاں کی مقامی زبان کے سرمایۂ الفاظ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لسانی طور پر دو مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگ جب ایسی لین دین، خرید وفروخت اور دیگر ضرورتوں کے تحت ایک دوسرے سے گفتگو کی ہوگی تو ان مقامی اور بیرونی زبانوں کے میل نے ایک ایسی زبان کو ضرور جنم دیا ہوگا جسے ہم آج ''اردو'' کہتے ہیں۔ پایۂ تخت دہلی سے ''دولت آباد'' منتقل ہونے کے بعد صوفیائے کرام نے تبلیغ واشاعت کا کام جاری رکھا۔ اتنے بڑے خطۂ زمین پر سلطنت کے نظام کو صحیح طور پر چلانا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ لہذا مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ''امیرانِ صدہ'' نے خودمختاری کا اعلان کردیا۔ ظفر خان نے علاؤ الدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کر کے دکن میں ایک نئی سلطنت کی بناء ڈالی جو بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔

سلطان حسن گنگو بہمنی کے انتقال کے تیسرے دن محمد شاہ بن سلطان علاؤ الدین بہمنی نے ماتمی لباس ترک کیا اور اپنے والد کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔۵ محمد شاہ ایک جنگجو حکمران تھا وہ جنوب کے بادشاہوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہا۔ محمد شاہ کی فوج میں پندرہ ہزار سوار، پچاس ہزار سپاہی اور ایک بھاری توپ خانہ تھا۔ محمد شاہ (۷۵۲ھ) کی شادی سیف الدین غوری کی لڑکی سے ۱۳۵۱ء میں ہوئی تھی جس کا ذکر دکن کی تاریخوں میں موجود ہے۔ جس کی تفصیلات سے اس عہد کے کلچر اور رسوم ورواج پر روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ فرشتہ نے بھی اس کی شادی کے جشن کا مفصّل حال درج کیا ہے۔۶

محمد شاہ کے عہد میں ایران اور عراق کے علماء نے بہمنی سلطنت کا رُخ کیا، کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ نے حافظؔ شیرازی کو بھی گلبرگہ آنے کی دعوت دی تھی لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ نہ آسکے۔ اور بطورِ معذرت ایک غزل لکھ بھیجی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہیں۔

''دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بہ مئے بفروش دلق ماکزین بہتر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش واز دنیائے دوں بگذد
کہ یکجو منت دو ناں جہان یکسر نمی ارزد'' ۷

محمد شاہ نے بڑی بڑی رقمیں دے کر عرب اور ایران کے شعراء اور اربابِ علم کو اپنے پایۂ تخت آنے کی دعوت دی۔ محمد شاہ کے ۱۳۹۷ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثین نے حکومت کے حصول میں اپنی ساری توانائی صرف کردی۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی گویا ہوڑ سی لگ گئی۔ علوم وفنون کی طرف توجہ کا کیا مذکور۔

لیکن بہمنی سلطنت کا آٹھواں حکمراں فیروزشاہ بہمنی جو ۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں فنِ مصوّری، فنِ تعمیر اور علوم وفنون، تجارت وثقافت وغیرہ میں کافی ترقی ہوئی اس کی مثال بہمنی دور کے کسی اور بادشاہ کے یہاں نہیں ملتی سلطان فیروز شاہ شاعر تھا اور فیروزی اور عؔروضی تخلص کرتا تھا پروفیسر گیان چند جین نے فیروز شاہ بہمنی کی مندرجۂ ذیل رُباعی دریافت کی ہے جو تاحال فیروز شاہ کے کلام کا واحد نمونہ ہے۔

''تجھ مکھ چندا جوت دسے سارا جیوں
تجھ کان پہ موتی جھلکے تارا جیوں

فیروزی عاشق کوں ٹک یک چاکن دے
تجھ شوخ ادھر لب رہے شکر پارا جیوں" ۸

فیروز شاہ بہمنی کئی زبانوں جیسے عربی، فارسی، ترکی، تلگو، کنٹری، مراٹھی، بنگالی اور گجراتی وغیرہ پر عبور رکھتا تھا اس کے علمی شغف کی وجہ سے دکن میں بے شمار علماء جمع ہوگئے تھے۔ ۹ فیروز شاہ بہمنی نے شہر فیروز آباد کی بناء ڈالی تھی جو بھمنڈی کے کنارے واقع تھا۔ ۱۰ فیروز شاہ بہمنی نے دیورائے کی لڑکی سے شادی کر کے مشترکہ کلچر کو فروغ دینے میں مدد کی۔ دکن کے بہمنی سلاطین نے اپنی وسیع النظری، رواداری اور حکمتِ علمی کی بدولت ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم شیر وشکر کر دیا تھا۔ اور "سکّوں" پر پہلی بار لفظ "بہمنی" کندہ کروایا تھا اور بعد کے حکمرانوں نے اپنے تانبوں کے سکّوں پر اس کی تقلید کی۔ فیروز شاہ کا سنِ رحلت ۱۴۲۱ء/ ۸۲۵ھ ۵رشوال تسلیم کیا گیا ہے۔

فیروز شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے حسن کے بجائے اس کا بھائی احمد شاہ تخت نشین ہوا اس کے دورِ حکومت میں فنی، علمی وتہذیبی ترقی جاری رہی احمد شاہ نے اپنا پایۂ تخت ۱۴۲۴ء میں گلبرگہ سے بیدر منتقل کر دیا تھا جہاں ۱۴۳۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

محمد ظہیر الدین اپنی کتاب "سلطان احمد شاہ بہمنی" میں لکھتے ہیں کہ تیرہویں اور چودہویں صدی میں بہمنیوں نے اہلِ حرفہ، فنکاروں اور معماروں کی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی۔ احمد شاہ کے بعد اس کے جانشین علاؤ الدین ثانی نے ۳۳ سال حکومت کی اور اس کے بعد بہمنی سلطنت میں زوال کے آغاز پیدا ہونے لگے۔ علاؤ الدین ثانی کا معتمد وزیر محمود گاوان جو ابتداء ہی سے سلطنت بہمنی کا وفادار اور خیر خواہ تھا۔ محمود کو نہ صرف علوم وفنون سے دلچسپی تھی بلکہ وہ اچھی انتظامی صلاحیتوں کا مالک بھی تھا۔ محمود گاوان کو ۵ راپریل ۱۴۸۱ء میں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا۔ دکنی تہذیب دو عناصرِ ترکیبی سے مرکب تھی ایک مقامی اثرات اور دوسرے مسلم تہذیب اس لئے اس کا پرَتو طرزِ تعمیر، شعر وادب، رہن سہن کے طریقوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

محمود گاوان کے قتل کے بعد آٹھ طرفداروں میں سے صرف چار طاقتور گورنر باقی رہے اور رفتہ رفتہ وہ خود بھی خود مختار ہوتے گئے۔ احمد نگر کے نظام شاہی، بیجاپور کے عادل شاہی، براد کے عماد شاہی اور خود پایۂ تخت محمد آباد یعنی

بیدر کے بریدشاہی اور گولکنڈے کے قطب شاہی گورنر اپنے حدود میں آزاد ہوکر خودمختار سیاسی حکمراں بن گئے۔[۱۱]

۱۴۹۰ء بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد جو پانچ خودمختار سلطنتیں وجود میں آئیں ان میں :

(۱) احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت

(۲) بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

(۳) برار کی عمّاد شاہی سلطنت

(۴) بیدر (محمد آباد) کی بریدشاہی سلطنت اور

(۵) گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد جو پانچ خودمختار سلطنت وجود میں آئیں ان میں سب سے اوّل بیدر کی بریدشاہی سلطنت قابلِ ذکر ہے۔ کیونکہ بہمنی سلطنت کی تہذیب اور شائستگی کے علاوہ اُن کے عہد کی ادبی روایات کی وارث بھی یہی سلطنت تھی۔ بہمنی سلطنت کو زوال کی طرف لے جانے میں سے بڑا ہاتھ ''امیر برید'' کا تھا۔ کیوں کہ امیر برید سیاسی داؤں پیچ اور امورِ سلطنت سے بخوبی واقف تھا۔ بریدیوں نے تقریباً دوسو برس تک حکومت کی اور اپنی سیاسی حکمتِ عملی کو بروئے کار لاتے ہوئے ۱۶۱۹ء میں بیجاپور کے عادل شاہی خاندان پر قبضہ کرلیا۔ بیدر میں بہمنی عہد کے علماء وفضلاء نیز شعراء نے اردو شاعری کے فروغ کو جاری رکھا۔ اس عہد کے ایک شاعر جس کا نام فیروز تھا حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی منقبت میں ایک مختصر مثنوی لکھی تھی جس کا نام ''پرت نامہ محی الدین'' ہے۔

دوسری برار کی ''عمّاد شاہی سلطنت'' جس کا بانی فتح اللہ عماد شاہ تھا اور اسی نے سب سے پہلے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔

بہمنی سلطنت کے وجود سے ابھرنے والی تیسری اہم سلطنت ''احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت'' تھی جس کی بنیاد ''نظام الملک بحری'' کے فرزند ملک احمد نے رکھی تھی۔ چونکہ محمود گاواں کے قتل کی سازش میں بحری کا اہم رول رہا تھا اس نے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بند سازش کے تحت ملک احمد کو اپنا جانشین بنایا اور اس نے ''دولت آباد پر بھی قبضہ کرلیا۔ ملک احمد کے بعد اس کے تین جانشینوں میں (۱) برہان نظام شاہ (۲) حسین نظام شاہ اور (۳) مرتضٰی نظام شاہ نے حکومت کو فروغ دیا۔ حسین نظام شاہ نے دکن کے دوسرے مسلم بادشاہوں کی مدد سے وجیانگر سے جنگ کی اور فتح یاب ہوا۔ احمد نگر کے ایک اردو شاعر حسن شوقیؔ نے ''جنگ نامہ نظام شاہ'' کے

نام سے یہ واقعہ نظم کیا ہے۔ نظام شاہی سلطنت کے آخری ایّام میں اندرونی سازشوں اور مغلیہ فوج کے حملوں کی وجہ سے بڑی ابتری پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ مغل شہزادہ مراد کی شورشیں احمد نگر سے جاری رہی بالآخر احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت ۱۶۰۰ء میں ختم ہوگئی۔

چوتھی بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ ترک تھا۔ وہ خوش نویسی میں ماہر تھا اور علمِ عروض سے اُسے بڑا شغف تھا اور فنِ موسیقی میں بھی دلچسپ رکھتا تھا وہ شعراء کا سچّا سرپرست اور قدرسناش تھا۔ نیز اُسے تُرکی اور فارسی زبان پر عُبور حاصل تھا۔ یوسف عادل شاہ کے زمانے میں حاجی رومی، شیخ نصیر الدین، نصر اللہ ولی، اور حضرت پیر جمنا مقصود بیجاپور سے تشریف لائے تھے۔۱۲ یوسف عادل شاہ کے زمانے میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ اس دور میں بیجاپور میں اہلِ حرفہ، صنّاع اور اہلِ علم کا مرکز تھا۔ یوسف عادل شاہ کا دورِ حکومت ۲۵ سال رہا اور وہ ۱۵۱۰ء میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرگیا۔

یوسف عادل شاہ کے خاندان نے بیجاپور پر تقریباً دوسو برس حکومت کی اس خاندان کے نوبادشاہ ہوئے حالاں کہ بیجاپور کی سلطنت کی بنیاد رکھنے والے زیادہ تر تُرک تھے لیکن یہ تمام ہندوستان کی آب وہوا سے حددرجہ مانوس ہوچکے تھے اور یہاں کی تہذیب ان میں رچ بس گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے محلوں کے نام ہندوستانی ہوتے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانیت اور اردو کی تہذیبی روایات بہمنوں کے دور میں شروع ہوچکی تھی اور عادل شاہی عہد میں اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔

یوسف عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس کا خوردسال شہزادہ اسماعیل تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر اس زمانے کی رسم کے مطابق بیدر، احمد نگر، برار اور گولکنڈہ کے حکمرانوں نے اُسے مبارکباد کے پیغامات بھیجے یہ بھی ایک عمدہ تہذیبی رسم تھی۔ اسماعیل عادل شاہ فارسی کا کہنہ مشق شاعر تھا اور وفائی تخلّص کرتا تھا۔ اس کے اشعار سے اس کی علمیت اور دانشمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں پان اور ''بیرہٗ پان'' کا بھی رواج تھا اور بادشاہوں نیز بڑے آدمیوں کے ہاتھوں جسے ''بیرہٗ پان'' عطا ہوتا اس کا مرتبہ بڑا سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک طرح کا نیک شگون تھا۔ اس دور میں سواریوں کے علاوہ گھوڑے پالکی کا بھی رواج تھا اور خواتین عموماً پردہ دار پالکی میں سوار ہوتی تھیں۔ اسمٰعیل نے کئی شہر آباد کئے جن میں ایک شہر چندا پور کے نام سے آباد کیا تھا اور اپنے عالی شان محل کو اس نے ''چمپا محل'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اسمٰعیل کا جانشین ابراہیم اوّل ایک بلند حوصلہ اور جری حکمران تھا۔ علماء اور فضلاء کی قدردانی اور رعایا اور فوجیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وجہ سے وہ ممتاز اور مقبول

بادشاہ ثابت ہوا۔ ابراھیم کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ فارسی کے بجائے ''ہندوی'' یا اردو کو دفتری زبان قرار دینا ہے۔ اس عہد میں بہت سے سربرآوردہ صوفی بزرگ گزرے جو عوام کو رشد وہدایت سے نواز رہے تھے۔ ان میں حضرت شاہ میراجی شمس العشاق سرِ فہرست ہیں۔ جو اردو زبان کا سہارا لے کر اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ آپ نے شہر میں کئی رسالے اور چھوٹی نظمیں لکھیں تھیں۔ جن میں ''خوش نامہ'' اور ''خوش نغز'' بہت مقبول ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''ہندوی'' سے کون سی زبان مراد ہے؟ دراصل باقر آگاہ کے کلام سے جو جنوبی ہند میں دکنی کے آخری بڑے شاعر ہیں اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ یہ زبان دکنی ہی تھی۔ باقر آگاہ کے کلام کا نمونہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں پیش کیا ہے۔

''ولے بعض یاراں کا ایمان ہوا

سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

ہے دکنی میں مجکو مہارت یتی

کہ النصر منکم کہے نصرتی'' ۱۳

ابراھیم کی وفات ۱۵۵۸ء میں ہوئی اس کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ حکمراں بنا۔ اس کے دور میں علم وادب کی بڑی سرپرستی ہوئی۔ اس دور میں عبدلؔ کا ''ابراھیم نامہ'' خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس بادشاہ کی ادب پروری اور شعری ذوق ''نورس'' کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ جس کی بنا پر وہ اپنی مہارت اور کمال سے ''جگت گرو'' کہلایا۔ اس نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں کئی مسجدیں، قلع اور محلات تعمیر کروایے ان محلوں میں ایک ''حسینی محل'' بہت مشہور ہے۔ دوسرا ''فرش محل'' تیسرا ''پادشاہ محل'' اور چوتھا ''علی داد محل'' ان محلوں سے اُسے بڑا اُنس تھا۔ لہٰذا اس کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا ابراھیم عادل شاہ ثانی نو سال کی عمر میں ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ ابراھیم عادل شاہ ثانی کا عہد مشہور خوش نویس اور ماہرِ خطاط خلیل اللہ بت شکن تھا۔ اس کے عہد میں فنونِ لطیفہ نے ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کیں اور بیجاپور علم وفن کا مرکز بن گیا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں ہندوستانی تہذیب اور مقامی روایات، مسلم معاشرت میں شیر وشکر ہوکر رچ بس گئیں تھیں۔ اس عہد کی تعمیری یادگاروں میں دلکشا باغ، نورس محل، برج حیدری اور تاج باولی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں کثیر تعداد میں صوفیاء بیجاپور میں سکونت پذیر تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنی چہیتی ملکہ تاج سلطان کی یاد میں ایک ابراہیم روضہ تعمیر کروایا تھا۔ جسے اس کے شاہی معمار ملِک صندل

نے تعمیر کیا تھا۔ یہ روضہ بھی اس عہد کی ایک شاندار یادگار ہے اور جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو اُسے یہیں دفن کیا گیا۔ ابراہیم روضہ اور اس کی مسجد بیجاپور کی عظمتِ رفتہ اور اس کے بلند پایہ فنِ تعمیر کے حسن اور انفرادیت کی ترجمان ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کی دیگر یادگار عمارتوں میں ''آنند محل''، ''سنگیت محل'' اور ''گگن محل'' ہیں جو بڑی ہی دلفریب اور متاثر کن عمارتیں ہیں۔

محمد عادل شاہ ابراہیم عادل شاہ کا جانشین تھا۔ اس کے عہد میں معرکہ آرائیاں بھی ہوتی رہیں اور علم وہنر کی آبیاری بھی۔ محمد عادل شاہ کے عہد میں حکیم آتشی نے ''خمسہ نظامی'' کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں۔ اورظہوری کے فرزند ملا ظہور نے ''محمد نامہ'' مرتّب کیا تھا۔ اس کے عہد میں علم وادب کا بول بالا تھا رستمی کا ''خاور نامہ'' اور ملک خوشنود کی مثنوی ''جنت سنگار'' بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ اس کی وفات کے متعلق ایک بہت مشہور واقعہ ہے کہ بیجاپور میں صوفیائے کرام کی بڑی قدر ومنزلت کی جاتی تھی۔ اسی لئے اپنی تخت نشینی کے بعد اس نے صوفیوں سے بہت خوشگوار تعلقات قائم کرلئے اور اس کے عہد کے سب سے زیادہ روحانی مرتبہ والے پیر وصوفی حضرت ہاشم پیر سے بہت معتقد ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ایک مرتبہ ۱۶۴۶ء میں محمد عادل شاہ سخت بیمار پڑا تو حضرت پیر ہاشم نے اپنی عمر کے دس سال اسے عنایت کردیے تھے۔ ۱۶۴۶ء میں پیر ہاشم کا انتقال ہوا، چنانچہ ہاشم پیر کے ٹھیک دس برس بعد یعنی ۱۶۵۶ء میں محمد عادل شاہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرگیا۔ اور پھر علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں ''نصرتی'' اردو کا بہت بڑا شاعر گزرا ہے جسے اُس نے ملک الشعراء کا رتبہ عطا کیا تھا۔ نصرتی بڑا اقادر الکلام شاعر تھا اور قصیدہ، مثنوی، غزل، غرض کہ ہر صنف پر اس کو استادانہ تصرّف حاصل تھا۔ اس کی ایک عشقیہ مثنوی ''گلشنِ عشق'' بہت مشہور ہے۔ جس میں کنور منوہر اور مالتی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اس کا دوسرا کارنامہ ''علی نامہ'' ہے جس میں اس نے شیواجی اور علی کے تصادم اور جنگوں کے حالات لکھے ہیں۔ علی کے زمانے میں ایک روحانی پیشوا حضرت شاہ میراں جی کے پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ ہیں۔ آپ نے نظم اور نثر دونوں میں کئی رسالے چھوڑے ہیں۔ جن میں نظموں میں ''رموز السالکین''، ''محبت نامہ'' اور ''نظمِ وجود'' تصوّف اور سلوک پر مشتمل ہیں۔ علی کے زمانے میں اردو مرثیہ کو بھی کافی تقویت ملی ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا سکندر تخت نشین ہوا۔

سکندر کے زمانے میں شیواجی نے کئی حملے کئے اور بہت سے اضلاع پر قبضہ کرلیا۔ بظاہر اس نے چودہ سال حکومت کی لیکن جب تک بادشاہ رہا شطرنج بنا رہا اور کم عمری کے باعث اسے کسی چیز میں کھل کر حصّہ لینے

کا موقع ہی نہ ملا پھر بھی اس کے زمانے میں علم وفن، تہذیب وشائستگی اور شعر وسخن جاری رہا۔ اس کے عہد میں ایسے کئی شاعر موجود تھے جن کے فکر وفن کو سکندر کے زمانے میں ترقی ہوئی تھی۔ اس دور کے اردو شعراء میں شاہ ابوالمعانی، ملّا عبد الرّزاق، رفعت، عبد القادر، عبد الطیف، عبد المغنی وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے زمانے کا سب سے اہم شاعر ہاشمی تھا جو پیدائشی اندھا تھا۔ اس نے ایک مثنوی ''یوسف زلیخا'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے کچھ مرثیے اور غزلیں عورتوں کی شان میں لکھی تھیں۔ اس لئے ''ہاشمی'' کو ''ریختی'' یعنی عورتوں کی زبان میں غزل لکھنے کے طریقے کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کیا اور پہلے بیدر فتح کیا پھر کلیان کے قلعہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور بیجاپور کا محاصرہ کرلیا رسد کی کمی کے باعث مغل حملہ آور پریشان ہوگئے اور بالآخر اورنگ زیب واپس ہوگیا۔ علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد سکندر جو اس کا متبنّیٰ شہزادہ تھا تخت نشین ہوا۔

اورنگ زیب کی دیرینہ تمنّا تھی کہ وہ بیجاپور پر قابض ہوجائے اپنی اسی خواہش کے تحت اس نے شہزادہ اعظم کو حکم دیا کہ وہ بیجاپور کا دوبارہ محاصرہ کرلے لہذا ۱۶۸۵ء میں دوبارہ محاصرہ ہوا مغل فوجوں کے ساتھ سامانِ جنگ اور ضروری اشیاء کی کثرت سے سکندر عادل شاہ حملے کی تاب نہ لا سکا اور بالآخر خزانے کی کنجیاں اورنگ زیب کے حوالے کردیں۔ سکندر عادل کو اورنگ زیب نے پہلے قلعہ دولت آباد میں قید رکھا اور پھر اپنے ہمراہ قیدی کی حیثیت سے شمال لے گیا۔ سکندر عادل شاہ کا انتقال ۳/اپریل ۱۷۰۰ء کو ہوا ابراہیم زبیری تحریر کرتا ہے کہ۔۔۔

''۱۰۹۷ھ میں عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔''[۱۴]

ان شاہی حکمرانوں نے امورِ سلطنت، تجارت، صنعت وحرفت، فنِ تعمیر، مصوّری، خطاطی اور شعر وادب کی ترقی میں جو نمایاں حصّہ لیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

قطب شاہی سلطنت کا بانی بیس سال کی عمر میں سلطان محمود شاہ بہمنی کے دورِ حکومت میں بیدر پہنچا تھا اور اپنی بہادری، تدبّر وشجاعت سے غیر معمولی کارکردگی اور دانشمندی کا ثبوت دیا۔ جس کی بدولت سلطان محمود شاہ بہمنی نے اُسے تلنگانہ کا صوبہ دار بنادیا تھا۔ سلطان محمد قلی ترقی کے زینے طے کرتا ہوا تلنگا کا طرفدار بن گیا۔ اور بہمنی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور گولکنڈہ کو اپنا پایہ تخت قرار دے دیا۔ سلطان قلی کو ایک سازش کے تحت قتل کردیا گیا۔ سلطان قلی کے چھے (۶) فرزند تھے جن میں

جمشید ابراہیم سلطنت کا حاکم بنا اسی طرح اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی، اور پھر ابو المظفر محمد قلی قطب شاہ، سلطان عبد اللہ، بادشاہ غازی محمد قلی قطب شاہ وارثِ تخت وتاج ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے دورِ حکومت کے فنِ تعمیر کے نایاب نمونے اس کے اعلیٰ اور شائستہ ذوق کے ترجمان ہیں۔ جس کی خوبصورتی آج بھی بے مثل ہیں۔ اس کی تعمیرات کا عکس اس کے کلام میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مختلف مذہبی تقاریب نے سرکاری تقاریب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے عہد میں میلاد النبی ، شب برات، محرم وغیرہ کے موقعوں پر سلطنت کی جانب سے نذرونیاز کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ محمد قلی کے بعد عبد اللہ قطب شاہ جس کا عہد سیاسی اعتبار سے قطب شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کا زمانہ ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں قطب شاہی دربار میں ایسے نامور فنکار اور سخن گستر موجود تھے۔ جن پر اردو زبان وادب بجاطور پر فخر کرسکتی ہے۔ اس کے دربار میں شعر خوانی اور ادبی مباحث کا دور دورہ ہوا کرتا تھا۔ اس عہد کے شعراء میں محمود، فیروز، ابن نشاطی، وجہی، غواصی اور احمد جنیدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے اپنے کلام سے اردو زبان کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور گولکنڈہ شعرونغمہ کی جاں فزا صداؤں سے گونجنے لگا۔ اس دور کے شعراء نے اپنے شعری کارناموں میں مختلف رسومات کی مرقع کشی کی ہے۔ مثلاً: شادی بیاہ کی تقریبات، جشنِ عید، مہمانوں کی ضیافت وغیرہ کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ لیکن قطب شاہی سلاطین کا سب سے اہم کارنامہ زبان وادب کی سرپرستی ہے۔ ان بادشاہوں نے دکنی شعراء اور ادیبوں کو وہی اعزاز دیا جیسا کہ آگے چل کر فارسی شاعروں کو مغل دربار میں عطا کیا گیا۔ قطب شاہی سلاطینوں میں محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبد اللہ قطب شاہ بہ جائے خود دکنی زبان کے اچھے شعراء میں سے تھے بلکہ محمد قلی قطب شاہ آج بھی سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت سے ممتاز ہے۔

اس طرح بادشاہوں کی اِس ادب پروری، علم دوستی اور قدردانی نے اردو زبان کو شائستہ اور قابلِ قدر بنادیا۔ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات فتح کرلیا تو یہاں کے شعراء، ادباء اور فنکاروں نے دکن کا رُخ کیا اور قطب شاہی سلطنت میں پناہ گزین ہوگئے۔ ابو الحسن تاناشاہ آخری قطب شاہی تاجدار تھا۔ جس کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور دکن کی تمام خودمختار ریاستوں کا خاتمہ ہوگیا۔

شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت ہی سے دکن کی آزاد اور خودمختار سلطنتوں کے خلاف توسیع سلطنت کی جارحانہ پالیسی کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ خاندیش اور احمد نگر کی ریاست کا بڑا علاقہ مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا گیا

تھا۔ عہدِ شاہ جہانی میں شہزادہ اورنگ زیب دکن کا وائسرائے تھا۔ تب سے ہی اس نے جنوب کی ان دونوں آزاد سلطنتوں یعنی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے خاتمے کا مصمّم ارادہ کرلیا تھا۔ لیکن احمد نگر کی سلطنت میں ملک عنبر حبشی جیسا رہنما موجود تھا۔ جس نے مغل حکمرانوں کے دانت کھٹے کر رکھے تھے۔ اس کے طریقۂ جنگ کی وجہ سے اکبری اور جہانگیری دورِ حکومت کے بہت سے معروف مغل کمانڈر عاجز آچکے تھے۔ جن میں مشہور سپہ سالار عبدالرّحیم خانخانان بھی ایک تھا۔ جہانگیر نے ۱۶۱۶ء میں دکن کی مہم شہزادہ خرّم (شاہ جہاں) کے سُپرد کی۔

الغرض دکن کی خود مختار آزاد سلطنتیں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں بھی سلطنت دہلی کے لئے ایک سر درد بنی رہیں۔ شاہ جہاں کی علالت کے زمانے میں اس کے چاروں فرزندوں دارا شکوہ، شاہ شجاع، اورنگ زیب اور مراد اپنے والد کے زیرِ حکومت مختلف صوبوں میں حکومت کے کام انجام دے رہے تھے۔ جن میں داراشکوہ دار الخلافہ دہلی میں، شاہ شجاع بنگالہ میں، مراد گجرات میں اور اورنگ زیب دکن میں بحیثیت صوبے دار تعینات کئے گئے تھے۔ شاہ جہاں کی علالت کی خبر نے ان چاروں تیموری شہزادوں کے دلوں میں تخت وتاج کے حصول کی ہوس جگادی۔ مصدقہ خبروں کے فقدان اور صحیح اطلاع نہ ملنے کے باعث ان لوگوں نے یہ مان لیا کہ شاہ جہاں کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا حصولِ تخت وتاج کی خاطر ان حقیقی بھائیوں میں خوں ریز جنگ ہوئی اور بالآخر اورنگ زیب مظفّر اور منصور ہوکر ۱۶۵۸ء میں تخت نشین ہوا۔

اورنگ زیب کے ابتدائی عہد میں سرحدیوں نے بھی خوب لوٹ کھسوٹ شروع کی لیکن ان کو بہت جلد مطیع کرلیا گیا۔ ۱۶۷۹ء میں اورنگ زیب نے میواڑ پر قبضہ کرلیا اور اس کے بعد راجپوتوں کے صدر رانا راج سنگھ نے میواڑ پر حملہ کیا اور اُسے فتح کرلیا۔ ۱۶۸۱ء میں بادشاہ اورنگ زیب نے اپنا دارالخلافہ دکن منتقل کردیا اور وہاں مراٹھوں سے لڑائی میں مصروف رہا۔ اگرچہ اورنگ زیب اپنے ملک کے گوشہ گوشہ سے ہروقت باخبر رہتا تھا اور ہر علاقے کے نظم ونسق کو درست رکھنے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن چونکہ اورنگ زیب نے جنگ وجدال سے آخری دم تک فرصت نہ پائی اس لئے اس قدر وسیع مملکت کے نظام کو تخریب سے بچانے میں زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ ۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب علیل ہوا اور احمد نگر (دکن) روانہ ہوا جہاں مرض الموت نے اس پیکرِ عمل کو ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سلادیا۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں گجرات میں صنعت وحرفت میں خوب ترقی کی اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے جن میں بیش قیمت کپڑا، عمدہ کاغذ، زری کار چوب وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس

بادشاہ کے دورِ حکومت میں گجرات کئی سخت ترین آفات کا شکار ہوا۔ جس میں ۱۶۶۷ء کے قحط نے گجرات کی حالت بڑی ابتر کردی۔ ۱۵؎ اسی زمانے میں ایک وبا پھیلی ہوئی تھی جس نے لوگوں کے حواس باختہ کرر کھے تھے ۱۶۸۴ء میں دریائے سابرمتی میں سیلاب آیا اور پانی اس قدر بڑھ گیا کہ شہر پناہ کو بہت نقصان ہوا۔ اورنگ زیب اپنے مذہب میں بڑا سخت واقع ہوا تھا۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملات میں کسی قسم کی رورعایت نہیں کی کیوں کہ اس زمانے میں تصوف کا زور بڑھا ہوا تھا اور مرشد پرستی عام ہوگئی تھی اور اس فعل کے مرتکب صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ شیعوں، سکھوں اور ہندوؤں میں بھی یہ بدعت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اورنگ زیب نے اخلاقی اصلاحات کی طرف بہت توجہ دی اور اس کے فروغ کے لئے کوشاں رہا۔ ملک میں سیاسی بدامنی کے باوجود تجارت کے خوب ترقی حالانکہ اورنگ زیب کے آخری بیس سالوں میں عربی ڈاکوؤں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ پورے ملک میں بیکاری بدنظمی کی وجہ سے بدمعاش عنصر نے چوری، ڈاکہ عام کردیا تھا۔ شہراور دیہات کسی جگہ امن وسکون کا نشان نہیں تھا۔ مزید برآں آفاتِ سماوی وارضی نے بھی قہر ڈھا رکھا تھا۔ رعایا بڑی پریشان حال تھی۔ دوسری طرف زمینداروں نے بھی اپنے ظلم وستم سے ان کی مصیبتوں میں اضافہ کردیا تھا۔

شہنشاہ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک تمام مغل بادشاہوں نے سلطنت کی توسیع کو اہم فریضہ سمجھ رکھا تھا اور یہی جذبہ دکن کی مسلم ریاستوں پر حملہ کرنے میں بھی کارفرما رہا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر حکمراں کی یہ تمنّا اور آرزو رہی تھی کہ وہ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک بلاشرکت مالک ومختار رہے۔ مغلیہ سلاطین میں اکبر کا دکن پر حملہ اسی جذبے کے تحت تھا۔ جس کو اس کے فرزند جہانگیر اور پوتے شاہ جہاں نے اپنے اپنے وقتوں میں بتدریج آگے بڑھایا۔ وقارِ ملکی اور توسیع سلطنت کے جذبے کے تحت ہی سلطان اورنگ زیب نے ہندوستان کے متعدّد شہنشاہوں کے اس دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکا اور اس نے جو علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کئے وہ شش صوبہ دکن کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن سالہا سال کی جنگوں نے شاہی خزانے میں ایک بڑا خلاء پیدا کردیا۔ چونکہ آمدنی کے ذرائع محدود ہوتے جارہے تھے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ اورنگ زیب نے اپنے آباو اجداد کی جمع کی ہوئی دولت کا بیشتر حصّہ ختم کردیا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے ۲۵ (پچیس) سال دکن کے میدانِ جنگ میں گذارے اور یہیں ۲۰ ؍فروری ۱۷۰۷ء میں حیاتِ قید وبند دونوں سے آزاد ہوگیا۔

اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء یعنی گیارہویں صدی ہجری کے نصف دوم اور بارھویں صدی

ہجری کے اوائل کا عہد ہے اور یہی زمانہ ولیؔ کا بھی زمانہ ہے۔

غرض یہ کہ ولیؔ کی (۱۶۶۸ء) میں ولادت سے قبل اردو زبان وادب کی ابتداء ہوچکی تھی اور یہ نو زائیدہ زبان اظہار وخیال کے لئے پختگی اختیار کرچکی تھی۔ تقریباً چارسو برس کے عرصے میں اردو کی حیثیت شمالی ہند میں بولی سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ جب کہ دکن میں ادبی تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا ہوگیا۔ دکنی ادب باعتبار زبان اردو کی ابتدائی صورت ہے جب کہ شمالی ہند میں اردو کا ارتقاء اس طرز پر ہوا کہ اس کی ادبی شان تمام تر فارسی کی آرائشوں اور زیبائشوں سے قائم ہوئی پھر بھی اردو زبان کی ابتدائی سورت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے اور زبان کے ارتقاء کا مزاج اور انداز بھی روشن ہو جاتا ہے۔

اورنگ زیب جب تخت نشین ہوئے تو مغلیہ حکومت میں کش مکش کے آثار اُسی وقت سے پیدا ہوچکے تھے اور باغی قوتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ اورنگ زیب ان سے نمٹنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے باقی ماندہ سلطنتوں بیجاپور اور گولکنڈہ کو بھی ختم کرنے کی ٹھان لی تھی اور بالآخر اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوگئے۔ ان دونوں سلطنتوں نے تباہ وبرباد ہوجانے کے بعد بھی اردو شعر وشاعری اور سخن گوئی میں کوئی کمی موقع نہیں ہوئی۔ اس سیاسی انتشار کے بعد ان دونوں سلطنتوں میں بسنے والے شعراء اور ادیبوں نے جنوب کا رُخ کیا اور وہاں شعر وسخن کی نئی محفل سجائی۔ لیکن شمال اور جنوب کے درمیان سیاست کی حدیں مسمار ہو جانے کے بعد دکن اور شمال میں تہذیبی اور ادبی روایات کا تبادلہ ہونے لگا۔ چونکہ عالمگیر ایک طویل مدّت تک اورنگ آباد میں مقیم رہے اور اس شہر کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا لہٰذا ادبی اور شعری ذوق کی وہ چنگاریاں جو خاکِ دکن میں چھپی ہوئی تھیں، ان میں سے کچھ تو شعلہ بننے کی ہوا میں اورنگ آباد پہنچ گئیں۔ اس عہد میں متصوّفانہ شاعری کا چلن عام تھا۔ لہٰذا اس عہد کے نیم متصوّفانہ کارناموں میں قاضی محمود بحریؔ کی ''من لگن'' اور وجدیؔ کی ''پنچھی باچھا'' قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی محمود بحریؔ غزل کا اچھا شاعر بھی تھا۔ جس کی زمینوں میں ولیؔ نے غزلیں کہی ہیں۔ ''بحریؔ'' کے کلام میں سرزمینِ دکن اور اس کی روایات کی پاس داری ومحبت کا باربار احساس ہوتا ہے۔ اس نے اس خطۂ ارض سے اپنی وابستگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

بحریؔ کوں دکن یوں ہے کہ جوں نل کو دمن ہے
پس نل کوں ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

بحریؔ اس عبوری دور کا غزل گو ہے جب نئے سیاسی، معاشرتی اور لسانی رجحانات کے تحت دکن اور شمال کی زبان میں ہم آہنگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اسی دور کے آخر میں ولیؔ نے ''ریختہ'' کے نئے معیاروں سے دکنی غزل کو روشناس کرایا۔ بیجاپور کے شعراء جن لسانی اور ادبی روایات کو رفتہ رفتہ قبول کرتے جارہے تھے وہ اب شعر گوئی کا معیار تصور کی جارہی تھیں۔ اس زمانے میں مذہبی قصّوں کو بھی منظوم کیا گیا جس میں محمد علی عاجزؔ کا قصہ ''قصۂ ملکۂ مصر'' قابلِ ذکر ہے۔ نصرتیؔ بھی اس دور کا اہم شاعر رہا ہے۔ اس نے عالمگیر کی مدح میں ایک اردو قصیدہ پیش کیا تھا۔

عالمگیر کے ادبی ذوق کی وجہ سے بہت سے شاعر اور ادیب شمال سے دکن آگئے تھے۔ جن میں جعفر زٹلیؔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعراء کے علاوہ اردو شاعری سے عام دلچسپی رکھنے والے بہت سے لوگ دہلی سے دکن پہنچے کیوں کہ شمال اور جنوب کے درمیان اب کوئی سیاسی حد باقی نہیں رہی تھی اور آمد ورفت کا یہ سلسلہ بدستور جاری تھا۔ جس وجہ سے شعر وسخن اور زبان کو پھیلنے میں کافی مدد مل رہی تھی۔ لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اورنگ آباد کی وہ مرکزیت باقی نہیں رہی اورنگ زیب نے تقریباً ۲۰ سال تک اورنگ آباد میں قیام کیا جو اس زمانے میں دکن کا سب سے اہم شہر تھا۔

عالمگیر اورنگ زیب کے انتقال ۱۱۱۸ھ سے لے کر ۱۱۲۶ھ دکن دہلی سلطنت کا ایک صوبہ بنا رہا۔ اور ولیؔ اسی زمانے کا سب سے بڑا شاعر پیدا ہوا۔ جس نے اپنی آنکھوں سے مغلیہ حکومت کے سیاسی اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔ اسی دورِ حکومت میں فارسی کے کئی شاعر جو شمال سے آئے تھے، دہلی اور دوسرے مقامات کی راہ لی۔ مغلیہ حکومت میں جب زوال کے آثار پیدا ہونے لگے اور اس کے تار وپود بکھرنے لگے، تو فارسی شاعری کا ذوق جو دراصل مغلوں کے اقتدار کی وجہ سے قائم ودائم تھا اور جو ان کے معاشرہ کی تہذیب اور شائستگی کا ایک اہم جزو تھا، ماند پڑنے لگا۔ اس کے مقابلے میں وہ عناصر جنھوں نے اردو کو فروغ دیا تھا زور پکڑنے لگے۔ وہ عرب تاب جن کا رشتہ زمانۂ قدیم سے ہی ہندوستان سے قائم تھا اور ایرانی، افغانی، ترک یا دیگر مغل جنہوں نے اپنی کشتیاں جلا کر ہندوستان میں آچکے تھے اور یہیں کی سرزمین پر بودوباش اختیار کر لی تھی نیز ہندوستان کے لاکھوں عوام جو اس اردو زبان سے وابستہ تھے اس زبان کو اپنا بیش بہا اثاثہ سمجھنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل حکمران بھی عوامی رجحان کے دباؤ سے نہ بچ سکے اور انھوں نے بھی اسی زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔

گذشتہ ان چار صدیوں میں جب نئی ادبی تہذیبی روایات دکن کی سرزمین پر پرورش پارہی تھیں وہیں شمال میں فارسی ادب اور شاعری کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔ دکن اور جنوب کا علاقہ جو محمد بن تغلق کے عہد سے ہی دہلی سے کٹ کر علیحدہ ہوگیا تھا۔ اس سیاسی اتار چڑھاؤ اور حکومت کی توسیعی ہوس پرستی سے گجرات بھی زبردست متاثر رہا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی رہی کہ گجرات ہندوستان کا تجارتی مرکز تھا اور ساحلی علاقہ ہونے کے سبب سے دنیا کے دور دراز علاقوں سے اس کے تجارتی تعلقات قائم ہوچکے تھے۔ جن میں عرب، ایران اور افغانستان وترکستان قابلِ ذکر ہیں۔ گجرات چوں کہ ساحلی علاقہ تھا، لہذا بیرونی تاجروں نے گجرات کی مختلف بندرگاہوں مثلاً بھروچ، سورت اور کھمبات کے ذریعے ہی اوّل اوّل ہندوستان میں قدم رکھا اور سورت چوں کہ باب الحج ہوا کرتا تھا اس لئے عرب تاجروں کی آمد کا خاص مرکز بھی تھا۔

عرب چونکہ جہاز رانی میں بڑے ماہر تھے اس لئے عربوں کی آمد پہلے پہلے بحری راستوں سے ہوئی اور گجرات سمندری سرحدی علاقہ تھا۔ لہذا عربوں نے گجرات کو اپنا تجارتی مرکز بنایا۔ کیوں کہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے بناء پر گجرات ہمیشہ سے ہی بیرونی لوگوں کا مرکز رہا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے بعد ہندوستان پر بہت سی قومیں حملہ آور ہوئیں اور اس کے مختلف صوبوں پر اپنا تسلّط قائم کیا جن میں مغل، ترک، عرب اور ایرانی حملہ آور یکے بعد دیگر اس کے مختلف صوبوں پر فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور اپنی زبان، تہذیب، رسم ورواج سے متاثر کرتے رہے گجرات بھی ان حملہ آوروں سے محفوظ نہ رہ سکا جن میں محمود غزنوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس نے گجرات پر متعدد بار حملے کئے اور یہاں کی مال ومتاع کو تاراج کیا۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری (   ) اور پھر علاؤ الدین خلجی نے ۱۲۹۷ء گجرات پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ محمود بیگڑہ نے گجرات کے اہم قلعوں جوناگڑھ اور چاپانیر کو فتح کر کے اپنی حکومتیں قائم کردیں۔ اس طرح مسلمانوں نے صدیوں تک گجرات پر حکمرانی کی اور اس پر قابض رہے اور اپنی زبان، رسم ورواج، تہذیب وتمدن اور کلچر کے اثرات مرتب کرتے رہے۔

علاؤ الدین خلجی سے لے کر اورنگ زیب کے عہدِ حکومت تک کا عرصہ تقریباً چار صدیوں پر مشتمل ہے۔ ان چار سو برسوں میں دکن اور گجرات نیز شمالی ہند میں توسیع سلطنت کی خاطر معرکہ آرائیوں کا بازار گرم رہا۔ حکمرانوں نے اپنے رعب اور دبدبے کی خاطر فوج کشیاں کیں۔ شمالی ہند میں بابر، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب یکے بعد دیگرے دہلی کے تخت وتاج کے وارث بنتے گئے۔ زمامِ حکومت ایک بادشاہ سے دوسرے

کے ہاتھ میں جاتی رہی، اسی طرح دکن یعنی جنوب میں علاؤ الدین خلجی اور محمد بن تغلق سے ہوتے ہوئے سلطنتِ بہمنیہ کے سلاطین اور پھران میں سے ابھرنے والی خود مختار سلطنتیں جن میں احمد نگر، گولکنڈہ، بیدر، برار اور بیجاپور کی حکومتیں اور ان کے سلاطین برسرِ اقتدار آتے رہے۔ ان چار سو برسوں میں متعدّد بار شمال سے جنوب (دکن) اور مغرب کی جانب حملے ہوتے رہے اور فاتحین اپنی مرضی کے مطابق یا سیاسی مصلحت کے تحت پایۂ تخت کا انتخاب کرتے رہے۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد (دیوگیری) منتقل ہوا پھر کبھی دہلی ہوا۔ اسی طرح جنوب کے علاقوں میں بھی پایۂ تخت کے مقام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ کبھی تلنگانہ، کبھی بیدر، کبھی گولکنڈہ اور اسی طرح مغرب میں آگرہ، نہروالا (پٹن)، احمد آباد وغیرہ۔ ان سلاطین کی سیاسی مصلحت کے تحت پایۂ تخت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہی گویا ایک نئی زبان اور تہذیب کا منبع ثابت ہوا۔

عام طور پر فوج کشی کے دوران فوجی دستوں کی تعداد تقریباً پچیس یا تیس ہزار، پچاس ہزار اور کبھی کبھی ستّر اور اَسّی ہزار تک ہوتی تھی۔ نقل مکانی کے باعث یہ فوجی اپنے ساتھ مقامی زبان بھی لے جاتے تھے۔ اسی طرح مقامی لوگوں سے روابط، لین دین، خرید وفروخت، اظہارِ خیال کے لئے ایک دوسرے کی زبان کو جاننا اور سمجھنا ضروری تھا۔ شمالی وجنوبی ہند میں چوں کہ گیارھویں اور بارہویں صدی تک اردو زبان کا خام مواد تیار ہو چکا تھا، البتہ شمالی ہند میں فارسی زبان وادب کا اثر غالب تھا پھر بھی اردو زبان ایک انجانی، غیر سناش شکل وصورت میں اپنا ڈھانچہ بنا چکی تھی جب کہ مغرب اور جنوب میں دکنی، گجری، ہندوی آہستہ آہستہ ترقی کی جانب اپنے قدم بڑھا رہی تھی۔

گجرات اور دکن کی سلطنتیں دراصل شمالی ہند کے مرکز سے سیاسی ربط منقطع کر کے وجود میں آئی تھی۔ جس کے نتیجے میں زبان وتہذیب اور پورے طریقۂ بودوباش میں نئے انداز اور نئے رجحانات ابھرنے لگے۔ لباس، زیورات، طرزِ تعمیر، فنونِ لطیفہ، آداب نشست وبرخاست اور پوری معاشرتی زندگی میں ایک نیا میلان کار فرما نظر آتا ہے۔ جو شمالی ہند سے مختلف اور ممیّز ہے۔ کیوں کہ ان علاقوں میں بیرونی افراد اور مقامی باشندوں کے درمیان ربط ضبط ضروری تھا۔ اور تہذیبی لین دین بھی یک طرفہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات ہمہ جہتی ہوتے ہیں۔ اور اس کے دور رس نتائج زبان وادب کی سطح پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

سلطنت دہلی پر مغلوں کے اقتدار کے ساتھ ہی فارسی زبان نے دہلی اور گرد ونواح میں اپنا حلقۂ اثر بڑھانا شروع کیا۔ اور آگے چل کر اُسے درباری زبان قرار دیا گیا، چنانچہ عدالت اور شاہِ وقت کی زبان فارسی

ہونے کے باعث علماء، شرفاء، رُوسا اور دیگر شاہی عملہ اب فارسی زبان میں ہی کلام کرنے کو فوقیت دینے لگے۔
لیکن کسی علاقے کی تسخیر کے بعد جب پایۂ تخت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تو کثیر تعداد میں فوجی، سپہ سالار اور دیگر اعلیٰ فوجی افسران فتح کردہ علاقے کے تحفظ اور انتظام سلطنت کے لئے ساتھ ہوتے اور اس علاقے کو اپنا مسکن بنا لیتے، اس طرح جب شمالی ہندوستان سے جنوب کی جانب متعدّد بار حملے کئے گئے تو گویا شمالی ہند کا جنوبی ہندوستان کے لوگوں سے ایک طرح کا لسانی رشتہ قائم ہوگیا۔ کیوں کہ گذشتہ ان چار سو برسوں میں شمالی ہند سے دکن اور گجرات میں ہزاروں افراد مع اپنے اہلِ خانہ کے سکونت اختیار کر چکے تھے۔ اس طرح دکن اور گجرات دونوں مقامات پر شمالی ہندوستان آباد ہوگیا تھا اور بود وباش اختیار کرنے والوں نے شمالی ہند کی تہذیب اور وہاں کے مقامی اثرات کی دکن اور گجرات کی سرزمین میں بیج پاشی کی۔

یہ بات مسلّم ہے کہ ایک زبان دوسری زبان پر اپنے اثرات ضرور مرتّب کرتی ہے، یہی کچھ ان دونوں مقامات میں بولی جانے والی زبانوں کے ساتھ بھی ہوا گویا دونوں مقامات میں بولی جانے والی زبانوں کی مخلوط شکل ہی اردو کا وہ خام مواد تھا جو آگے چل کر" اردو" کے نام سے جانا اور پہچانا گیا۔ یوں تو ایک آزاد زبان کی حیثیت سے اردو کی ابتداء ۱۴۰۰ء کے آخر میں ہوچکی تھی۔ جس کی بنیاد کھڑی بولی تھی اور جسے ابتداء کے کچھ مصنفوں نے زبانِ دہلوی، ہندی، دکنی، ریختہ، اردوئے معلیٰ، اور ہندوستانی وغیرہ نام دیئے۔ اسی طرح یہ زبان گجرات میں گوجری، گرجری، گجری، ہندوی وغیرہ ناموں سے موسوم کی گئی۔ اردو زبان نے فارسی زبان سے الفاظ، محاورے، تراکیب اور ادبی شکلوں کو اختیار کر کے ایک نئی شکل وصورت اختیار کرلی۔ چونکہ خود فارسی زبان نے عربی اور ترکی زبانوں سے استفادہ کیا تھا۔ اسی طرح یہ نو زائیدہ اردو مقامی زبانوں سے اثرات قبول کرتی رہی اور ایک مخلوط اور مشترکہ تہذیب کا آئینہ بن کر منظرِ عام پر آئی جسے لوگوں نے اس زبان کو ترقی دے کر اپنے رابطہ کا ذریعہ بنالیا۔

یوں تو اردو زبان شمالی ہند سے علاؤ الدین خلجی اور محمد بن تغلق کی فوجوں اور شاہی افسروں کے ساتھ دکن گئی تھی اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے پُر امن ماحول میں ترقی پاتی رہی تو دوسری طرف دہلی اور نواحی علاقوں میں مغلوں کی درباری زبان فارسی کا ہی غلبہ رہا۔ گویا یہ کہ اردو عوام اور دربار کے سہارے ترقی کے منازل طے کرتی رہی۔

۱۵۷۳ء میں اکبر کی فتح گجرات کے بعد یہاں تقریباً ۱۸۵ برسوں تک مغلوں نے حکومت کی۔ ان تمام عرصہ ہائے اقتدار میں مغل تاج داروں نے اپنے وفادار صوبے داروں اور اعلیٰ سپہ سالاروں کے ذریعے یہاں

اپنی حکومت اور اپنا دبدبہ قائم رکھا۔ ہندوستان کے مسلم سلاطین مزاجاً مدح وستائش پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ اپنے مدح سراؤں کو انعام واکرام سے نوازا بھی کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر درباری مصنف اور شاعر بننے کی کوشش کرتا رہا اور شاہی درباروں سے وابستہ رہنے کا خواہش مند ہوا جو ایک اعتبار سے مالی منفعت یا ذریعۂ معاش کا بھی بڑا ذریعہ تھا۔ اس عہد میں چوں کہ درباری زبان فارسی تھی اور حکومت کی جانب سے اسی زبان میں تخلیق ہونے والے ادب کو سراہا جاتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر خوبی یہ تھی کہ تمام سلاطینِ ہندوستان، امراء، رؤسا اور صوبے دار وغیرہ ادب پرور تھے۔ تصنیف وتالیف اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والے شعراء وادباء کی حوصلہ افزائی کرتے، نیز انھیں مالی تعاون بھی بہم پہنچاتے تھے۔ جس کا ظاہری نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے شعراء، ادباء، تذکرہ نویس اور مورّخ یکجا ہوگئے۔ اور انھوں نے بعض ایسی تصانیف بھی پیش کیں کہ جو آج بھی ہماری تعریف اور توصیف کی مستحق ہیں۔ اس عہدِ وسطیٰ میں فارسی زبان کا غلبہ برابر جاری رہا۔ چوں کہ سلاطینِ ہندوستان بذاتِ خود ادبی ذوق رکھتے تھے اور اپنی مملکت میں علمی خدمات کی سرپرستی بھی کیا کرتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مدارس کتب خانے اور درس وتدریس کی اعلیٰ درس گاہیں قائم کیں۔

سلاطینِ ہند نے تعلیم کے متلاشیوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کی اور اپنے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے انھوں نے اپنے دار السلطنت میں بہت سے دینی مدارس اور تعلیم گاہیں قائم کیں۔ جن میں طلبہ کی اقامت کا بہتر طور پر انتظام کیا جاتا تھا۔ اس طرح سلاطینِ ہند نے تعلیمی سرپرستی میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھایا اور اُسے عالیشان مکتبوں اور مدرسوں سے آراستہ کیا۔ جن کے آثار عرصے تک ان کے حسن ومذاق کا ثبوت دیتے رہے۔ اس طرح سلاطینِ گجرات بھی اپنی علم دوستی اور تعلیم کی اشاعت کے لئے ہمیشہ مستعد رہے۔ جن میں سلطان احمد شاہ اور اس کے بعد اس کے جانشینوں میں محمد شاہ، محمود بیگڑہ اور مظفر شاہ ثانی اور مظفر شاہ ثالث سبھی غیر معمولی ادبی ذوق رکھتے تھے۔

گجرات کا دار الخلافہ احمد آباد ہندوستان کے دور دراز ممالک میں اپنے مدارس کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ جو علم وہدایت کا چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔ گجرات میں اور خاص طور پر احمد آباد کے مدارس میں علّامہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی (۹۱۰ھ تا ۹۹۸ھ) کا مدرسہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ جس کی تعلیم کے چرچے ملک بھر میں مشہور تھے اور تعلیم کے شائق دور دراز سے یہاں کھنچے چلے آئے تھے۔ یہاں طلبہ کے دار الاقامت کا بھی انتظام تھا۔ جہاں ان کو دینی تعلیم کے علاوہ عددی علامات، حساب، ذراعت، ہندسہ، قیافہ، امورِ خانہ

داری، اصولِ حکمت، طب، منطق، ریاضی، تاریخ اور فتاویٰ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں سے وؔلی کو علوم وفنون کی روشنی ملی اور یہیں اقامت گزیں ہوکر انھوں نے زندگی کا ہنر اور زمانہ شناس ذہن پایا۔

اسی طرح احمد آباد کا ایک اور بہت ہی مشہور ومعروف مدرسہ ''ہدایت بخش'' بھی تھا۔ یہ مدرسہ مولانا نور الدین سدیقی سہروردی کے ایک شاگرد وعقیدت مند نواب اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ مشہور ہے کہ وؔلی کا رسالہ ''نور المعرفت'' اسی مدرسے کی تعریف میں ہے لیکن اس کی تصدیق وتائید میں کوئی ثبوت ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ انھی کا لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح سورت اور دیگر علاقوں میں بہت سے مدارس قائم تھے جو علمِ دین کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ اورنگ زیب نے اپنے دورِ اقتدار میں ۱۶۷۸ء میں گجرات کے ان قدیم مکتبوں اور مدرسوں کی مرمّت کے لئے کثیر رقم منظور کی تھی۔ علی محمد خان لکھتے ہیں

''بادشاہ نے سیہا اور سندرا دو گاؤں اس کے اخراجات کے لئے عطیہ کردیئے تھے'' ۱۶

وہ مزید آگے لکھتے ہیں۔

''شاہی احکام اس غرض سے بھی بھیجے گئے تھے کہ تین استاذ احمد آباد، پٹن اور سورت میں اور پینتالیس طلبا کا احمد آباد میں اضافہ کیا جائے۔ اسی مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب طلبا کی امداد ان کی تعلیمی استعداد کی بنیاد پر ان کے روزمرّہ کے وظیفوں کی شکل میں کیا کرتا تھا'' ۱۷

سلطنتِ مغلیہ کے اس پورے دور میں گجرات کی علمی شہرت ہمیشہ قائم رہی اور تعلیم کے ان سرچشموں سے جو سوتے پھوٹے انھوں نے نہ صرف اس سرزمین کی آبیاری کی بلکہ اس علم وفن کی ترقی کا ذریعہ بھی بنے جو ان مدارس اور تعلیم گاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں بڑے بڑے ادیب، شاعر، عالم اور فاضل پیدا ہوئے جن میں اردو کا مایۂ ناز شاعر وؔلی بھی شامل ہے۔

سلاطینِ ہند کی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ان کی فیاضانہ طبیعت اور اعلیٰ مذاق کی بدولت اہلِ علم وکمال دار السلطنت کے بدلنے سے اپنا مسکن بھی بدلتے رہے ان میں وہ مذہبی مبلغین بھی شامل ہیں جنھوں نے اسلام کی ترقی اور نشوونما کی خاطر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سفر کیا۔

گجرات میں نہروالا (پٹن) احمد آباد، کھمبات، بھروچ، مانگرول جیسی متعدّد جگہوں پر صوفیائے اکرام

تبلیغِ اسلام کے لئے آئے اور ان مقامات پر ہمیشہ کے لئے بودوباش اختیار کرلی۔ تبلیغ کے ساتھ انھوں نے الگ الگ مقامات پر چھوٹے اور بڑے مدارس قائم کئے اور درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دینے کے ساتھ اپنی علمیت کو اپنی تصانیف کی شکل میں آشکار بھی کیا۔ اس میں وہ صوفیاء بھی شامل ہیں، جنھوں نے اپنے متصوّ فانہ تصوّرات اور مذہبی افکار کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے اس زبان کا استعمال کیا جو شمالی ہند میں دہلوی زبان، دکن کے صوبوں میں دکنی اور گجرات میں گجری کے نام سے موسوم کی جارہی تھی۔ حالاں کہ اس زبان پر ابھی تک لسانی اعتبار سے کوئی لیبل چسپاں نہیں کیا گیا تھا۔

۱۵۷۲ء میں جب اکبر نے گجرات فتح کر کے یہاں کی خودمختار سلطنت کا خاتمہ کیا، اسی وقت سے گجرات اور شمالی میں روابط کی کثرت ہوگئی۔ اہلِ شمال سے رابطے کی وجہ سے گجرات کی زبان میں فارسی کے عناصر آگئے اور چوں کہ اُس وقت گجرات میں علماء، فضلاء اور شعراء کی کثیر تعداد موجود تھی۔ لہذا انھوں نے فارسی زبان کی آمیزش کے ساتھ مقامی زبان کو فروغ دیا۔ اس طرح ان گذشتہ چار صدیوں میں شمالی ہند اور گجرات لسانی اعتبار سے بہت قریب ہو گئے۔ نیز شمالی ہند سے آئے ہوئے ان علماء وفضلاء نے ان تہذیبی روایات کو پروان چڑھایا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ لہذا اس مشترکہ تہذیب کا دیرپا اثر ہی اردو کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اردو کی سرپرستی میں گجرات کے مقامی شعراء میں چند ہی نام نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اس قدیم اردو کو ''گجری'' کے نام سے منسوب کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم اُردو کے لکھنے والے کبھی اپنی زبان کو ''گجری'' کبھی ''ہندی'' اور کبھی ''دکنی'' اور ''ہندوی'' سے موسوم کرتے رہے تھے۔ گویا اُن کے نزدیک دہلوی، گجری، ہندوی وغیرہ ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے اکبر الدین صدیقی نے گجرات کے قدیم شاعر ''برہان الدین جانمؔ'' کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''لفظ ''گجری'' نے گجرات سے متعلق ہوکر غلط فہمی پیدا کردی ہے اس کا تعلق گجرات سے نہیں لفظ ''گجری'' گذرگاہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کثرتِ استعمال سے ''گذرگاہ'' گجری میں تبدیل ہوگیا۔ ۱۸

قدیم شعراء اپنی زبان کے نام کے بارے میں یک رنگی کے قائل نہیں وہ اُسے ہندی، ہندوی، زبانِ دہلوی، زبانِ ہندوستانی، گوجری، ریختہ، گوجری، دکھنی یا دکنی وغیرہ بھی لکھتے رہے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے اس

خیال کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح دکن کے باشندوں نے اردو کا نام دکنی رکھا ہے۔ اسی طرح گجرات کے رہنے والوں نے اُسے ''گجری'' سے موسوم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۔۔۔

''اردو کا ایک نام ''گجری'' بھی تھا۔ اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں یہ نام گجرات والا اور گجرات پنجاب کے دکن وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے۔ جس وجہ سے دکنی شعراء برہان الدین جانمؔ اور امین الدین اعلیٰ نے اپنی زبان کو ''گجری'' سے تعبیر کیا ہے۔'' [۱۹]

مثلاً :۔ بیجاپور کے برہان الدین جانمؔ بھی اپنی زبان کو اکثر گجری لکھتے ہیں۔ اسی طرح خوب محمد چشتی نے اپنی مثنوی ''خوب ترنگ'' میں اُسے بولی گجرات کہا ہے۔

جیوں دل عرب عجم کی بات
سُن بولی بولی گجرات

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''جو لوگ اپنی زبان کو ''گوجری'' یا ''گجری'' لکھتے ہیں وہ حقیقت میں گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اگر دکن میں یہ اصطلاح کسی مصنف کے یہاں ملتی ہے تو ہم سمجھ لیں کہ دراصل یہ مصنف گجرات کا باشندہ ہے اور اسی لئے وہ اپنی زبان کو گجری کہہ رہا ہے۔'' [۲۰]

گجرات میں جن شعراء کا ذکر ملتا ہے ان میں خاص طور سے شیخ بہاؤ الدین باجنؔ، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیوگامؔ دھنی، باباشاہ حسینیؔ، سیّد حسنؔ جی اور خوبؔ محمد چشتی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء کا کلام صوفیانہ طرز کا ہے لیکن ان کے کلام میں قدیم اردو (گجری) کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان تمام گجری شعراء کا مطمحِ نظر رشد وہدایت اور پند وموعظت تھا، جس کی جھلک ان کی تمام ادبی کاوشوں میں نظر آتی ہے۔ وہ معرفت اور سلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے معتقدین اور مریدوں میں ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ان تمام صوفی طرز کے شعراء کا تعلق براہِ راست عوام سے تھا۔ اس لئے وہ اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانا چاہتے تھے، جو اُس وقت عوام میں رائج تھی اور ہر چند کہ یہ زبان رائج العوام ضرور تھی۔ لیکن فارسی کی قدومنزلت اور مرتبہ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ تصنیف وتالیف میں فارسی زبان کا ہی رواج تھا۔ اس لئے جب کہ روایتی طور پر گجری کے ان تمام شعراء نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ہندوی (اردو) گجری زبان میں کوئی

عیب نہیں ہے اور اُسے بھی وسیلۂ اظہار بنایا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ دور اردو کی ادبی زبان کا عہدِ طفولیت تھا اس لئے اس میں منجھی ہوئی زبان اور نکھرے ہوئے رنگ کی مثالیں نہیں ملتیں۔

شیخ بہاؤ الدین باجن کی ایک تصنیف ''خزائنِ رحمت'' ہے جس کا موضوع تصوّف ہے۔ باجنؔ نے ''جکریاں'' لکھی ہیں۔ یہ صوفیانہ گیتوں کی ایک قسم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گاکر سنانے کے لئے کہی جاتی ہوں گی تاکہ اہلِ محفل شعر و موسیقی کی زبان میں تصوف کی باتیں سن کر وجد میں آسکیں۔ قاضی محمود دریائیؔ نے بھی صوفیانہ طرز کی شاعری کی ہے اور ''جکریاں'' لکھی ہیں۔ انھوں نے اپنی صوفیانہ شاعری میں خود کو معشوق اور خداوند کریم کو عاشق کہا ہے۔ اسی طرح شاہ علی جی گام دھنیؔ ۱۵۶۵ء میں رحلت کی ان کے دیوان کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' ہے انھوں نے اپنے دیوان میں غیر مانوس الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی زبان مشکل اور دقیق معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے ہر بات کو اشاروں میں بیان کیا ہے، جس وجہ سے ایہام ان کے کلام میں نمایاں ہوگیا ہے۔ خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' بہت مشہور ہے جس میں مسائل تصوّف نظم کئے گئے ہیں۔

مثنوی کی ابتداء میں اپنی زبان کے لئے کہتے ہیں۔۔۔

؎ جیوں میری بولی منہ بات
عرب عجم مِل ایک سنگھات
؎ جیوں دل عرب عجم کی بات
سن بولی بولی گجرات

گجرات کے شعراء اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں گجری زبان کے ساتھ فارسی زبان کا اثر بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ''خوب ترنگ'' میں خوبؔ محمد چشتی نے خود اپنی تخلیقات کی زبان کی وضاحت کی ہے اور نثر میں اپنے خیال کی توضیح میں رقم طراز ہیں۔

''من بزبانِ گجراتی کہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ ام'' ۲۱

اس سے مراد لی جاسکتی ہے کہ خوب محمد چشتی نے گجرات میں ابھرتی ہوئی اس مروجہ زبان جو گجرات میں مقبول بھی تھی اور چوں کہ گجرات کے شعراء کا رجحان عموماً تصوّف کی طرف تھا۔ اس لئے دیگر اِصنافِ سخن میں اردو شاعری کی رفتار بہت ہی سُست رہی، البتہ زبان کا یہاں جلد ترقی پاجانا بھی کئی اسباب کی بنا پر تھا بقول سید محی الدین قادری زورؔ۔۔۔

''(۱) دکن کی طرح یہاں بھی فارسی کا اثر دوآبہ کے مقابلے میں بہت کم پھیلنے پایا۔

(۲) اس کے علاوہ اگر گجرات کے اہلِ قلم فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں لکھنا چاہتے تو وہاں کوئی ایسی کوئی دیسی زبان نہیں تھی جس میں وہ لکھ سکتے۔ گجراتی خود اس زمانے میں ادبی زبان نہیں تھی۔ ہندوستانی (گجری) ہی ایک ایسی بولی تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں مشترک تھی اور جب مسلمان صوفی اور بزرگ اپنے خیالات کی تلقین اور تبلیغ کرنا چاہتے تو انہیں لازماً اسی زبان کو استعمال کرنا پڑتا تھا'' ۲۲ؔ

اگرچہ گجری زبان کی ترقی کی رفتار سست ضرور تھی لیکن اس زبان کے خدوخال مکمل نمایاں ہوچکے تھے۔ لیکن سلاطین کی سیاسی مصلحت، یہاں کی جنگیں، گجرات کی خود مختار سلطنت کا خاتمہ اور اورنگ زیب کی فتح دکن کی وجہ سے دکن اور شمال کے ملاپ نے یہاں کی زبان کو پنپنے کا زیادہ موقع نہیں دیا تھا۔ کیوں کہ اکبر کی فتح کے بعد گجرات پر مغلیہ حکومت کا مضبوط تسلط قائم ہوگیا۔ اور اس گجری (ہندوستانی) زبان کے قدردان باقی نہیں رہے جب کہ دکن میں اورنگ زیب کی فتح کے بعد وہاں کے پُر امن ماحول میں شمال کے ادباء، شعراء کی پیش قدمی سے، نیز دکن کے سلاطینوں کے ادبی ذوق اور اردو شعر وشاعری سے دل چسپی کے باعث شعراء، ادباء کی خوب تعظیم اور تکریم کی گئی۔ اس کے برخلاف گجرات میں سلطنت کا خاتمہ ہوا تو یہاں کے علماء، شعراء اور اہلِ حرفہ تلاشِ روزگار اور بے سروسامانی میں مبتلا ہوگئے۔ اس کے برعکس دکن میں وہاں کے سلاطین کی فیاضی، سخاوت اور عیسیٰ نفسی نے گجرات کے شعراء کو بہت متاثر کیا کیوں کہ زوالِ سلطنت کے ساتھ ہی یہاں کا علمی وادبی شیرازہ بکھر گیا تھا۔ لہٰذا ان شعراء نے دکن کا رُخ کیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور، گولکنڈہ اور دکن کے دوسرے مقامات پر لہرانے لگا۔

گجری روایات سے گہری وابستگی نے دکن کی زبان پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ لہٰذا ''گجری'' سے قرب کے باعث دکن کی زبان، ان روایات اور اسالیب سے گریز نہ کرسکی جو اس کے وجود کا جزو بن گئے تھے۔

گجرات ودکن کے یہی وہ سیاسی وسماجی اور ادبی وثقافتی حالات تھے جنھوں نے ولؔی کی شعری شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کردار بھی ادا کیا ہے اور ان کے شعری وادبی جوہروں کو ایک نئی جہت بھی عطا کی ہے۔

★★★★★★★

حواشی

باب اوّل :- ولی کے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات

۱	رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۳ء		ص : ۵۹
۲	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین	ص : ۵۷
۳	تاریخ فرشتہ	محمد بن قاسم فرشتہ	ص : ۱۳۶
۴	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری	ص : ۶۵
۵	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	پروفیسر سیّدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین	ص : ۱۲۷
۶	تاریخ فرشتہ (جلد سوم)	مترجم : محمد فدا علی طالب	ص : ۴۲،۴۳
۷	بحوالہ۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	سیّدہ جعفر۔ گیان چند جین	ص : ۱۳۳
۸	ایضاً " "	" "	ص : ۱۴۰
۹	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خان شیروانی مترجم: رحم علی الہاشمی	ص : ۱۱۷
۱۰	تاریخ فرشتہ (جلد سوم)	مترجم : محمد فدا علی طالب	ص : ۹۸
۱۱	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	پروفیسر سیّدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین	ص : ۱۷۹
۱۲	اردو کی ادبی تاریخ	عبد القادر سروری	ص : ۸۲
۱۳	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	ص : ۱۷
۱۴	بساتین السلاطین	محمد ابراہیم زبیری	ص : ۵۳۹
	بحوالہ۔ تاریخ ادب اردو	گیان چند جین	ص : ۲۵۳
۱۵	۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۶ء تک گجرات میں چھ قحط پڑے		
۱۶	مراۃِ احمدی (جلد اوّل)	علی محمد خان	ص : ۲۰۹

۱۷۔ بحوالہ۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہدِ حکومت میں ایم۔ایس۔جعفر ص : ۷۷
مترجم : سعید انصاری

۱۸۔ قدیم اردو اکبرالدین صدیقی ص : ۴۲

۱۹۔ پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی ص : ۴۱

۲۰۔ ایضاً حافظ محمد شیرانی ص : ۴۱

۲۱۔ بحوالہ۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم) پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین ص : ۲۳۴

۲۲۔ ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص : ۱۰۶

☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم

ولؔی کی سوانح حیات

باب دوم

ولؔی کی سوانح حیات

ولؔی کا شمار ہر چند کہ اردو کے عظیم المرتبت شعراء میں ہوتا ہے۔ تاہم ان کے حسب ونسب نیز تاریخِ ولادت ووفات پر ہنوز اختلاف ہے۔حتیٰ کہ ابھی تک کی تمام تحقیقات بھی قیاس سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔ اس صورتِ حال میں ولؔی کے نام وخاندان اور جائے ولادت ووفات سے متعلق کچھ بھی وثوق سے نہیں جا سکتا، اور جب کہ محققین کی آراء میں بھی بعد واختلاف کا شبہ ہے۔ پھر بھی انہی کی آراء سے کچھ ٹھوس اور مثبت نتائج برآمد کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے پاس دوسرے شواہد بھی تو موجود نہیں جن کی مدد سے یہ مسئلہ حل ہو سکے۔

اس ضمن میں محمد حسین آزؔاد نے بھی آبِ حیات کے اوراق پر اپنی کم نگہی اور عدم توجہی کا ذکر کیا ہے [۱] اور چوں کہ ابتداء میں جن لوگوں نے ولؔی پر خامہ فرسائی کی انھوں نے تذکرہ نگاروں کے بیانات کو ہی مدِ نظر رکھا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ کتنے تذکرہ نگاروں نے ولؔی کے نام اور وطن کے متعلق کیا لکھا ہے۔ لہٰذا ان تذکرہ نگاروں کے بیانات ہی وہ اوّلین ذریعہ ثابت ہوئے جن سے ولؔی کے حالاتِ زندگی اور نام ومقام وغیرہ اُبھر کر سامنے آئے۔ لیکن بعد کے محققین نے تذکرہ نویسوں کی بیاضوں سے نئے معنی ومطالب نکالنے کی کوشش بھی کیں اور اپنی رائے کا اضافہ کر کے بات پوری بھی کردی۔ اس لحاظ سے غور کریں تو ان تذکرہ نویسوں یا محققین کے بیانات بھی اختلاف سے پُر نظر آتے ہیں۔ اور ایسا اس لئے بھی ہوا ہے کہ جیسا کہ شعرائے اُردو کے فارسی تذکروں سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ تمام تذکرہ نگار حضرات نے بھی ولؔی کے حالاتِ زندگی کی تحقیق وصحت، نام، تعلیم وتربیت، وطنیت، سیر وسیاحت نیز زندگی کے مشاغل وغیرہ سے متعلق کوئی ذاتی تحقیق اور دریافت سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ولؔی کے وطن بلکہ خاندان، وطنیت، سنہ ولادت، سنہ وفات تک ہنوز پردۂ خفا میں ہیں اور اسی سبب سے ولؔی کی نسبت یہ تمام اختلاف بیانیاں آہستہ آہستہ طویل تر ہوگئیں۔

یہی وجہ ہے کہ ولی جیسے بلند پایہ شاعر جس نے ہماری اردو زبان کے ارتقاء اور اس کی اصلاح میں اہم رول ادا کیا اُسے اپنے بلند بانگ دعووں سے گجراتی یا دکنی یا اورنگ آبادی ثابت کرنے کی کوششیں نہ کی جاتی، لیکن اردو کے اس عظیم شاعر کو گجراتی اور دکنی سرحدوں میں تقسیم کردیا گیا۔ اور تذکرہ نویسوں اور ادبی ناقدین دونوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں اس حد تک جا پہنچے کہ ولی کو کس طرح اپنا ثابت کیا جاسکے۔ اسی کوشش میں بعض اہلِ قلم نے حُبّ وطن کی بناء پر یا عصبیّت کے جوش میں آکر ولی کو دکنی یا گجراتی ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ انھوں نے ولی سے متعلق بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات کو یا ولی کے بعض اشعار کو مآخذ بنا کر یا پھر اپنی قیاس آرائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ولی کی شخصیت کو گجراتی اور دکنی کے جھگڑے میں اس طرح الجھا دیا کہ ولی کے نام اور وطنیت سے متعلق کچھ بھی ثابت کرنا امرِ محال ہوگیا۔ یہی نہیں محقق بھی دونوں فریقین کی پُر زور دلیلوں سے اتنا مشکوک ہوگئے کہ اس نزاع کی مثبت تدابیر بھی مشکل ہوگئی۔ تاہم ان متنازع باتوں کے بعد بھی مزید نکات اُبھرتے ہیں اور نئی تحقیق بھی سامنے آتی ہے۔ اس لحاظ سے چوں کہ ولی کی شخصیت متنازع فیہ جیسی بن گئی اس لئے سب سے پہلے ان باتوں کا خلاصہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ولی کے متعلق یہ تمام متنازعہ نقطوں کا منبع کہاں ہے اور یہ کیوں کر پیدا ہوا۔ اور اگر تذکرہ نویسوں کے بیانات میں سخت اختلافِ رائے ہے تو اس کی حقیقی وجہ کیا ہے؟ جس کو بنیاد بنا کر بعد کے لکھنے والوں میں یہ نزاع مزید بڑھتا گیا۔ ان چند نکات کے ذریعہ شاید اس کے تدارک کا راستہ نکل سکے یا یہ نزاعی مسئلہ حل ہوسکے۔

ولی کی شخصیت کو متنازع فیہ بنانے والے چند نکات مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) ولی کا احمد آباد میں تعلیم حاصل کرنا (مدرسہ حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علویؒ)

(۲) مدرسہ ''ہدایت بخش'' کی تعریف اور مولانا شیخ نورالدین صدیقی قدس سرہٗ اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد صالح کی مدح میں رسالہ ''نور المعرفت'' لکھنا

(۳) ولی کا ''قطعہ در فراق گجرات'' اور ''شہر سورت'' کی تعریف میں نظم لکھنا

(۴) ولی کے کلام میں گجراتی زبان کی آمیزش

(۵) دکن سے متعلق ولی کے چند اشعار

(۶) ولی کے کلام کے قلمی نسخوں پر لکھے ہوئے نام (ولی دکھنی یا متوطن دکن)

(۷) ولی کے کلام میں دکنی معاصرین کا ذکر

(۸) ولی کی آمد ورفت دکن اور گجرات

(۹) ولی کے کلام میں دکنی زبان کے اثرات

(۱۰) مزارِ ولی کی احمد آباد اور اورنگ آباد دونوں مقامات میں نشاندہی

(۱۱) گجراتی اعزّہ اور احباب وتلامذہ کا ذکر دیوانِ ولی میں

ولی کے متعلق مندرجۂ بالا نکات ایسے ہیں جن کی وجہ سے ابتداء سے ہی ایسے امکان پیدا ہوگئے جس کی بنا پر گجراتی اور دکنی کے جھگڑے کی شروعات ہوئی کیونکہ اردو شعراء کا کوئی بھی تذکرہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء سے پہلے نہیں لکھا گیا۔ مطلب یہ کہ ولی کی وفات اگر بقول سیّد ظہیر الدین مدنی ۱۷۰۷ء ہے تو اُن کی وفات کے ۴۵ سال (پینتالیس سال) تک ولی کا تذکرہ کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا گویا اس طویل مدت میں ولی کے صحیح نام اور وطنیت کے متعلق جو شواہد موصول ہوسکتے تھے وہ بھی ضائع ہوگئے ہوں گے اور جب تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا تو ولی سے متعلق سنی سنائی باتوں یا قیاس آرائیوں کے پیش نظر چند سطروں میں ان کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی خام کوشش کی گئی۔ چنانچہ جس تذکرہ نویس کو ولی جہاں کے زیادہ قریب نظر آئے لکھ ڈالا اس پر متزاد یہ کہ بعض تذکرہ نویسوں مثلاً: حمید اورنگ آبادی، قائم چاند پوری، میر حسن دہلوی، منشی قدرت اللہ شوق، شیخ غلام محی الدین، علی ابراہیم خان نساخ۔ محمد حسین آزاد وغیرہ نے ولی کو گجراتی لکھ دیا ہے۔

اردو ادب کے دو اوّلین مراکز بیجاپور اور گول کنڈہ کے زوال اور دکن میں مغلیہ سلطنت کے عروج کے بعد شعر وسخن کی جو محفلیں آراستہ ہوئیں اُن کا شہرہ گجرات اور شمالی ہند تک پھیلا، یہی زمانہ اورنگ آباد میں ولی کے نام ومقام کا زمانہ بھی تھا۔ لہٰذا ولی اسی عہد میں اردو شاعری کے فلک پر آفتاب بن کر چمکے۔ چنانچہ جس وقت سے شعراء کے تذکرے لکھنے کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت سے ہی ولی ان تذکرہ نگاروں کے صفحات پر چمکتے نظر آئے ہیں۔

شمالی ہند میں اب تک کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلا تذکرہ میر کا ''نکات الشعراء'' (۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء) ہے اور یہی اردو شعراء کا اوّلین اور قابلِ اعتبار تذکرہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شمیم انہونوی اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔۔۔

''اردو میں تذکرہ نویسی کا آغاز میر کے تذکرے ''نکات الشعراء'' سے سمجھا جاتا ہے۔

حالانکہ کچھ اور تذکرہ نگاروں مثلاً محمد یار خاں خاکسار، سودا، آرزو اور سیّد امام الدین وغیرہ کے نام بھی لئے جاتے ہیں لیکن اُن کے تذکرے اب دستیاب نہیں اس لئے ''نکات الشعراء'' از میر تقی میر مؤلفہ (۱۱۶۵ھ) ہی کو اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔''[۲]

عالم گیر اورنگ زیب کی فتح دکن کے ساتھ ہی دکن اور شمال کے تعلقات میں قربت پیدا ہوگئی تھی لیکن آمد ورفت کے ذرائع محدود تھے اور پوری سہولتیں مہیا نہیں تھیں۔ جس وجہ سے دونوں علاقوں کی علمی تحریکوں کا حال دوسری جگہ آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے شمال اور دکن کے شعراء اور ادیبوں کا حال پوری طرح معلوم نہیں ہو پاتا تھا اور صرف سنی سنائی باتوں پر ان تمام شعراء اور ادباء کی معلومات کا انحصار تھا۔ اسی وجہ سے میر تقی میؔر کی معلومات کا ماخذ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

اس میں شک نہیں کہ گجرات اور دکن کے علمی اور ادبی تعلقات بہت قدیم ہیں اور دونوں مقامات کی علمی تحریکوں اور زبان کے اثرات ایک دوسرے پر پڑ رہے تھے۔ تہذیبی لین دین بھی جاری تھا۔ اس زمانے میں شعرائے اردو کے جو تذکرے شمالی ہند میں لکھے گئے ان میں مرورِ زمانہ کی وجہ سے حالات اور نام خلط ملط ہوگئے، اور چند غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں اور آگے چل کر بعض شعراء کے ذکر میں تقدیم وتاخیر اور کمی وزیادتی واقع ہوگئی۔ جس کی بدولت ولؔی زندگی کے متعلق بعد کے تذکرہ نگاروں کی رائیں مختلف ہوتی گئیں۔ کیوں کہ ان کے زمانے میں کچھ لوگ ایسے مِل سکتے تھے جو ولؔی کے تابعین کو دیکھے ہوئے تھے۔ تذکرہ نگاروں کی افراط کے باوجود ولؔی کی مکمل زندگی، طرزِ ماند وبود اور ان کے رفقاء اور آباء واجداد کا حال دیکھنے کی خواہش کو سیری نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ تمام تذکرے تشنہ ہیں۔ کلیم الدین احمد نے تذکرہ نگاروں کی اِسی بے احتیاطی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے ---

> ''نہ تو اُسے (تذکرہ نویسوں کو) وسعتِ معلومات سے سروکار ہوتا اور نہ تحقیق سے اور نہ مربوط طریقہ پر اپنی معلومات رقم کرنے سے، اُسے اپنے ذاتی شوق کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ جو باتیں اُسے معلوم ہوتیں ان پر ہی اکتفا کرتا۔ اُسے اس سے غرض نہ ہوتی کہ کوئی بات یا واقعہ کہاں تک صحیح اور مستند ہے۔ ترتیب کے سلسلے میں اُسے ایک ہی بات معلوم ہوتی کہ جیسے دیوانوں میں غزلوں کی ترتیب باعتبارِ حروفِ تہجی

ہوتی تھی اِسی طرح اشخاص کا ذکر چاہے وہ شعراء ہوں یا بادشاہ، کر دیا جائے، نہ اُس کو یہ غرض تھی کہ کسی فرد کی زندگی کے نمایاں واقعات ہی لکھ دیئے جائیں، نہ اُس کو اِس کی ضرورت محسوس ہوتی کہ کسی فرد کی شخصیت نمایاں کر دی جائے، نہ اُس پر یہ لازم تھا کہ کسی فرد کے خاص کاموں کا ذکر کیا جائے اور اُس کا تو بالکل سوال ہی نہ تھا کہ کسی دور کے سیاسی، اقتصادی اور دیگر عام رجحانات کو واضح کیا جائے۔ مگر ذاتی ترنگ میں اٹکل پچو طریقے پر لکھنے سے یہ ضرور ہوگیا کہ کسی فرد کے سلسلے میں اُس کی زندگی کے کچھ حالات معلوم ہوجاتے ہیں تو کسی کے کچھ ذاتی واقعات سامنے آجاتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی کی شخصیت پر کُچھ روشنی پڑتی ہے تو کسی کے سلسلے میں ایک آدھ بات ایسی بھی سامنے آجاتی ہے جو اُس دور کے حالات کی بھی کچھ جھلک دکھائی دیتی ہے۔ غرض کہ ایسا عالم نظر آئے گا جس کی پراگندگی برداشت سے باہر ہوگی۔'' ۳

ولیؔ کے خاندان کے متعلق اب بھی ہم بہت کم جانتے ہیں اور ان کے اجداد کا حال دریافت کرنے کا فی الحال کوئی ذریعہ سوائے کہ ان قدیم تذکروں پر قناعت کرنے کے ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہاں چند اہم تذکرہ نویسوں کے اقوال و بیانات کا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ انہی کی روشنی میں کوئی مثبت نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش ہوگی۔

(ا) **نکات الشعراء** :- مؤلف میر تقی میرؔ ہیں اور سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ/ ۵۲-۱۷۵۱ء لکھتے ہیں۔

''شاعرِ ریختہ از خاکِ اورنگ آباد است۔ میگویند کہ در شاہجہاں آباد، دہلی نیز آمدہ بود، بخدمت میاں گلشنؔ صاحب رفت، واز اشعارِ خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود، ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختۂ خود بکارِ ببُر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔ از کمالِ شہرت احتیاج تعریف ندارد، واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست۔'' ۴

میرؔ کے بعد شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں میں سید فتح علی حسینی گردیزی کا شمار دوسرے نمبر پر کیا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میرؔ کے ''نکات الشعراء'' کے جواب میں ہی لکھا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے میرؔ کے تذکرے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ۵

(۲) گلشنِ گفتار :- اس کے مصنف خواجہ خان حمید اورنگ آبادی ہیں۔ اس تذکرہ کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء ہے۔ لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولی محمد ولیؔ احمد آبادی عجب فکر رسائے داشت و دیوان دلچسپ رنگینی طرح نمودہ اکثر اوقات خود در طلب علم گزرانیدہ در بلدہ دار السرور برہان پور نیز مدتی سکونت داشت وبجانب میاں سیّد معالی کہ از مشائخ زادہائے گجرات بودند میل تمام داشت۔ دیوان مشہور ومعروف دارد آخر عمر در گجرات وفات نمود'' ۶

(۳) تذکرۂ ریختہ گویاں :- اس تذکرے کے مؤلف سیّد فتح علی حسینی گردیزیؔ ہیں اور اس کا سنِ تالیف ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۳ء ہے۔

''مظہرِ کمالات خفی وجلی، محمد ولی، در دکن، چہرۂ ہستی افروختہ از بدوِ شعورِ دولت معنی اندوختہ، کمانِ پُر زورِ سخن را بہ نیروئے فکرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہدف معنی رسیدہ ہر چند اشعارِ آبدارش زیب صفحۂ لیل ونہار است و گوشوارۂ سوامع سخن سرایانِ روزگار لیکن بنابر التزام بہ تحریر بیتے چند بامجاز واختصار پرداخت ۷

(۴) مخزنِ نکات :- مصنف :۔ شیخ محمد قیام الدین قائمؔ چاندپوری۔ اس تذکرہ کا سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۵ء لکھتے ہیں۔

''شاہ ولی اللہ ولیؔ تخلص شاعرے است مشہور، مولدش گجرات است گویند بہ نسبت فرزند شاہ وجیہؔ الدین گجراتی کہ از اولیائے مشاہیر است افتخارہا داشت در سن چہل وچار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ ابوالمعالی نام سیّد ہسرے کہ دلش فریفتہ او بود بجہاں آباد آمدگاہ گاہ بزبان فارسی دوسہ بیت در وصف خط وخالش می گفت۔ ۸

(۵) تذکرۂ شعرائے اردو :- مؤلف :۔ میر حسنؔ دہلوی ہیں۔ اس کا سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء ہے لکھتے ہیں:

''از سلک متقدمین غفر اللہ لہم، درویش خفی وجلی، شاہ ولی اللہ، المتخلص بہ ولیؔ، مشہور

ومعروف مردے بود از خاکِ گجرات بریک صنمی عاشق شدہ، دروقتِ محمد عالم گیر بہ ہندوستانِ جنّت نشان آمدہ، در خدمت شاہ گلشنؔ قدّس اللہ سرّہٗ، استفادہ حاصل نمودہ از توجہِ آں بزرگوار مقبول اعلیٰ وادنیٰ گردید تعریفش از احاطۂ تحریر وتقریر بیرون است بنائے ریختہ را چنین مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاق سپہر افزود وچوں دکھنی است اکثر بزبان خود حرف زدہ است ابتدائے ریختہ از اوست اوّل اُستادی این فن بنام اوست۔''۹

ان اوّلین تذکروں کے بعد شمالی ہند میں جتنے تذکرے اور شعراء کے لکھے گئے وہ بظاہر قدیم شعراء کی حد تک انہی دو چار تذکروں پر مبنی ہیں۔

(۶) تذکرۂ گلشنِ سخن :- اس تذکرہ کے مؤلف مردان علی خاں مبتلاؔ ہیں۔ اِس تذکرہ کا سنِ تالیف ۱۱۹۴ھ/۱۹۸۰ء ہے۔

''دکنی، شاہ ولی اللہ شعرائے دکن میں مشہور وممتاز۔ یہ پہلے شخص ہیں جن کا دیوان دکن میں مشتہر ہوا اور جس نے ریختہ کو رواج دیا۔ کلام میں فصاحت وروانی ہے۔ دیوان میں تین ہزار اشعار موجود ہیں۔'' ۱۰

(۷) تذکرۂ گلزارِ ابراہیم :- اِس تذکرہ کے مؤلف علی ابراھیم خاں خلیلؔ ہیں۔ اِس تذکرہ کا سنِ تالیف ۱۱۹۸ھ/۱۸۴ء ہے۔ ولیؔ کے باب میں رقم طراز ہیں ---

''ولیؔ دکنی، شاہ ولی اللہ۔ اصل وطن گجرات شعرائے دکن میں مشہور وممتاز ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور شاہ گلشنؔ سے استفادہ کیا۔ مشہور ریختہ گویوں میں ہیں اور یہ سب سے پہلے شاعر ہیں جن کا دیوان دکن میں مرتّب ہوکر مشہور ہوا۔'' ۱۱

(۸) گلشنِ ہند :- اس تذکرہ کے مؤلف مرزا علی لطفؔ ہیں۔ اس کا سنِ تالیف ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء ہیں۔ ولیؔ کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں ---

''ولیؔ تخلّص، نام شاہ ولی اللہ، اصل ان کی گجرات ہے پر دکن میں جاکر شعر کہنے میں مشہور ہوئے تھے'' ۱۲

(۹) تذکرۂ طبقاتِ سخن :- مؤلف:- شیخ غلام محی الدین مبتلاؔ میرٹھی۔ سنِ تالیف ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء

ہے۔ ولؔی کے باب میں اس طرح رقم طراز ہیں۔۔۔

''چون دیوانِ ہندی شاہ ولؔی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آں شد'' ۱۳؎

(۱۰) تذکرۂ مخزن الشعراء :- اس تذکرہ کے مؤلف قاضی نور الدین فائقؔ ہیں۔ اس تذکرہ کا سنِ تالیف ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء ہے۔

مخزن الشعراء میں زیادہ تر ان شعراء سے بحث کی گئی ہے جن کا تعلق گجرات سے ہے یا جنھوں نے گجرات میں شعر وشاعری کی قندیلیں روشن کیں۔ قاضی نور الدین فائق خود گجرات کے باشندہ اور بھروچ کے مشہور سادات اور قضاۃ میں سے نہایت ثقہ اور معتبر شخصیت کے حامل ہیں۔ فائقؔ مرزا غالبؔ کے ہم عصر تھے، اور ان کا شمار بڑے تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ولؔی کی بابت لکھتے ہیں۔

''ولؔی تخلص محمد ولی نام مولدش احمد آباد ومدفنش ہم ہماں بلدۂ خجستہ بنیاد ومدفنش مابین مزار موسی سہاگ وشاہی باغ۔ محققانِ این فن را در حالِ او اختلاف است کہ آیا ولؔی از گجرات است و یا از دکن۔ امّا بہ راقم آثم از زبانی ثقافت بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مز بود از بلدۂ مسطور بودہ وسالہا بدکّن ہم گزرانیدہ واز رسالہ معرفت کہ تصنیف اوست'' ۱۴؎

(۱۱) یادگار شعراء :- مرتب :۔ ڈاکٹر اشپرنگر ہیں۔ اس تذکرہ کا سنِ تالیف ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء ہے۔ انھوں نے ولؔی کے ضمن میں یوں لکھا ہے کہ۔۔۔

''ولؔی شاہ ولی اللہ (شورشؔ وذکاؔ) ساکن گجرات شاہ وجیہ الدین علویؒ کی اولاد میں سے تھے'' ۱۵؎

(۱۲) سخن شعراء :- اس تذکرہ کے مؤلف عبد الغفور خاں نساؔخ ہیں اور اس کا سنِ تالیف ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء ہے۔ لکھتے ہیں۔۔۔

''ولؔی تخلّص، شاہ ولی اللہ، اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے تھے۔ بعض تذکرہ والوں نے اُن کا نام ولی محمد لکھا ہے اور اُن کو مؤجدِ ریختہ جانتے ہیں لیکن مقتضائے تحقیق یہ ہے کہ اُن کے زمانے کے آگے ہی دکن میں شعرائے ریختہ گو موجود تھے۔ غرض یہ اپنے وقت کے

استاد تھے۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا ہے۔'' ۱۶

(۱۳) آبِ حیات :- اِس تذکرہ کا سنِ تالیف ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۸۰ء۔ اِس کے مصنف محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین علویؒ کے مشہور خاندان میں سے تھے۔'' ۱۷

(۱۴) تذکرۂ آثار الشعراء ہنود :- اس تذکرہ کے مؤلف منشی دیبی پرشاد ہیں یہ تذکرہ ۱۸۸۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ولی سے متعلق وہ رقم طراز ہیں۔۔۔

''ولی گجراتی موجّد شعر اُردو کا مشہور ہے'' ۱۸

(۱۵) آثار الشعراء :- اس تذکرہ کے مؤلف سیّد ممتاز علی بھوپالی ہیں جس میں انہوں نے ولی کو احمد آباد اور حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے لکھا ہے۔ ۱۹

متذکرہ بالا تذکرہ نویسوں کے بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ ولی کے نام اور وطنیت میں بالکل یک رنگی نہیں۔ تذکرہ نویسوں کے یہاں ولی کے نام کی مختلف صورتیں جیسے ولی اللہ، شمس ولی اللہ، ولی محمد، محمد ولی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سیّد محمد ایم۔ اے۔ لکھتے ہیں۔۔۔

''با این ہمہ ان کے نام، وطن اور تاریخِ پیدائش وفات کے متعلق ہمیشہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں خدا خدا کرکے گذشتہ آٹھ دس سال کی ادبی تحقیقات نے یہ واضح کردیا تھا کہ ان کا نام ولی محمد تھا۔'' ۲۰

جبکہ میرزا علی لطف اور عبد الغفور نساخ نے ولی اللہ لکھا ہے اور صرف محمد حسین آزاد اور نواب علی ابراہیم خاں شمس ولی اللہ لکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف گجرات کے محققین کی رائے یہ ہے کہ ولی کا پورا نام شاہ ولی اللہ تھا اور وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں مدرسہ ''ہدایت بخش'' میں مقدس عالم شیخ نور الدین کی اتالیقی میں تعلیم حاصل کی۔ ان تذکرہ نویسوں اور علماء کے بیانات کے علاوہ احمد آباد کے مشہور صوفی عالم اور بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان کے ایک ممتاز رکن جناب سیّد منظور حسین علویؒ المعروف بہ حسینی پیر صاحب ۲۱ نے ایسی چند دستاویز بھی پیش کی ہیں جن پر ولی اور خاندان کے دوسرے ارکان کے دستخط ثبت ہیں اور جس میں شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان کے ایک اہم محضر (محضر : وہ کاغذ جو قاضی کی مہر سے مزیّن کیا گیا ہو اور جس پر کسی

بات کے لئے لوگ اپنے دستخط اور مُہریں ثبت کریں) پر ولیؔ کی یہ مندرجۂ ذیل مہر کی نشاندہی کی جاتی ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سیّد الدین مدنیؔ نے کیا ہے۔

''خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ بن شریف محمد علوی'' ۲۲

ظہیر الدین مدنیؔ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پروفیسر سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب کے پاس ۱۱۰۷ھ کا ایک تمسک نامہ ہے جس میں بحیثیت گواہ ولیؔ اور اس کے دو بیٹوں کے دستخط ہیں۔ اور ولیؔ نے گواہ کی حیثیت سے مندرجۂ ذیل عبارت لکھی ہے۔

''بمضمون متن سید لطف اللہ اقرار نمودند۔ حرّرہٗ محمد ولی اللہ بن شریف محمد العلوی''

اور ولیؔ کے بیٹوں کے دستخط مندرجۂ ذیل لکھے ہیں۔

''قد اطلع علیٰ ذالک الفقیر الی اللہ الغنی احمد ولی اللہ بن محمد شریف العلوی''

''من المطلعین محمد مجتبیٰ ابن ولی اللہ العلوی''

''امجد بن محمد ولی اللہ العلوی'' ۲۳

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنیؔ نے ''ملفوظِ کبیری'' مؤلف: سیّد عبد الملک ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۰ھ جو ولیؔ کے ہم جد تھے کے حوالے سے لکھا ہے کہ ولیؔ کے والد کا ذکر اِن الفاظ میں ملتا ہے۔۔۔

(ملفوظ کبیری یا مصباح عالم حضرت شاہ وجیہ الدین کے انتقال کے تقریباً ۷۰ یا ۸۰ برس کے بعد لکھی گئیں)

''از محمد شریف چار پسر۔ میاں عبد الرحمٰن ومیاں حبیب اللہ ومیاں خلیل اللہ ومیاں ولی اللہ ودو دختر''۔ ۲۴

اور ولیؔ کے متعلق مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولیؔ شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی قدس سرہٗ کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولاد سے تھا اور اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔

''شاہ ولی اللہ بن شریف محمد متوفی ۱۰۷۲ھ بن سیّد عبد الرحمٰن بن سیّد احمد متوفی ۱۰۰۸ھ بن سیّد بہاؤ الدین بن حضرت شاہ نصر اللہ حسینی'' ۲۵

(برادرِ حقیقی حضرت قطب العارفین علامہ شاہ وجیہ الدین رحمتہ اللہ علیہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنیؔ نے ولیؔ کے متعلق جن اسناد کا ذکر کیا اس سے یہ بات مترشح نہیں ہوتی کہ

ولی کا نام ''شاہ ولی اللہ'' تھا نیز یہ کہ وہ احمد آباد کے مشہور صوفی حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان کے فرد تھے کیوں کہ کسی بھی تذکرہ نویس کے بیان میں ولی کے نام کے ساتھ شاہ لفظ شامل نہیں ہے جس کا خلاصہ مدنی صاحب نے یوں دیا ہے کہ۔۔۔

''حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان کے اکثر ناموں کے آگے ''شاہ'' کا لفظ آتا ہے اسی لئے ولی کے نام سے قبل بھی شاہ لفظ استعمال کیا گیا ہے''۔ ۲۶

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام تذکرہ نویسوں نے اگر کہیں بھی شاہ کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ لفظ کی پیداوار بعد کی ہے۔ نیز حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی کے خاندان سے ولی کو منسوب کرنے کی کوئی قطعی شہادت انھوں نے پیش نہیں کی ہے۔ جہاں تک ولی کے نام کا تعلق ہے ان تذکرہ نگاروں کے بیانات پر ہی اکتفا کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ولی کا نام ''ولی محمد'' ہی تھا کیوں کہ قدیم ترین تذکرے ''نکات الشعراء'' اور ''گلشنِ گفتار'' ہیں جو ۱۷۵۲ء میں تحریر ہوئے تھے، جس کی اشاعت اور ولی کی وفات کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے اور قربِ زمانی کی وجہ سے غلطی کے امکانات بہت کم ہیں۔ دوسری ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ۔۔۔

''ولی کے دیوان کا ایک قلمی مخطوطہ جو ولی کے ایک دوست سیّد محمد تقی سر سید ابو المعالی (جو ولی کے خاص دوست تھے) نے تحریر کیا ہے اور جس کا سن تحریر ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء ہے انڈیا آفس لنڈن میں محفوظ ہے اُس میں ولی کا نام ولی محمد ہی درج کیا گیا ہے۔'' ۲۷

اس بیان کی ایک ٹھوس وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کیوں کہ ۱۷۰۰ء میں ولی کے دہلی کے سفر کے وقت سید ابو المعالی ولی کے ہمراہ ہی تھے اس لئے ولی کے صحیح نام ''ولی محمد'' کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔

اسی طرح ولی کے ایک شاگرد ثناء اللہ آبادی کا ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں تحریر کردہ دیوانِ ولی سے جس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے اُس میں ولی کا نام ''ولی محمد'' درج ہے۔ ۲۸

ان شہادتوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولی کا پورا نام ''ولی محمد'' ہے جہاں تک ولی کی وطنیت کا تعلق ہے محققین حضرات کی رائیں اس پر بھی متضاد پائی جاتی ہیں۔ دکن اور گجرات کے محققین نے اپنی تحقیقات

کی بنیاد پر اُسے اپنے یہاں کا باشندہ بتایا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ ابتداء سے ہی (تذکرہ نگاروں سے پہلے) ہی ولؔی کے متعلق اس کی وطنیت کو لے کر جھگڑا شروع ہو چکا تھا جیسا کہ ولؔی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہرگز ولؔی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جو نیہ کے کوچہ میں ہے اس کو وطن سوں کیا غرض

متذکرہ بالا شعر سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ولؔی کے احمد آباد (گجرات) میں حصول تعلیم کی خاطر ایک عرصۂ دراز تک ٹھہرنے، یہاں بود و باس اختیار کرنے، یہاں اُن کے اعزّہ اور احباب کے پائے جانے اور فی الحال اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ولؔی گجراتی تھے یا دکنی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اورنگ آباد اور احمد آباد کے درمیان ولؔی کی مسافرت سے اس زمانے کے لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو۔ لہٰذا بعض کے نزدیک ولؔی دکنی بن گئے ہوں اور بعض کے نزدیک گجراتی اور چونکہ ولؔی ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ممکن ہے اُس زمانے میں مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہوں۔ اُس وقت مشاعروں میں شامل دیگر شعراء حضرات یا سامعین سے داد و دہش یا گفتگو کے دوران ان کی وطنیت کے متعلق گفت و شنید ہوتی ہو، کیوں کہ جو لوگ اس وقت ولؔی کے خاندانی حالات سے واقف نہ رہے ہوں گے ظاہری طور پر یہ جاننے کی ضرور کوشش کی ہوگی۔ آیا ولؔی کا حقیقی وطن کیا ہے؟ لیکن اس کے برعکس ولؔی بذاتِ خود گجرات اور دکن دونوں مقامات کی محبت دل میں رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خود کو اس موقع پر مجبور پایا اور دل سوزی کی حالت میں مندرجۂ بالا شعر کہا۔ اس لئے ولؔی کی وطنیت کے سلسلے میں یہی شعر آگے چل کر تذکرہ نویسوں کے بیانات میں بعض جگہوں پر دکنی اور بعض جگہوں پر گجراتی کی شکل میں بنیادی حیثیت اختیار کر گیا، جیسے بعد کے محققین نے ان تذکروں کو بنیاد بنا کر اس عظیم شاعر کی وطنیت کے حصّے بکھرے کر دیے۔

گجرات کے محقق ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے پروفیسر سیّد نجیب اشرف ندوی کے حوالے سے ولؔی کے متعلق جس تمسّک نامہ کا ذکر کیا ہے اور جس پر ولؔی کے صاحب زادوں کے دستخط کی نشاندہی کی ہے اور حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے ایک خاندانی مَحضَر (مَحضَر:- وہ کاغذ جو قاضی کی مہر سے مزیّن کیا گیا ہو اور جس پر کسی بات کے لئے لوگ اپنے دستخط اور مہریں ثبت کریں) جس پر ولؔی کی مہر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مدنؔی صاحب نے اس کے لئے کوئی ایسی قابلِ یقین بات پیش نہیں کی جسے آنکھ موند کر تسلیم کر لیں۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی مضائقہ

نہیں یہ صرف تحریری طور لکھا گیا ہے جسے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے جناب سیّد منظور حسین علویؒ المعروف حسینی پیر علویؒ ۲۹؎ کی ملکیت بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کی اتنی اہم شخصیت ولی کی اگر اس طرح کی کوئی دستاویزی چیز حقیقتاً موجود تھی تو اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ایسی مُہرِ گراں قدر کو انھوں نے یقینی طور پر بہت ہی حفاظت سے محفوظ رکھا ہوگا۔

جناب سیّد منظور حسین علویؒ حسینی پیر صاحب ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی معرکتہ الآراء تصنیف جس کا نام ''تذکرۃ الوجیہ'' ہے یہ تذکرہ دراصل حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی اور ان کے سجّادہ نشین حضرات پر مستعمل ہے۔ جس میں حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے برادرِ حقیقی حضرت شاہ نصر اللہؒ کے خاندان سے ولی کا رشتہ بتایا گیا ہے۔ ''تذکرۃ الوجیہ'' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''سب سے پہل تقریباً تیسری دہائی میں ولی کے بارے میں حسینی پیر صاحب نے ایسا تحقیقی مواد جمع کیا تھا جس کو حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے اس تذکرہ کی طرح اولیّت کا درجہ حاصل ہے۔ انھیں کی اس تحقیقی مواد سے قاضی اختر جوناگڑھی اور ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی صاحب نے ولی پر اپنی اپنی تحقیقات میں بھرپور استفادہ کیا۔ قاضی اختر جوناگڑھی کے ولی پر مضامین کا جو سلسلہ رسالہ ''مصنف دیوبند'' میں شروع ہوا اس میں حسینی پیر صاحب کے وافر تعاون کا اعتراف بھی ملتا ہے اور وہ خطوط جو قاضی اختر جوناگڑھی نے اس سلسلے میں حسینی پیر صاحب کو لکھے وہ اب بھی وارث حسین علوی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ حسینی پیر صاحب کو اپنی تحقیقات کی بنیاد پر اصرار تھا کہ ولی انھیں کے خاندان کے اور گجراتی تھے اور یہیں مدفون ہیں۔ ۳۰؎

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گجرات میں حسینی پیر علویؒ سے قبل ولی پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا گیا اور جو بھی تحقیقی کام ہوا وہ حسینی پیر علویؒ کی ولادت ۱۸۹۸ء کے بعد، یعنی بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شروع ہوا۔ گویا احمد آباد میں یا گجرات میں ولی کی وطنیت کو لے کر کوئی نزاع اس سے قبل نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد حسینی پیر علویؒ صاحب کی تحقیق سے استفادہ کرنے والوں میں جو دو نام منظرِ عام پر آئے جن میں اوّل قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اور دوم ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی شامل ہیں۔ ان دونوں محققین حضرات کی ولی

کی تحقیق میں پیش قدمی کے ساتھ ولی کی وطنیت کے معاملے نے طول پکڑ لیا۔

یوں تو ولی کو پرانے تذکرہ نگاروں میں بھی کسی نے انہیں ''گجراتی'' لکھا ہے اور کسی نے ''اورنگ آبادی'' اور کسی نے صرف ''دکنی'' لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ ولی کی وفات کے بعد اس قدر طویل مدت کے اثناء میں کوئی ایسی واضح اور ٹھوس حقیقت سامنے نہیں آسکی۔ اردو زبان وادب کے محققین بھی اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ لب کشائی کے لئے انھیں قطعی ثبوت ابھی تک موصول ہی نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب ۱۹۳۳ء میں اس طرح رقم طراز ہیں۔۔۔

> ''ولی کو سب سے پہلے اورنگ آبادی میر صاحب ہی نے لکھا ہے اگر چہ یہ امر متنازع فیہ ہے اور کوئی قطعی ثبوت اب تک بہم نہیں پہنچا کہ ولی اورنگ آبادی تھا یا احمد آبادی۔ ۳۱

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر واقعی ولی احمد آبادی تھے اور ان کی جائے پیدائش اسی مقام پر ہوئی اور وہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی کے خاندانی افراد میں سے تھے تو کیوں ان کی تاریخ پیدائش، وقت پیدائش، تعلیم وتربیت وغیرہ کا حال نہیں ملتا، جب کہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ ولی کی ولادت ۱۶۶۸ء سے قبل ۱۴۹۷ء میں پیدا ہوئے، ان دو تاریخوں کے بیچ تقریباً پونے دو صدیوں کا فاصلہ ہے جب دو صدی پیشتر کے حالات دستیاب ہیں اور ایسے باوقار خاندان کے بعد کے دیگر سجّادہ نشینوں کا بھی حال معلوم ہوتا ہے تو ولی کے کیوں نہیں معلوم ہوتے۔ سیّد حسینی پیر علویؒ نے اپنے تذکرہ ''تذکرۃ الوجیہ'' میں لکھا ہے۔۔۔

> ''آپ کے حالاتِ زندگی میں تذکرہ نویسوں نے مختلف بیان دیئے ہیں جس کی وجہ سے اصل حقیقت پر بھی پردہ پڑ گیا اور کثرت اختلاف کے سبب آپ (ولی) کے وطن اور نام میں مختلف بیان ہیں۔'' ۳۲

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا کہ حسینی پیر صاحب نے بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں ولی کے احمد آبادی (گجراتی) ہونے کی تشہیر کی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد دکنی محققین نے اپنی تحقیقات سے ولی کے متعلق نئے اضافے کئے۔ جس پر دور حاضر کے بعض فضلاء نے تحقیق ونکتہ آفرینی کی داد دی اور دکنی حضرات کے ایک بڑے گروہ نے ولی کے دکنی ہونے کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ بعض نامور محققین نے بھی اس دعوے کو تسلیم کرلیا اور ۱۹۳۷ء میں مملکتِ آصفیہ میں ولی کی دو صد سالہ برسی کے جشن کے موقع پر نہایت واضح اور

تحدّی آمیز انداز میں یہ اعلان کیا گیا کہ۔۔۔

''اس کے بعد گجرات کا کوئی قدردانِ وؔلی خواہ وہ تذکرۂ شعرائے گجرات کا مؤلف
ہو یا کوئی اور محبّ گجراتی وؔلی کو گجراتی کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔۳۳؎

وؔلی کی وطنیت کو لے کر دکن کے علماء کا یہ پُر زور دعویٰ گجرات کے محققوں پر بڑا شاق گزرا اور لفظوں کی اس جنگ کا آغاز ہوا جو آگے چل کر ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدؔنی اور قاضی اختر احمد میاں جوناگڑھی کی محققانہ تحریروں میں ظاہر ہوا۔ آپ دونوں حضرات کی بنیادِ تحقیق اور اس کی اصل حسینی پیر علویؒ کے پاس محفوظ اُس وؔلی کی مہر اور حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندانی شجرہ میں وؔلی کے نام پر ہی تھی۔ اگر وؔلی واقعی اسی خاندان کے فرد تھے تو اسے ثابت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور رہا سوال اس مُہر کا جو حسینی پیر علویؒ صاحب کے پاس محفوظ ہے تو اسے منظرِ عام پر کیوں نہیں لایا گیا۔ اور اس خاندانی شجرہ پر جس پر وؔلی کی مہریں ثبت ہیں اور اس کے صاحب زادوں کے دستخط موجود ہیں وہ کہاں ہیں؟ اور واقعی اگر ایسی کوئی شہادت موجود ہو تو اسے پیش کیا جانا چاہیئے تھا کہ دکنی اور گجراتی کے جھگڑے کو ہمیشہ ہمشیہ کے لئے ختم کیا جاسکتا۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۳۴؎ ۱۸۹۷ء میں جوناگڑھ میں پیدا ہوئے ان کی شادی احمد آباد کے اعلیٰ خاندان میں ہوئی تھی اس وجہ سے قاضی صاحب کا اکثر وبیشتر احمد آباد آنا جانا لگا رہتا تھا اور سیّد حسینی پیر علویؒ سے رابطے کی غالبًا یہی وجہ تھی اور غالبًا اسی سلسلے سے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اور سیّد حسینی پیر علویؒ کے مابین خط وکتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ گویا وہ بنیادی چیزیں جس کا ذکر حسینی پیر علویؒ نے وؔلی کے متعلق کیا ہے، بعد میں انھی بنیادوں پر قاضی اختر جوناگڑھی نے اپنی تحقیق کا آغاز کیا۔ یہ تمام واقعات ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۴ء کے درمیان کے ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے ذہن میں وؔلی کے متعلق تحقیق کا آغاز شروع ہونے پر انھوں نے اپنی رائیں یک طرفہ قائم کیں اور سب سے پہلے تذکرہ نویسوں کے بیانات کی روشنی میں وؔلی کو ''گجراتی'' ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اپنی تحقیق کو مزید تقویت بہم پہنچانے کی خاطر موصوف نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''جہاں تک وؔلی کے وطن کا تعلق ہے ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ گجراتی
تھے اور شواہد ذیل ان کے گجراتی ہونے کے ثبوت میں اس قدر قطعی یقینی اور ناقابلِ

تردید ہیں، کہ اب اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔'' ۳۵؎

موصوف نے ولی کے گجراتی الاصل ہونے کی بنیاد جن شواہد پر قائم کیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں۔

(۱) حضرت شاہ وجیہ الدینؒ علویؒ گجراتی کے خاندان سے ہونا ۳۶؎

(۲) احمد آباد میں اپنے خاندانی مدرسہ میں تعلیم و تربیت ۳۷؎

(۳) گجراتی پیر طریقت اور استاد ۳۸؎

(۴) خاندانی بزرگوں کی مدح اور عزیزوں کا ذکر دیوانِ ولی میں ۳۹؎

(۵) گجراتی احباب و تلامذہ ۴۰؎

(۶) وطن کی محبت میں فراقِ گجرات والا قطعہ اور مثنوی در تعریفِ سورت ۴۱؎

(۷) کلام ولی میں بعض گجراتی مقامات اور گجراتی لباس وغیرہ کا ذکر ۴۲؎

(۸) گجراتی الفاظ و محاورات کا استعمال دیوانِ ولی میں ۴۳؎

(۹) احمد آباد میں وفات اور خاندانی قبرستان میں دفن ہونا ۴۴؎

(۱۰) تاریخِ وفات کا قطعہ از محمد احسنؔ مفتی احمد آباد جو گجرات ہی سے دستیاب ہوا ۴۵؎

الغرض قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے اوّل تو تذکرہ نویسوں کے بیانات کو، جن میں ولی کو ''گجراتی'' کہنے والے تذکرہ نگاروں کی اکثریت ہے۔ اپنے دلائل کے طور پر صرف پیش ہی نہیں کیا ہے بلکہ ولی کو گجراتی ثابت کرنے والے ان بیانات کو حرفِ آخر بھی قرار دے دیا ہے۔ لیکن موصوف نے اپنی تحقیق میں اتفاق و اختلاف اور حمایت و مخالفت کا رویہ روا رکھا ہے۔ یعنی ان تمام بیانات سے، جو ولی کو گجراتی ثابت کرتے ہیں، انھوں نے اس سے اتفاق و حمایت کی ہے اور اس کے علی الرغم جن دلائل سے ولی کا گجراتی ہونا ثابت نہیں ہوتا ان سے شدید اختلاف کیا ہے۔ دکنی محققین و مصنفین سے متعلق ان کی آراء اسی تنگ خیالی کا مظاہرہ کرتی ہے جو راقم الحروف کے خیال میں مبادیاتِ تحقیق کے خلاف ہے۔

اوّل تو انھوں نے تذکرہ نویسوں کے بیانات پر ہی اکتفا کر لیا کہ کتنے تذکرہ نگاروں نے ولی کو ''دکنی'' لکھا ہے اور کتنوں نے نے ''گجراتی'' لکھا ہے۔ ان تذکرہ نویسوں کے بیانات کو ذہن میں رکھیئے تو معاملہ صاف ہو جائے گا کہ ایک طرف تو موصوف نے ''بیانات اور قیاس آرائیوں'' کو مآخذ کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور دوسری جانب خود انہی کی تحقیق اسی طرح کے بیانات اور اسی طرح کی قیاس آرائیوں کی خوشہ

چیں ہے۔

ولی کے گجراتی ہونے کی جن دیگر دلائل کا قاضی اختر جوناگڑھی نے ذکر کیا ہے ان تمام کی حقیقت صرف ضمنی اور جزوی ہے۔ جو ولی کی حیاتِ زندگی میں بھی موجود تھیں۔ جیسا کہ راقم الحروف نے گذشتہ صفحات میں ان متنازع فیہ نکات کی فہرست پیش کی ہے اور اگر قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہی اپنی ساری تحقیقی قوت صرف کر کے نتیجہ برآمد کرلیا ہے۔ یہاں بھی محض قیاس آرائیاں ہی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں صرف استقرائی اور قیاسی استدلال سے انھوں نے ولی کے متعلق دُور از کار نظریہ قائم کرلیا ہے۔ اور کھینچ کھانچ کر ولی کو ''گجراتی'' ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف انھوں نے ولی کے دکنی ہونے کی حمایت میں دکنی محققین کی طرف سے بیان کردہ تمام دلائل پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''دکنی مصنفین اور اہلِ قلم نے حُبِّ وطن کی بنا پر یا عصبیّت کے جوش میں آکر ولی کو دکنی ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انہوں نے بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود ولی کے بعض اشعار کو اپنی قیاس آرائیوں کا مآخذ بنا کر ولی کو دکنی بلکہ اورنگ آبادی بنا دیا۔'' ۴۶

قاضی اختر جوناگڑھی نے ولی کے ''دکنی'' ہونے پر مزید اعتراض کرتے لکھا کہ۔۔۔

> ''ولی کے ''دکنی'' ہونے کا صور اس بلند آواز سے پھونکا گیا کہ ولی کے ''دکنی'' ہونے کو اس قدر مسلّم مان لیا گیا کہ اب اس میں چوں وچرا کی گنجائش باقی نہیں رہی، اور دکن کے بعض ادیبوں نے جو ''ماہرِ دکنیات'' سمجھے جاتے ہیں، ولی کے دکنی ہونے پر گویا اتمامِ حجّت کردی ہے اور اس بارے میں اپنی تحقیقات کو انھوں نے قولِ فیصل کا رتبہ دے دیا ہے۔ چنانچہ ولی کے دکنی ہونے کی دلائل میں دکنی محققین کی طرف سے پیش کردہ دلائل کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔ ۴۷

موصوف نے دکنی محققین کی طرف سے ولی کے دکنی الاصل ہونے کی جن شواہد کو پیش کیا ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) تذکرہ نویسوں نے ولی کو دکنی اورنگ آبادی لکھا ہے۔

(۲) خود ولی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دکنی تھے۔

(۳) ولیؔ نے فراقِ گجرات والے قطعہ میں لفظ ''سیر'' لکھا ہے جس سے صرف بطورِ سیروسیاحت ان کا گجرات جانا ثابت ہوتا ہے۔

(۴) ولیؔ نے اپنے کلام میں اپنے ہم عصر دکنی شعراء کا ذکر کیا ہے۔

(۵) دیوانِ ولیؔ کے ایک قلمی نسخہ (موجودۂ کتب خانۂ انڈیا آفس) کے آخر میں کاتب نے جو ولیؔ کے دوست ابوالمعالی کا بیٹا ہے ولیؔ کو ''متوطن دکن'' لکھا ہے۔ ؎۴۸

المختصر یہ کہ تقریباً ۱۹۳۰ء کے بعد سے یہ ضرورت شدّت سے محسوس ہوئی کہ ولیؔ سے متعلق تحقیق کی جائے اور یہ پتہ لگایا جائے کہ اس کا حقیقی وطن کہاں ہے؟ اور وہ کہاں پیدا ہوئے؟ ان کا سالِ ولادت کیا ہے؟ ان کی وفات کب ہوئی؟ ولیؔ کا تعلق کس خانوادے سے ہے؟ اور ان کے دیگر رشتہ دار کون ہیں؟ ان کی تعلیم وتربیت کہاں ہوئی؟ انھوں نے اپنے کلام میں کن حضرات کا ذکر کیا ہے؟ ان سے ولیؔ کے کیا تعلقات ہیں؟ ان کا کلام وطن کے متعلق کیا گواہی دیتا ہے؟ غرض ولیؔ کے وطن کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے ولیؔ کے دیوان کے ایک ایک شعر کے ایک ایک لفظ کو چیر پھاڑ کی گئی اور اس میں وہ معنی اور مطالب بھی پیدا کئے گئے جو نہیں نکلتے تھے، تاکہ اردو کے اس عظیم الشان شاعر کو اپنے ملک اور وطن سے جوڑ کر یہ فخر حاصل کیا جا سکے، کہ اردو کا یہ بلند پایہ شاعر ''ہمارا'' ہے۔

ولیؔ کو اپنے وطن سے منسلک کرنے کے اسی مقصد کے حصول کے لئے دکن اور اہلِ گجرات میں کشاکشی شروع ہوگئی۔ اگر اس تنازع کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ ولیؔ کی وفات کے کم وبیش ڈھائی سو سال تک ولیؔ دکنی ہی نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب گجراتی میں پہلی بار ولیؔ کو گجرات سے منسوب کیا گیا تو علمی حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ قدیم شعراء کے تذکرے کھنگالے گئے اور یہ اوسط نکالنے کی کوشش کی گئی کہ کتنے تذکرہ نگاروں نے ولیؔ کو ''دکنی'' لکھا ہے اور کتنوں نے ''گجراتی'' اور پھر خود ہی صداقت کا ایک پیمانہ بنا کر انہیں صحیح اور غلط کہا گیا۔ پیروں کی بیاضیں کھلیں اور ولیؔ کے حسب ونسب کو اپنے خاندانی شجروں سے جوڑنے کی کوشش کی گئی، لیکن ولیؔ کے متعلق بیانات میں کوئی ایسی پختہ وقوی شہادت سامنے نہ آسکی۔

ولیؔ کی وطنیت اور نام وغیرہ کو لے کر جو معاملات قاضی اختر جوناگڑھی نے اُٹھائے ان کا قطعی ثبوت فراہم کرنے سے وہ بھی قاصر رہے۔ ان معاملات کو لے کر انھوں نے سیّد حسینی پیر علویؒ سے جو خط کتابت کی وہ

خطوط زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں، جن میں سیّد حسینی پیر علویؒ سے ولیؔ کی وطنیت اور نام وغیرہ کو لے کر جو سوالیہ نشان قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے ذہن میں تھے پوچھ گچھ کی گئی ہے۔ ان خطوط کی تعداد پانچ ہے جو گجرات اردو ساہتیہ اکادمی کے مجلّہ ''سابرنامہ'' میں ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ چونکہ سیّد منظور حسین علویؒ المعروف حسینی پیر صاحب اور قاضی احمد میاں اختر صاحب کا، ولیؔ کو ''گجراتی الاصل'' ثابر کرنے میں مرکزی کردار رہا ہے۔ لہٰذا اِن دونوں حضرات کے درمیان جو گفتگو خط وکتابت کے ذریعے ہوئی اُس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لہٰذا اِن خطوط کو مطالعہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ تا کہ اِن دونوں حضرات کے مابین جو خط وکتابت ہوئی اُس کا صحیح تجزیہ کیا جاسکے۔ یہ پانچ خطوط مندرجۂ ذیل پیش کئے جاتے ہیں۔

پانچ مکتوبات بنام سیّد حسینی پیر علویؒ (والد وارث علوی)

(تمام مکتوبات عیسوی سن ۱۹۴۵ء میں لکھے گئے ہیں)

مکتوب: اوّل

محترم سید صاحب..................... السلام علیکم

عرصہ ہوا آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا، اس کے بعد سے پھر کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ آج ایک علمی ضرورت سے نیاز نامہ ارسال خدمت کررہا ہوں، امید ہے کہ جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔

ولیؔ احمد آبادی پر آپ کا ایک مضمون میرے پرچہ شہاب (مارچ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ۔۔۔

(۱) میاں بابا کے نام سے مشہور تھے۔

(۲) ولیؔ کے عہد میں جو کاغذات تحریر ہوئے ہیں ان پر یہ مہر ہے۔ ''محمد ولی اللہ ابن شریف محمد علوی خاک نعلین غوثی''۔

(۳) ۱۰۷۲ھ میں جب آپ کے والد سید شریف محمد علوی کا انتقال ہوگیا۔ تو اپنے بھائی شاہ خلیل اللہ علویؒ کے زیر تربیت حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرّہٗ کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔

(۴) دکن کا سفر آپ نے غالباً دو دفعہ کیا۔

(۵) ولیؔ سے تقریباً ایک صدی قبل حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرّہٗ کے خاندان کا سلسلۂ آمدورفت قائم ہوچکا تھا اور اکثر حضرات دکن میں بودوباش رکھتے تھے۔ بلکہ خود ولیؔ کے عم

بزرگوار شاہ حفیظ اللہ احمد آباد سے دکن جاکر متوطن ہوگئے تھے جن کا قیام سلسلۂ رشد وہدایت کی وجہ سے حیدر آباد اور زیادہ تر اورنگ آباد میں رہتا تھا۔

(۶) ولّی کا خاندانی قبرستان میں مدفون ہونا۔

(۷) حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزندوں کو شاہان مغلیہ نے مدد معاش کے خاطر اراضی اور یومیہ بھی عطا کئے تھے۔

(۸) سب سے زیادہ خاندانی انساب سے ثبوت۔

مندرجۂ بالا بیانات کے لئے آپ نے کوئی سند نہیں پیش کی۔ اس لئے میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے آپ کے پاس کونسی معتبر شہادتیں موجود ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح ولّی کو گجراتی مانتا ہیں۔ لیکن مندرجۂ بالا بیانات کی سند اگر ملجائیں تو پھر ولّی کو گجراتی ثابت کرنا آسان ہوگا۔ سردست دو زبردست دلیلیں ان کے دکنی ہونے کی اہل دکن کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) خود ولّی کا یہ شعر:-

ولّی ایران وتوران میں ہے مشہور   اگر چہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

میں اس بات کو نہیں تسلیم کرتا کہ ولّی کے زمانہ میں دکن بھی گجرات میں شامل تھا یا گجرات دکن میں۔

(۲) انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ایک مخطوطہ دیوان ولّی کا موجود ہے جو شاہ ابوالمعالی کے بیٹے کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے ''ولّی دکنی'' لکھا ہے۔

ان دو دلائل کے سوا جتنی دلیلیں ہیں وہ سب ہیچ دپوچ ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسی قلمی سندات اور انساب وغیرہ ہوں تو میں ایک مفصل مضمون اس پر لکھنا چاہتا ہوں خصوصاً زوؔر حیدر آبادی کے اس مضمون کے جواب میں جو انہوں نے ''رسالۂ المؤمن کے یادگار ولّی نمبر'' میں لکھا ہے۔

آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن اگر تکلیف فرما کر مندرجۂ بالا سوالات کا جواب عنایت فرمائینگے تو ایک علمی سوال طے ہوجائیگا۔ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ وہ سب شہادتیں آپ کے پاس موجود ہیں تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ کرونگا۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص احقر

اختؔر

مکتوب : دوم

اختر منزل

جونا گڈھ

یکم فروری ۴۵ء

سیدی ومولائی، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

اس سے قبل نوازش نامے کی رسید دے چکا ہوں۔ واقعی آپ نے بڑی زحمت فرما کر حضرت ولؔی رحمتہ اللہ علیہ کے مفصل خاندانی حالات قلمبند کئے ہیں جن کے بغیر ولؔی کو گجراتی ثابت کرنا ناممکن ہے، اس سلسلے میں نسب نامۂ حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ بہت اہم چیز ہے۔ لیکن کیا یہ مکمل شجرۂ نسب ہے؟ یا آپ نے اصل شجرۂ نسب کا انتخاب کیا ہے؟ اگر اصل شجرۂ نسب کی نقل مل جائے تو اس کا حوالہ دیا جاسکے۔ پھر یہ شجرۂ نسب کس کے قبضہ اور ملکیت میں ہے؟ میرا خیال ہے کہ اصل شجرۂ نسب کا فوٹو لے لیا جاوے تاکہ مستند چیز ہو۔ دیگر عرض یہ ہے کہ اس سلسلہ میں آپ نے مندرجۂ ذیل مخطوطات کے حوالے دیئے ہیں۔

(۱) نورالمعرفت تصنیف حضرت ولؔی (۲) اعراس نامہ مصنفہ عبدالملک کے مرتب احسن مارہروؔی اور مولوی عبدالحق کی تائید نے ان کی جرأتیں بڑھادی ہیں۔ آخرالذکر نے تذکرۂ فائق کے دیباچہ صفحہ ۵ میں (۱۹۳۳ء) ولؔی کے اختلاف وطن کے متعلق یہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ ''اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے'' پھر ۳۵ء میں میؔر کے ''تذکرۂ نکات الشعراء'' کے دیباچہ میں (صفحہ ۷) لکھا ہے۔

ولؔی کو سب سے پہلے اورنگ آبادی میؔر صاحب ہی نے لکھا ہے اگر چہ یہ امر متنازع فیہ ہے اور کوئی قطعی ثبوت ابتک بہم نہیں پہنچا کہ ولؔی اورنگ آبادی تھا یا احمد آبادی''

بہر حال صرف آپ کی دی ہوئی معلومات اور آپ کی امداد کی بناپر انشاء اللہ ہم ثابت کریں گے کہ ولؔی احمد آبادی تھے اگر چہ اس کام کو ایک کافی عرصہ لگے گا۔

ولؔی کی تاریخ وفات ''باد پناہ ولیؒ ساقی کوثر علیؑ'' سے ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے نہ ۱۱۱۹ھ اگر آپ کے پاس ہوں تو مطلع فرمائیں۔

ولیؒ کی قبر کا جو حال آپ نے تحریر فرمایا ہے اس سے تو شبہ ہوتا ہے کہ فی الحال ان کی قبر کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن اگر آپ کو یقین ہو کہ یہی انکا مزار ہے تو اس کا ایک فوٹو درکار ہے۔

میں ارادہ کرتا ہوں کہ دو ایک ماہ میں احمد آباد خاص اسی کام کے لئے آؤں اور حاضر خدمت ہو کر آپ سے اس سلسلہ کی تمام چیزیں حاصل کروں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

میں نے ولیؔ کے سلسلہ میں اردو کے تقریباً تمام تذکرے پڑھ ڈالے ہیں اور ان میں سے ان کے گجراتی ہونے کے متعلق بکثرت نوٹ لئے ہیں۔ آپ نے ان کے معاصر شعراء کاملؔ، اکملؔ، اور شمس الدینؔ کا ذکر کیا ہے مگر کسی تذکرہ میں ان بزرگوں کے حالات نہیں ملتے اگر آپ کے پاس ان کے کچھ حالات اور کلام ہوں تو ارسال فرمایئے۔

اہل دکن نے ولیؔ کو دکنی بنانے کیلئے زبردست پروپیگنڈا کیا ہے خصوصاً کلیاتِ ولیؔ۔

(۳) مصاباح العالم المعروف بہ ملفوظات کبری از عبدالملک۔

(۴) خلاصۃ الوجیہ عربی مصنفۂ احمد بن محمد فاروقی۔

(۵) گلزار اتقیا۔

میں چاہتا ہوں کہ ان کتابوں کو اپنی نظر سے دیکھ لوں یہ کام تو جب ہی ہوسکتا ہے کہ میں احمد آباد آؤں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ان کتابوں کی محولہ عبارتوں کے صفحات کا فوٹو لیا جائے اس کے جو اخراجات ہونگے وہ میں آپ کو تخمینہ معلوم ہونے پر پیشگی بھیجدونگا۔ مجھے اس سندے جلوس عالمگیری کی بھی ضرورت ہے اس کا فوٹو بھی چاہیے۔ نیز آپ یہ تحریر فرمائیں کہ یہ مذکورۂ بالا ۵ قلمی کتابیں آپ ہی کے پاس ہیں۔ یا کسی اور شخص کے پاس۔

مطبوعات میں سے میرے پاس صرف ''مآثر الکرام'' اور ''برکات الاولیاء'' ہیں۔

تاریخ برہان پور، روضۃ الاولیاء بیجاپور، تاریخ گلزار آصفیہ اور واقعات مملکت بیجاپور جیسا کہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تاریخ صحیح نہیں ہے۔ حاتمؔ دہلوی کا ایک شعر ہے جس میں ولیؔ کو مخاطب کیا ہے۔ حاتمؔ کی یہ غزل ۱۱۴۲ھ میں لکھی گئی ہے۔ شعر یہ ہے

اے ولیؔ مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے ۔۔۔ یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سن میں ولیؔ دہلی میں موجود تھے۔ اس لئے جو لوگ ۱۱۴۲ھ میں

ان کا سن وفات لکھتے ہیں وہ مجھے صحیح معلوم ہوتا ہے بہر حال اس سلسلہ میں بھی تحقیقات جاری ہیں۔ اگر آپ بھی اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالیں تو یہ عقدہ لاینحل حل ہوجاوے۔

نورالمعرفت مصنفۂ ولؔی کو اگر آپ میرے لئے نقل کراسکیں تو بڑا کرم ہو۔ پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں ایک کاتب صاحب کو میں نے مقرر کرایا ہے۔ وہ بہت خوشخط ہیں اور میرے لکھنے پر اس کی نقل تیار کر دیں گے۔ اسی کتب خانہ میں ایک نسخہ دیوان ولؔی کا ہے جو میں نے یہاں سے خریدا کر بھجوایا ہے۔ غالباً وہ بارہویں صدی کا ہے۔

دکنی اہل قلم نے یہ غضب کیا ہے کہ دیگر شعرائے گجراتِ مثلاً ''ہاشم علی اور احمد گجراتی وغیرہ کو بھی دکنی قرار دے دیا ہے اور ہم کو خبر نہ ہوئی۔ اب ہمیں اس تمام پچھلی غفلت اور بے توجہی کی تلافی کرنی پڑے گی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ پروفیسر شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین میں ولؔی کے گجراتی ہونے پر مضمون لکھا ہے۔ میرے پاس ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک کی فائلیں موجود ہیں۔ مگر کسی نمبر میں ان کا یہ مضمون نہیں ہے۔ مئی ۱۹۲۶ء کے پرچہ میں (جو میرے پاس نہیں ہے) انکا مضمون ''ریختہ'' پر چھپا ہے، کہیں اسی مضمون میں تو ولؔی پر نہیں لکھا۔ اگر کوئی اور مستقل مضمون ہو تو پتہ دیجیئے کہ کس نمبر میں شائع ہوا ہے۔ تذکرۃ الوجیہ کو جلد چھپوانے کا انتظام کرنا چاہیے، بڑی اہم چیز ہے۔

آج کل تمام دن ولؔی کے باری میں تحقیق و مطالعہ میں گزرتا ہے۔ تمام موافق و مخالف مواد پیشِ نظر ہے۔ ایک قلمی معتبر تذکرہ ''طبقاتِ سخن'' میں مصنفہ غلام محی الدین کے حوالہ سے یہ عبارت نظر سے گذری ''چوں دیوان ہندیؔ شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بدہلی رسید'' اس میں آپ کا صحیح نام ولی اللہ اور وطنیت کا ذکر ہے۔ خود ڈاکٹر زورؔ نے اپنے ایک مضمون میں اس کو نقل کیا ہے۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے!

اب اس نیاز نامہ کو ختم کرتے ہوئے مستدعی ہوں کہ آپ حتی الامکان اس کام میں میرا ہاتھ ہٹائیں گے اور ضروری مفید اور قیمتی مشوروں سے ممنون فرمائیں گے۔

مزاج گرامی کی خیریت چاہتا ہوں۔

مخلص احقر

قاضی احمد میاں اخترؔ

مکتوب : سوم

اختر منزل

جونا گڈھ

۱۴/فروری ۴۵ء

سیدی المحترم ۔السلام علیکم

ایک نیاز نامہ اس سے قبل ارسال خدمت کر چکا ہوں مل گیا ہوگا۔ اپنی اولین فرصت میں جواب سے مشرف فرمائیں۔

تاریخ وفات ولیؔ کے مصرع اولیٰ میں سرالہام سے تدخلہ کیا ہے اس لئے ۱۱۱۹ھ برابر ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس قطعہ کے لکھنے والے حسنؔ مفتی کون تھے؟

بعض واقعات ایسے ہیں جن کی بنا پر اس تاریخ وفات کو تسلیم کر لینے میں تردّد پیدا ہوتا ہے۔

مثلاً:- شاہ گلشن سے دہلی میں ملاقات حضرت شاہ صاحب ۱۱۳۹ھ میں دلی آئے تھے اور ۱۱۴۱ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اس اثناء میں جیسا کہ تذکرہ نویس لکھتے ہیں ۳ء جلوس محمد شاہی میں ولیؔ دہلی تشریف لے گئے ہوں۔ ورنہ شاہ صاحب سے ملاقات کیسے ہوتی؟ دوسرے حاتم نے اپنے دیوان زادہ میں ایک غزل درج کی ہے جو ۱۱۴۱ھ کی لکھی ہوئی ہے اس میں کہتے ہیں۔

''ای ولیؔ مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے۔''

شاہ حاتم ۱۱۳۶ھ سے ۱۱۴۱ھ تک دہلی میں تھے اور غالباً اس اثناء میں ولیؔ کا قیام دہلی میں ہوگا۔ محمد یاور خان ناظمِ دہلی کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے۔ مخزن شعرائے گجرات ص۱۱۱ میں لکھا ہے کہ ''دراوئل عہد فردوس آرامگاہ محمد شاہ دراحمد آباد جاں بجانِ آفریں سپرد'' یعنی ۱۱۳۱ھ کے بعد۔ اور بھی بعض قرائن موجود ہیں کہ ولیؔ کم از کم ۱۱۴۱ھ تک زندہ تھے۔

اکرم الدین خان ناظم گجرات اس نام کا کوئی آدمی تاریخ میں نہیں ملتا۔

امور متذکرہ بالا پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیے۔

نیاز کیش

اخترؔ

مکتوب : چہارم

جونا گڈھ

۱۴ / فروری ۔ ۴۵ء

مخدوم ومحترم بندہ حضرت حسینی پیر صاحب ۔ زادت الطافکم ۔ السلام علیکم

آپ کے تین تین عنایت نامے میرے سامنے ہیں اور ان تینوں کا جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ لم بہ شکراللہ من لم بشکر الناس، آپ نے حضرت ولیؔ کے سلسلہ میں جو بیش بہا خاندانی حالات کی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ آپ کے سوا اور کہیں سے ملنے کی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ اور صرف انہی معلومات کی بناء پر ولیؔ کے گجراتی ہونے کا دارومدار ہے۔ ان حالات کی لاعلمی کی وجہ سے لوگوں نے ان کو دکنی اور اورنگ آبادی بنادیا، پہل میرؔ صاحب نے کی جو فرماتے ہیں کہ ''وہ مشہور ہیں میں ان کے حالات سے کماینبغی طور پر واقف نہیں ہوں'' پھر شفیقؔ نے اپنے قول کی بنیاد میرؔ صاحب پر رکھدی اور چند تذکرہ نویسوں نے ان کی تقلید کی وھلم جرا۔

؎ چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

صفائی تحریر و دل نشینی کے علاوہ آپ کے الطاف ناموں کی تفصیلات میرا لئے بہت مفید اور کار آمد ثابت ہورہی ہیں۔ خدا آپ کو جزاے خیر دے کہ آپ اس قدر تکلیف فرما کر کدوکاوش سے لکھ رہے ہیں۔ اب میں آپ کے تینوں کرمناموں کے ضروری مضامین کا بالترتیب جواب عرض کرتا ہوں۔

خط مورخہ ۴ /

(۱) حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے خاندان کے نسب نامہ میں ان کے خاندان کے بعض افراد کا نام نہیں مل سکا اس لئے نیز آپ کے بزرگوں مثلاً حضرات کاملؔ واکمل کا نام نہیں تھا اس لئے آپ سے استدعا کی گئی کہ اگر ممکن ہوتو پورے نسب نامہ کی نقل ارسال فرمائیں۔ لیکن اگر زیادہ طول طویل ہوتو کم ازکم ان چند ضروری ناموں کو نسب نامہ میں درج فرما کر اسی قدر انتخاب بھیج دیں۔ مجھے اس کے فوٹو کی ضرورت نہیں ہے نہ یہ مناسب ہے۔

(۲) قلمی کتابوں کے لئے میں نے اس لئے دریافت کیا تھا کہ میں ان کی موجودگی کا حوالہ دے سکوں۔ مجھے صرف ''نورالمعرفت'' کی نقل کی ضرورت ہے۔ بقیہ کتابوں کے اقتباسات آپ نے دیدئے ہیں جو

میرے لئے کافی ہیں۔ تذکرۃ الوجیہ میں گو وَلی کے حالات نہ ہوں مگر اس سے وَلی کے خاندانی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ اہم ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرّہٗ کے حالات میں کوئی مستقل کتاب موجودنہیں ہے۔ انجمن اسلام بمبئی کے کتب خانہ میں ۳۱۵۲ پر ''مجموعۂ حالات حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ'' نام کی ایک کتاب ہے۔ معلوم نہیں کہ مطبوعہ ہے یا قلمی۔ میں جب بمبئی گیا تھا تو میں نے اس کی فہرست میں سے یہ نام نوٹ کرلیا تھا۔ بیجاپور کی تاریخوں کے متعلق اس لئے دریافت کیا تھا کہ اس میں حضرت شاہ صاحب کے خاندان کے لوگوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے جو دکن میں سکونت پذیر تھے۔ ضرورت ہوگی اس وقت آپ کولکھ کر معلوم کرونگا۔ آپ نے اس بارہ میں بہت کچھ معلومات لکھ دی ہیں جو سردست کافی ہیں۔

(۳) وَلی کی قبر کی پوری تحقیق ہوجائے تو بہتر ہے۔ اس کا فوٹو ضرور بھیجیں۔

(۴) شاہ شمس الدین نسب نامہ میں کس خاندانی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ نہ معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام کیا تھا؟

(۵) وَلی کی سنہ وفات کے متعلق مفتی احسؔن کا قطعہ کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا، مگر بعض واقعات اس کے خلاف پڑتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی تاویل کرنی چاہیئے مثلاً: سراؔج دکنی جسکی شادی میں شرکت کا واقعہ خود وَلی بیان فرماتے ہیں۔

ع شادی میں اس کی صَرف کیا ہوں میں لاج آج

سراؔج کی سنہ ولادت ۱۱۲۷ھ ہے۔ ظاہر ہے کہ وَلی اس سے ۸ برس پہلے انتقال فرماچکے تھے۔ اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ سراؔج کا یہ سنہ ولادت یا تو غلط ہے یا پھر اس سراؔج سے کوئی دوسرا سراج مراد ہے۔ بہرحال میں ان تمام واقعات کو جو وَلی کی سنہ وفات کو ۱۱۱۹ھ سے اوپر لے جاتے ہیں، جمع کررہا ہوں اس کے بعد ان کی تاویل پر غور کرونگا۔

(۶) عالمگیر کے ۷ھ جلوس کی سند مل جائے تو نقل کرکے ارسال فرمائیں۔

خط مورخہ ۵/

(۱) ۱۱۴۲ کو وَلی کی سنہ وفات کے طور پر کسی تذکرہ نویس نے تو نہیں لکھا۔ البتہ ان واقعات ہی سے لوگوں نے استنباط کیا ہے۔ مثلاً شمس اللہ قادری وغیرہ زمانۂ حال کے لوگوں نے وَلی کے دیوان کے مخطوطات کی تاریخِ کتابت سے ۱۱۴۲ھ تک ان کے زندہ ہونے کا خیال کیا ہے۔

(۲) مولوی سید احمد بن سید عابد علویؒ کی بیاض کی عبارتیں آپ نے تحریر فرمادی ہیں اس لئے اب اس کے فوٹو کی ضرورت نہیں رہی۔

(۳) شاہ گلشنؒ کی تاریخ وفات جو شاہ منتجب نے نکالی ہے اس کا مصرعۂ تاریخ آپ نے نقل کیا ہے۔ اگر اس کے اور اشعار ہوں تو تحریر فرمائیں۔ شاہ صاحبؒ کے حالات مندرجۂ ذیل کتابوں میں موجود ہیں۔

ا۔ تذکرۂ بے نظیر از سید عبدالوہاب افتخار مطبوعہ الہ آباد

(۲) سروآزاد (تذکرہ آزاد بلگرامی مطبوعہ

(۳) ''ریاض الشعراء'' از علی قلی خاں والہ داغستانی قلمی اگر ان تینوں کتابوں سے ان کے پورے تذکرے کی ضرورت ہو تو نقل کر کے بھیجوں۔ ان کے حالات میں قابل ذکر امور یہ ہیں کہ ان کے کوئی دادا اسلام خان سلاطین گجرات میں سے کسی فرماں روا کے وزراء میں تھے۔ ان کا خاندان زیادہ تر احمد آباد میں رہا ہے۔ شاہ صاحب سے ایک عرصہ تک برہان پور ہی میں ملاقات ہوئی ہو۔ ایک تذکرہ میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے احمد آباد میں وفات پائی۔ دہلی جانے کے بعد بھی وہ احمد آباد کو وطن سمجھ کر آتے رہے ہیں۔

(۴) مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے گجرات دکن کی نسبت بعض تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں اس کے لئے بھی زیادہ تر آپ ہی کا ممنون ہوں۔

خط مورخہ ۷ ر

(۱) اکرم الدین خان کے حالات مجھے مراۃ احمدی اور یادِ ایام سے معلوم ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلہ میں محمد یار خان ناظم وقلعہ دار دہلی اور محمد مراد خان فوجدار و واقعہ نویس گودھرا، پٹھاسرہ کے حالات بھی ''مآثر الامراء'' اجلد سوم سے معلوم ہوئے۔

خط مورخہ ۱۲ ر

(۱) مفتی محمد احسنؒ کے متعلق آپ نے خوب پتہ لگایا۔ آپ نے ان کی اصل مہر دیکھی یا کسی کاغذ پر چھپی ہوئی۔

(۲) ولی کا دوسرا قطعۂ تاریخِ وفات پورا تحریر فرمایئے نیز یہ بھی کہ آپ کو یہ کہاں سے دستیاب ہوا۔

(۳) ولی کی تاریخِ ولادت کے بارے میں آپ کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یعنی ۵٦۔۱۰۵۵ھ۔

(۴) انجمن ترقی ولی کی یادگار منانے والی ہے۔ اس کا ذکر آپ نے کہاں دیکھا یا پڑھا؟ میں نے ولی کے دونوں شاگردوں اشرف اور رضی کے حالات جمع کئے ہیں۔ مگر رضی کے متعلق تذکروں میں سے صرف ''گلشن گفتار'' میں ان کا ذکر ہے۔ اشرف کے حالات اکثر نے دیئے ہیں۔ اڈنبرا کے دکنی مراثی کے سلسلہ میں رضی کے مزید حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ولی کے چند معاصرین کے حالات اور کلام بھی میں نے مختلف تذکروں سے نوٹ کئے ہیں۔

اب تک سید ابو المعالی کا پتہ نہیں چلا۔ معلوم نہیں کہ وہ احمد آباد کے تھے یا کہ باہر سے آئے تھے؟ ولی کے قلمی دیوان موجودہ ''بھولا ناتھ لائبریری'' میں رضی اور اشرف کی ہم ردیف غزلیں (بقول آپ کے) حاشیہ پر لکھی ہوئی ہیں۔ اگر ان کی نقل مل سکے تو بہت ہی اچھا ہو۔

امید کہ مزاج اقدس بخیر وعافیت ہوگا۔ خدمات سے یاد فرماتے رہیں۔

نیاز آگیں

اختر

مکتوب: پنجم

جونا گڈھ

۲۲ / مارچ / ۴۵

سیّدی و مولائی، سلام علیکم،

کرم نامہ مورخۂ ۱۱/ مارچ مل گیا تھا۔ گذشتہ عشرہ میں آشوبِ چشم نے بہت پریشان رکھا جس کی وجہ سے جواب نہیں لکھ سکا، تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ ''نورالمعرفت'' والے لفافہ سے پیشتر کا نوازش نامہ بھی دستیاب ہوا تھا۔ آپ کا ہر خط میرے لئے قیمتی معلومات کا ایک دفتر ہے۔ حضرت علی رضا کے ولی کے پیر ہونے کے متعلق آپ کو معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔ کاش ابو المعالی کا پتہ لگ جاتا۔ مولانا نورالدین کو پیر روشن ضمیر لکھنے سے ان کا پیر ہونا تحقیقی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ صرف ایک قیاس ہے کہ جن کی مدح میں پورا رسالہ لکھ ڈالا ہے۔ شاہد ان سے کوئی نسبت وارادات ولی کو ہو۔

احسن مارہروی کا کلیات نامکمل اور الحاقیات سے لبریز ہے، آخر میں انجمن ترقی کی طرف سے جن نسخوں کے اختلافات کی جدولیں دی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر نسخے دیوان کے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ خود احسن مرحوم نے کئی غزلوں اور اشعار کے الحاق کا اقرار کیا ہے۔ انہوں نے ہر ولی کے تخلص والے شعر یا غزل کو ولی کا سمجھ کر درج دیوان کر دیا ہے اور مقدمہ میں بھی بہت سی باتیں غیر محققانہ لکھ دی ہیں۔ اسی طرح فرہنگ الفاظ میں کئی الفاظ اور ان کے معانی غلط لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر داڑم کو واڑم (انار) لکھا ہے۔ اسی طرح اس شعر میں۔۔۔

تو جوڑا لجکری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

احسن نے بتایا ہے کہ بالوں کا جُوڑا الجکری کا اور کریلا دھار دکن میں مشہور ہے حلانکہ ایک نسخہ میں (حسب ضمیمہ) چوڑا لجکری کا لکھا ہے۔ اصل میں بڑی چوڑی ہاتھی دانت کی جسکو چوڑا کہتے ہیں اور کریلا دھار بمعنی کنگن جس پر کریلے کے سے نقش ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہاں یہ سہاگ کی علامتیں اور کہاں جوڑا باندھنا۔ میں نے خاص گجراتی الفاظ و محاورات ولی کے کلام میں نوٹ کئے ہیں جو اہل دکن نہیں بولتے۔ مجھے صغیر بلگرامی کا ''تذکرہ جلوۂ خضر'' مل گیا ہے جو آج کل نایاب ہے۔ اس میں ولی کے کلام کو تین قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ ایک قدیم دکنی، دوسرا دکنی محاورات بغیر کا اور تیسرا بالکل صاف دہلوی طرز کا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ٹھیٹھ دکنی کلام ولی کا نہیں ہے بلکہ الحاقی ہے۔

ولی کے سلسلہ میں آپ سے بہت قیمتی معلومات ملی ہیں جن کا شکریہ ادا نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے اور جب کبھی ولی پر میرا مقالہ یا کتاب چھپے تو اس کا سہرا آپ ہی کے سر ہوگا۔ مزاجِ اقدس کی خیریت چاہتا ہوں۔

مخلص

اختر

مذکورہ بالا ان مکتوبات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی احمد میاں بذات خود ولی کے متعلق لاعلم ہیں اور ان کی معلومات صرف اس قدر ہے کہ وہ اس سے قبل ولی کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں اور انھیں ولی کی وطنیت، نام، قبر کی نشاندہی وغیرہ سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ چوں کہ ان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ ولی کو مشکوک گنتے، یہی وجہ ہے کہ وہ بذاتِ خود ولی کی وطنیت اور نام وغیرہ سے

متفق نہیں ہوتے اور انھوں نے ولؔی کے گجراتی ہونے پر اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہوگا کہ قاضی احمد میاں اخترؔ ایک پرچہ''شہاب'' نامی جوناگڑھ سے نکالتے تھے اور اس پرچہ''شہاب'' میں ۱۹۳۷ء میں سیّد حسینی پیر علویؒ کا مضمون شائع ہوا تھا جس میں ولؔی کو پہلی مرتبہ گجراتی قرار دیا گیا تھا۔ نیز ولؔی کے متعلق دیگر انکشافات بھی کیئے گئے تھے۔ موصوف کے اسی مضمون کو بنیاد بنا کر قاضی احمد میاں اخترؔ نے ولؔی کے متعلق اپنے اعتراضات اُٹھائے ہیں۔ اور سیّد حسینی پیر علویؒ سے ولؔی کے نام، وطنیت اور دیگر منسلک باتوں کے دلائل طلب کئے ہیں۔ جیسا کہ ان کے مکتوب اوّل سے ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کے مکتوب سے ہی ولؔی کے''گجراتی'' ہونے کی بات خارج ہوجاتی ہے۔ اور ان کے تحریر کردہ مکاتیب پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔

تاہم سیّد حسینی پیر علویؒ اور قاضی احمد میاں اخترؔ جوناگڑھی کے مکتوبات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے، کہ ولؔی کے نام، وطنیت، وفات اور قبر کے متعلق تمام باتیں مشکوک ہیں۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ تمام خطوط ولؔی کے نام، وطنیت، وفات اور قبر کے متعلق خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان مکتوبات کی تنقید اور تنقیح کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے اُنہیں مندرجۂ ذیل پیش کیا جارہا ہے تاکہ اُس کی روشنی میں ولؔی کے متنازع فیہ معاملات میں مثبت نتائج برآمد کئے جاسکیں۔ ان مکتوبات سے حاصل شدہ تجزیہ اور نچوڑ حسبِ ذیل ہیں۔

مکتوب : اوّل

اس خط میں آٹھ نکات درج ہیں۔ جن کی تفصیلات قاضی صاحب نے طلب فرمائی ہیں۔ اس پہلے خط میں ولؔی کو جو''میاں بابا'' کے نام سے مشہور تھے، پہلی بار زیرِ تحریر لایا گیا ہے۔ اس سے پیشتر کسی محقق یا ادیب کی تحریروں میں یہ نام پڑھنے یا سُننے میں نہیں آیا۔ مکتوب اوّل کے جن آٹھ بیانات کی وضاحت قاضی احمد میاں نے طلب کی ہے اس کے لئے انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ۔۔۔

''ان بیانات کے لئے آپ (حسینی پیر علویؒ) نے کوئی سند پیش نہیں کی ہے۔
اس لئے میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے آپ کے پاس کون سی شہادتیں موجود ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح ولؔی کو گجراتی مانتا ہوں لیکن اگر مندرجۂ بالا بیانات

کی اگر سند مل جائیں تو پھر ولؔی کو گجراتی ثابت کرنا آسان ہوگا ۴۹؎

اس بیان کو پڑھ کر یہ بات ذہن میں ضرور ابھرتی ہے کہ ولؔی کی وطنیت اور نام وغیرہ کے متعلق قاضی صاحب سفید کاغذ کی طرح ہیں جن پر کسی طرح کا کوئی نقش نہیں ہے۔بغیر تحقیق کے پہلے سے ہی ولؔی کو گجراتی تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ جذبہ غالب آگیا اور ولؔی کو جو گجراتی نہیں تھے، گجراتی ثابت کرنے کی طرف اقدام کیا گیا۔ یہ تحقیق تو نہیں ہے۔حق کی تلاش تو غیر جانب دار ہوکر ہی کرنی چاہیے۔اور وہ خود ولؔی کے گجراتی ہونے کی تشہیر کے ساتھ محوحیرت ہیں اور یہ جاننے کے خواہش مند نظر آتے ہیں کہ ولؔی کے گجراتی ہونے کی معتبر دلائل کیا ہیں۔لیکن اسی پہلے خط میں انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اہلِ دکن نے جو دو دلائل ولؔی کے دکنی ہونے کی حمایت میں پیش کئے ہیں ان کے سامنے تمام دلیلیں، ہیچ و پوچ ہیں۔اس بیان سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ قاضی احمد میاں صاحب کو بھی ولؔی کے گجراتی الاصل ہونے پر پورا شبہہ ہے اور وہ اس بات کو بھی ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ ولؔی کے زمانے میں دکن بھی گجرات میں شامل تھا یا گجرات دکن میں، اس مکتوبِ اوّل پر سالِ تحریر درج نہیں ہے جیسا کہ بعد کے بقیہ مکتوبات پر سن ۱۹۴۵ء درج ہے اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ خط بھی شاید اسی سال کا لکھا ہوا ہوگا۔

مکتوب : دوم

اس مکتوب میں قاضی احمد میاں رقم طراز ہیں کہ۔۔۔

> ''نسب نامۂ حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ بہت اہم چیز ہے لیکن کیا یہ مکمل شجرۂ نسب ہے؟ یا آپ نے اصل شجرۂ نسب کا انتخاب کیا ہے؟ اگر اصل شجرۂ نسب کی نقل مِل جائے تو اس کا حوالہ دیا جاسکے پھر یہ شجرۂ نسب کس کے قبضہ اور ملکیت میں ہے؟ میرا۔۔۔۔خیال ہے کہ اصل شجرۂ نسب کا فوٹو لیا جاوے تاکہ مستند چیز ہو'' ۵۰؎

قاضی صاحب کا یہ خط یکم فروری ۱۹۴۵ء کا تحریر کردہ ہے اور موصوف کے بیان (تحریر) سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ نے اصل شجرۂ نسب نہیں دیکھا ہے۔یعنی ۱۹۴۵ء تک سیّد حسینی پیر علویؒ سے خط و کتابت کے ذریعے ہی وہ ولؔی کے نام، وطنیت وغیرہ پر تبادلۂ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔اور سیّد حسینی پیر علویؒ کی دی

ہوئی روشنی سے ہی وہ راستے تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ولّی کا تعلق حضرت شاہ وجیہ الدین (۹۱۰ھ تا ۹۹۸ھ) کے خاندان سے تھا اور وہ اسی خاندان کے فرد تھے تو اصل شجرۂ نسب میں انکا نام یقینی طور پر ہوتا اور اسے ثابت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور وہ بھی حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے انتقال کے ڈھائی سو برس (۲۵۰) بعد اس شجرۂ نسب کو دیکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیوں کہ ولّی اس قدر گمنام شخص نہیں تھے کہ اعراس نامہ میں ان کے نام کی تلاش وجستجو کی جاتی کیوں کہ ولّی تو ہندوستان گیر پیمانے پر معروف تھے۔

مکتوب دوم میں آگے قاضی احمد میاں مزید لکھتے ہیں کہ۔۔۔

> ''ولّی کی قبر کا جو حال آپ (سید حسینی پیر علویؒ) نے تحریر فرمایا ہے اس سے تو شبہ ہوتا ہے کہ فی الحال ان کی قبر کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن اگر آپ کو یقین ہو کہ یہی ان کا مزار ہے تو اس کا ایک فوٹو درکار ہے'' [۵۱]

اس بیان (تحریر) سے یہاں پھر ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ولّی جیسے مشہور و معروف شاعر اگر حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے تھے اور یہیں احمد آباد کی سرزمین پر ان کا انتقال ہوا تو آپ کا مزارِ مبارک بھی اس خاندان کے دیگر افراد کی طرح نشان زد ہوتا، مزیّن ہوتا۔ مزار پر ان کے نام کی تختی لگی ہوئی ہوتی اور یہ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ ولّی کے مزار کا سراغ لگایا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ولّی کی قبر کون سی ہے؟ جیسا کہ قاضی احمد میاں نے اپنے شبہ کا اظہار کیا کہ ان کی قبر کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے۔ کیوں کہ ولّی جس نے اردو شاعری میں اپنا نام پیدا کیا اور جس کی شہرت کا چرچا شمالی ہند تک پھیلا ہوا تھا کیا یہ ممکن ہے کہ اس عظیم شاعر کی تربت اس قدر خستہ حال ہوتی؟ اور کیا یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ اس کی تلاش وجستجو کی جائے؟ اور کیا صرف سیّد حسینی پیر علویؒ صاحب ہی ان (ولّی) کی قبر کی نشاندہی کرتے؟ اور کیا اس خاندان کے دیگر افراد کو تین سو سال تک اس بات کا خیال پیدا نہیں ہوا کہ ولّی کے مزار کو آراستہ و پیراستہ کیا جائے؟ جیسا کہ ولّی سے ایک صدی قبل حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے مزار کو آراستہ کیا گیا۔ یا اس خاندان کی دیگر مشہور ہستیوں کی قبر پر تختیاں لگائی گئیں اور ان کے قبر کے گرد احاطہ بندی کی گئی۔

آخر ولّی ہی کیوں اس خاندان میں گمنامی کا شکار ہوگئے اور ان کی قبر کا پتہ لگانا تک دشوار ہوگیا۔ ان کی موت پر ہزاروں افراد نے شرکت کی ہوگی اور اس دور کے شعراء نے ان کے انتقالِ پُرملال پر اشعار قلم بند کئے

ہوں گے۔ یا اس عظیم شاعر کی موت پر مرثیے کہے ہوں گے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو ذہن میں شکوک وشبہات کو جنم دیتے ہیں کہ اس عظیم شاعر کی جانب تین سو (۳۰۰) برسوں تک غفلت کیوں برتی گئی؟ جب کہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کا خاندان اپنی علمیت کی وجہ سے مشہور تھا اور حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ بذاتِ خود صاحبِ تصنیف تھے اور یہ خاندان علم کا قدردان تھا تو ولؔی کی جانب سے یہ تغافل کیوں؟ ان کی قبر کو بے سروسامانی کی حالت میں کیوں چھوڑ دیا گیا؟ ولؔی کی عظمت کا احساس ان خاندان کے دیگر افراد کو کیوں نہ ہوا؟ یہ تمام ایسے سوالات ہیں جو ولؔی کے گجراتی الاصل ہونے پر بڑا سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔

مکتوب : سوم

اس مکتوب میں قاضی احمد میاں تحریر فرماتے ہیں کہ۔۔۔

''کیا آپ (سید حسینی پیر علویؒ) بتاسکتے ہیں ولؔی کی موت پر قطع تاریخ لکھنے والے حسؔن مفتی کون تھے؟'' ۵۲؎

راقم السطور کے نزدیک صرف نام پیش کرنا اہمیت نہیں رکھتا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ولؔی کی موت پر قطعہ تاریخ لکھنے والے ان حسؔن مفتی کا تعلق کس خاندان سے تھا؟ کیا وہ شاعر تھے؟ شاعری میں انھوں نے کس سے شرفِ تلمذ حاصل کیا؟ یا ان کا دیگر کلام کہاں ہے؟ وہ کس طرح کے اشعار کہتے تھے؟ کس سن میں پیدا ہوئے؟ ان کا ابتدائی کلام کس طرز کا ہے؟ اصلاحِ سخن کہاں اور کس شاعر سے حاصل کرتے تھے؟ اور اگر یہ قطعِ تاریخ انہی حسؔن مفتی کا ہے تو ان کا دیگر کلام بھی یقینی طور پر موجود ہونا چاہیئے کیوں کہ سیدھے سادے اشعار کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے جب کہ قطعہ تاریخ لکھنا ایک دشوار گزار کام ہے جو بڑا ریاض چاہتا ہے کیوں کہ کوئی نومشق شاعر قطعہ تاریخ نہیں لکھ سکتا قطعہ تاریخ میں حرفوں کی اعداد وشمار عمل میں آتی ہے تاکہ اس کے جوڑنے پر مطلوبہ تاریخ نکل آئے جو ایک مشکل کام ہے۔ یہ تمام سوالات ایسے ہیں جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

یہاں اس مکتوب سوم میں بھی قاضی صاحب نے ان حسؔن مفتی کی معلومات طلب کی ہیں یہاں بھی وہ مکمل تاریکی میں کھڑے نظر آتے ہیں اور سیّد حسینی پیر علوی سے موصول روشنی پر انحصار رکھے ہوئے ہیں۔

مکتوب : چہارم

مکتوب چہارم میں بھی قاضی صاحب وَلی سے متعلق اس طرح پوچھتے ہیں کہ۔۔۔

''وَلی کی قبر کی پوری تحقیق ہوجائے تو بہتر ہے۔'' ۵۳؎

وَلی کی وفات کے تین سو سال بعد وَلی کی قبر کی تحقیق بڑی معنی خیز ہے جب کہ اسی خاندان کے محترم المقام علامہ شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کا مزارِ مبارک ایک صدی سے قبل موجود ہے۔

مکتوب : پنجم

اس مکتوب میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ۔۔۔

''میں (قاضی احمد میاں) نے خاص گجراتی الفاظ ومحاورات وَلی کے کلام میں نوٹ کئے ہیں جو اہلِ دکن نہیں بولتے'' ۵۴؎

موصوف نے وَلی کے کلام میں بہت سے گجراتی الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن کی فہرست یہ ہے۔

''روسنا، جھرنا، گھر گھالنا، بقّال، رام رام، مناہی اور تانتا''

قاضی اختر جوناگڑھی نے مندرجۂ بالا تمام الفاظ کو وَلی کے گجراتی ہونے کی حمایت میں نقل کئے ہیں۔ لیکن آپ مغل حکمرانوں کی سیاسی حکمتِ عملی پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ اِن تمام مغل حکمرانوں کی خاندانی روایت رہی ہے کہ ''توسیعِ سلطنت'' کو فروغ دیں اور اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ہر حکمراں برسرِ پیکار رہا اور جس نے اس پر عمل کیا وہ لائق اور قابلِ ستائش اور حقیقی بادشاہ کہلایا اور جو وارث اس پالیسی پر عمل پیرانہ ہوسکا وہ ذلیل وخوار ہوا۔ اسی وجہ سے شمال اور دکن کی جانب سے متعدد حملوں کی پاداش میں لوگ امن وامان کی تلاش میں محفوظ مقامات کی طرف ہجرت کرتے رہے۔ لہٰذا گجرات سے بھی سینکڑوں افراد دکن کے علاقوں میں رہائش پذیر ہوئے جس وجہ سے دکنی زبان میں سینکڑوں الفاظ گوجری زبان کے شامل ہوگئے۔ اِس طرح گجراتیوں نے اپنی آمدورفت دکن سے اپنی زبان کے لاتعداد الفاظ دکن کی زبان میں شامل کردیئے۔

اُسی زمانے میں جب قاضی اختر جوناگڑھی نے اپنے یہ خطوط حسینی پیر علویؒ صاحب کو لکھے تھے تبھی گجرات کے ایک اور نامور عالم پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب جو گجرات کی قدیم ترین اور انگریزوں کی قائم کردہ

''گجرات کالج'' میں شعبۂ اردو وفارسی میں پروفیسر تھے۔ موصوف شیرانی مرحوم کے شاگرد، فارسی اردو کے وسیع المطالعہ فاضل اور نکتہ رس مبصّر ومحقق تھے۔ انھوں نے ایک خط قاضی اختر جونا گڑھی کی خدمت میں لکھا تھا اور یہ خط بھی ''گجرات اردو ساہتیہ اکادمی'' کے ۱۹۹۹ء کے علمی جریدہ ''سابرنامہ'' میں شائع ہوا تھا جس کے نکات مندرجۂ ذیل درج ہیں ـــــ

(۱) بعض الفاظ کی اصلیّت گجراتی ہے اور دکنی مصنّفین نے گجراتیوں سے ہی لے کران کو استعمال کیا ہے تو یہ چیز بھی ہمارے لئے زیادہ مفید مطلب نہ ہوگی، اس لئے کہ ایک دکنی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کی گجراتی اصلیت مسلّم لیکن اس کا کیا جواب کہ یہ الفاظ ہمارے ہاں بھی مستعمل ہیں۔ اس بناء پر ولؔی کو کیوں کر گجراتی ثابت کیا جاسکتا ہے؟ ۵۵

(۲) چونکہ آپ کے نظریہ کی عمارت اس بنیاد پر قائم ہے، اگر اسے پوری بحث کی جان اور مغزِ سخن کہا جائے، تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ تذکرہ نگاروں میں شروع سے ہی ولؔی کے نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، حمید خان اورنگ آبادی جو ان میں سب سے قدیم تر ہے ولؔی کا نام ''ولی محمد'' اور اس کا وطن ''احمد آباد'' بتایا ہے۔ گردیزؔی اور شفیقؔ ''محمد ولؔی'' لکھتے ہیں ان کے بعد کے تذکرہ نگاروں مثلاً: میر حسؔن وغیرہ کے نزدیک ''شاہ ولی اللہ'' ہے اور آزؔاد اور صغیؔر بلگرامی نے ''ولی اللہ'' سے پہلے شمس کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب آپ حمید خاں کے قول کو نظر انداز کرتے ہوئے جو کہ قدیم ترین ہے، اور ان کے ساتھیوں کو ''متقدمین تذکرہ نویسان'' ٹھہراتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ان کا اندراج ''شاہ ولی اللہ'' ہی اصلی نام ہے۔ اور ولؔی کے نام نسب نامہ میں بھی شاہ ولی اللہ ہی ہے، حالانکہ ابھی آپ کو یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ نسب نامہ والے شاہ ولی اللہ اور ہمارے شاعر ولؔی ایک ہی بزرگوار ہیں۔ ۵۶

راقم السطور کے نزدیک ولؔی کے تمام دیوان میں سے چند الفاظ گجراتی الاصل تلاش کرلینا اور اس بناء پر ولؔی کو گجراتی ثابت کرنا قطعی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ بات بھی اپنی جگہ اتنی ہی اہم ہے، کہ ولؔی تو ایک طویل مدّت تک گجرات میں سکونت پذیر رہے ہیں اور اپنے قیام کے اس طویل عرصے میں اس کا یہاں کی زبان سے متاثر ہونا ایک ناگزیر عمل ہے۔ جب کہ اس کی ذہنی تربیت ہی اسی گجراتی ماحول کی پردہ ہے اور پھر دکن کی زبان کو گجراتیوں نے اپنی آمد ورفت سے بھی بہت پُر مایہ بنادیا ایسی صدرتِ حالت میں اس کے تمام

تر دیوان میں بہت سے گجراتی الفاظ کا پایا جانا ایک عام سی بات ہے اور محض اس بناء پر ولی کو گجراتی کہہ دینا بالکل جزوی حیثیت رکھتا ہے اور ولی کے وطنیت کے باب میں غیر متعلق سی چیز ہے۔

ان مکاتیب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت گجرات کے علمی اور ادبی حلقوں میں ایک تجسّس بدستور جاری تھا اور اس وقت کے باذوق حضرات بھی ولی کے گجراتی یا دکنی ہونے کے ناقابلِ تردید شواہد کے خواہاں تھے۔ لیکن قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۱۹۴۵ء کے بعد آشوبِ چشم سے بہت پریشان تھے اور دیگر جسمانی امراض کا بھی شکار ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں یعنی اپنے مادرِ وطن (گجرات۔کاٹھیاواڑ۔ جوناگڑھ) میں تقسیمِ ہند کے بعد پیدا ہونے والے مخدوش حالات سے مجبور ہوکر کاٹھیا واڑ کے بندر ''دیو'' سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے اور اپنے ساتھ ممکن حد تک کتابوں کا ذخیرہ بھی لیتے گئے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد رہائش اور روزگار کے مسائل نے انھیں خوب پریشان کیا اور اپنی عمر کے آخری حصّے تک وہ اسی جدّ وجہد میں لگے رہے۔ بالآخر ۱۹۵۵ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور اس طرح ان کی وفات کے ساتھ ہی ولی کے متعلق ان کی تحقیق کا دفتر بھی بند ہوگیا۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے وہ تمام مقالات جو انھوں نے ولی سے متعلق سُپردِ قلم کئے تھے وہ تمام مقالات رسالہ ''منصف'' علیگڑھ میں شائع ہوئے تھے چونکہ ولی کی شاعری اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بعض اعتراضات شمال اور دکن کے علماء اور محققین کی جانب سے وقتاً فوقتاً اُٹھتے رہے تھے۔ ولی کے متعلق کچھ مقالات ایسے بھی تھے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے ۱۹۳۹ء میں بمبئی کے اسماعیل یوسف کالج سے پروفیسر سیّد نجیف اشرف حب ندوی صاحب کی نگرانی میں اپنی پی۔ایچ۔ڈی (Ph.d) کا مقالہ ''سخنورانِ گجرات'' کے عنوان سے نامزد کیا تھا۔ لیکن بعض پریشانیوں کے باعث موصوف کا یہ مقالہ ۱۹۴۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اسی سال یونیورسٹی کو پیش کیا گیا اور اسی طرح موصوف کو ۱۹۴۸ء میں اُن کے تحقیقی مقالے ''سخنورانِ گجرات'' کے لئے انھیں پی ایچ۔ڈی (Ph.d) کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اُسی سال ۱۹۴۷ء میں بمبئی میں ''انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں اس اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض ومقاصد اور لائحہ عمل کا مختصر طور پر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ گجرات کے متعلق قدیم اردو کے کارنامے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہوں انہیں مضامین کے ذریعے روشناس کرایا جائے نیز اس اردو ریسرچ انسٹی

ٹیوٹ کا سب سے اہم مقصد تلاش وتحقیق تھا اور تصنیف وتالیف اس انسٹی ٹیوٹ کے لائحہ عمل کا ایک اہم جزو تھا۔

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی اسی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ ڈائیریکٹر تھے، چونکہ اس انسٹی ٹیوٹ کا مقصد ہی تصنیف وتالیف تھا لہذا اس کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے قاضی اختر جوناگڑھی کے بعض شائع شدہ مقالات اور غیر شائع شدہ مقالات سے استفادہ کرتے ہوئے ''ولی گجراتی'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا، جس میں ولی کی شاعری، وطنیت، زبان اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی یہ پہلی کوشش تھی اور تصنیف وتالیف کے سلسلے کی پہلی کڑی بھی۔ یوں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی کی تخلیق کردہ ''ولی گجراتی'' کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ۱۹۵۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا کہ قاضی اختر جوناگڑھی نے ولی پر جو مقالات لکھے تھے انہی مقالات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کتاب ''ولی گجراتی'' تصنیف ہوئی تھی چنانچہ اس کتاب میں ولی کی وطنیت اور نام وغیرہ کی بحث میں جوں کا توں اعادہ کیا گیا ہے۔ اور ولی کی وطنیت اور نام کی جو بحث قاضی اختر جوناگڑھی نے چھیڑی تھی وہی بحث ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے اپنے الفاظ میں کی ہے گویا موضوع وہی ہے لیکن صرف انداز اور الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔

یہاں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی کی تخلیق کردہ تصنیف ''ولی گجراتی'' میں ولی کے ''گجراتی'' ہونے کے بیان میں جن دلائل کو پیش کیا گیا اس کا سرسری جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان باتوں کی تصدیق ہوسکے جن کے حوالے گذشتہ سطور میں آئے ہیں۔

(۱) حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے ہونا

اس سلسلے میں مدنی صاحب کا بیان جس بنیاد پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ جس ''تمسک نامہ'' کا انھوں نے ذکر کیا ہے، اس میں ولی خاندان کے دیگر افراد کے دستخط ثبت ہیں اور حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے ایک خاندان محضر پر ولی کے مہر کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن وہ تمام چیزیں ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئیں بلکہ صرف تحریری شکل میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُس مہر پر یہ درج ہے۔۔۔

''خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ بن شریف محمد علوی'' ۵۷

صرف تحریری شکل میں کوئی بات لکھ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا، اور اگر اس طرح کی واقعی کوئی چیز تھی تو اُسے کیوں کر منظرِ عام پر نہیں لایا گیا؟ یا جس تمسک نامہ کا ذکر ہے تو ایسی اہم اور نادر دستاویز آخر کہاں ہے؟ اور اگر ہے تو اُسے سامنے لایا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ یہ وؔلی جس کا نام اس دستاویز میں شامل ہے یہ ہمارے وؔلی شاعر ہی ہیں۔ لیکن انھوں نے نہ تو اس اہم دستاویز کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی اُسے منظرِ عام پر پیش کر کے اپنی تحقیق کی پختگی کا جواز پیش کیا ہے۔ جس سے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ ہمارے شاعر وؔلی ہی ہیں۔ اس سلسلے میں وضاحت کے لئے اردو وفارسی کے عالم پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے اپنے ایک خط میں بھی قاضی اختر جوناگڑھی سے وضاحت طلب کی تھیں لیکن وہ بھی یہ ثابت کرنے سے قاصر رہے تھے۔

(۲) احمد آباد میں اپنے خاندانی مدرسہ میں تعلیم وتربیت

سلطنتِ مغلیہ کے پورے دور میں گجرات کی علمی شہرت ہمیشہ قائم رہی اور مسلمان بادشاہوں کی علمی دلچسپیوں سے کئی مدارس وجود میں آئے۔ گجرات کے شہر احمد آباد میں علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کا مدرسہ قابلِ ذکر ہے اس مدرسہ میں حضرت موصوف نے تقریباً پینسٹھ (۶۵) سال اپنی خدمات انجام دیں۔ یہ مدرسہ اپنی ابتداء سے ہی ہندوستان کے گوشے گوشے میں مشہور تھا اور علم کے تشنہ لوگ یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ حضرت وؔلی نے بھی اسی مدرسے میں تعلیم پائی اور اُن کے فن کے جوہروں کو یہاں کی تعلیمی فضاء میں نکھرنے کا خوب موقع ملا۔

مدرسہ شاہ وجیہ الدین میں طلباء کے لئے دار الاقامت کا بھی انتظام۔ تھا جہاں غریب ہونہار طلبا کی مفت تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ ان کے طعام وقیام کے لئے وظائف مقرر ہوتے تھے اور ہر طرح کی تعلیم دی جاتی تھی جس وجہ سے دوردراز سے لوگ اپنے بچوں کو اس مدرسے میں تعلیم کی غرض سے بھیجا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں تعلیم حاصل کرنے کے تین بڑے ذرائع ہوا کرتے تھے:

(۱) مکتب اور مدرسے (۲) مساجد اور خانقاہیں (۳) نجی طور پر گھروں میں

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کچھ دیر کے لئے یہ فرض کرلیا جائے کہ وؔلی کا تعلق حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے تھا تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک ایسی بلند پایہ شخصیت کے خاندانی چشم وچراغ کو اقامتی مدرسوں میں تعلیم کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ جب کہ ایسے معزز خاندان کے افراد بہ جائے خود

اپنے بچّوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا کرتے تھے اور نجی طور پر ہی گھر کے کسی ایک حصے کو مخصوص کردیا جاتا تھا جہاں اساتذہ گھر آکر ہی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان اس معاملے میں بڑا محتاط ہوتا تھا اور وہ اس طرح کے اقامتی مدرسوں میں جہاں اجتماعی طور پر تعلیم دی جاتی تھی پسند نہیں کیا کرتے تھے، اور وہ اس طرح کے اقامتی مدرسوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا باعثِ شرم سمجھتے تھے اسی سبب سے نجی طور پر وہ اپنی نگرانی میں بچوں کو تعلیم دلواتے تھے اور اُسے اپنی حیثیت اور مرتبہ کے لحاظ سے فخریہ تصوّر کرتے تھے۔

گویا اقامتی مدارس اُن متوسط، غریب، مفلوک الحال طلباء کے لئے ہوا کرتے تھے جن کی مالی استطاعت کمزور ہوتی تھی اور ایسے والدین ہی اس طرح کے مدارس میں اپنے بچوں کو تعلیم کی خاطر بھیجا کرتے تھے تو بھلا یہ کیسے مان لیا جائے کہ ولّی کا تعلق حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے تھا؟ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ولّی نے یہاں احمد آباد میں موصوف کے مدرسہ میں اپنی تعلیم مکمل کی اور یہاں کے اساتذہ نے اُن کی ذہنی تربیت میں بھرپور تعاون کیا۔

(۳) گجراتی پیر طریقت اور استاد

ظاہر ہے کہ جن اساتذہ نے ولّی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ وپیراستہ، علم وآگہی سے بہرہ ور کیا ہو، خونِ جگر صرف کیا ہو اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مدد دی ہو اور بڑی ہی محبت اور شفقت سے پیش آئے ہوں تو ایسے اساتذہ اور شاگردوں کے درمیان بڑے ہی محبت آمیز تعلقات ہوتے ہیں۔ اساتذہ اور تلامذہ کے مابین محبت آمیز تعلقات ہو ہی جاتے ہیں۔ جہاں استاذ وشاگرد ہمہ وقت ساتھ رہتے ہوں وہاں اس طرح کا تعلق قائم ہوجانا فطری بات ہے وہ اکثر ایک ساتھ مِل کر رہتے، جس سے ان کے درمیان ایک مستقل ذہنی رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور اگر وہ ایک ساتھ نہ بھی رہتے ہوں پھر بھی ان کا اپنے استادوں سے برابر تعلق قائم رہتا ہے۔ کیوں کہ ان اساتذہ نے ہی اُسے ہر طرح کی اخلاقی اور مادّی ہر طرح کی دولت سے مالامال کر کے اپنا فرض پورا کیا تھا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جب وہ (ولّی) اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنائے اور اپنی بات شعر کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے معزز اساتذہ کا ذکر نہ کرے؟ یہ ولّی کی اپنے احباب، اساتذہ سے والہانہ محبت اور عقیدت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے اور جسے کسی طرح بھی اس کی وطنیت کی حمایت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) گجراتی احباب وتلامذہ

کلامِ وؔلی میں بعض گجراتی مقامات اور گجراتی لباس وغیرہ کا ذکر :-

گجراتی الفاظ اور محاورات کا استعمال دیوانِ وؔلی میں :-

وؔلی نے چونکہ اپنی عمرِ عزیز کا ایک طویل حصّہ احمد آباد (گجرات) میں گزارا تھا لہٰذا اپنے اس طویل قیام کے دوران یہاں کے خوبصورت مقامات، قدرتی مناظر سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے، اور جب اپنی تعلیم کے دوران بہت سے طلباء اُن کے حلقۂ احباب میں شامل رہے ہوں تو دوستانہ تعلقات کا قائم ہونا بھی ایک عام سی بات ہے۔ وؔلی یہاں کے موسموں، آب وہوا سے بھی ضرور محظوظ ہوئے ہوں گے۔ یہاں کی موجودہ زبان کے اثرات بھی اُن پر ضرور مرتّب ہوئے ہوں گے۔ جس کا لازمی نتیجہ تو یہی ہوگا کہ جہاں اُنھوں نے ایک طویل عرصے تک بودوباش اختیار کر رکھی تھی وہاں کی فضاء، ماحول اور وہاں کے مقامات، وہاں کے دوست واحباب کا کہیں نہ کہیں ذکر وؔلی کے کلام میں پایا جانا اُن کی وطنیت ثابت کرنے کے معاملے میں جزوی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ثابت نہیں کرتا کہ وؔلی کا وطن احمد آباد ہی تھا۔

(۵) وطن کی محبت میں فراقِ گجرات کا قطعہ اور مثنوی ''در تعریفِ سورت''

اس بات پر سبھی محقق اور علمائے ادب متفق ہیں کہ وؔلی حصولِ تعلیم کی خاطر حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھے اور اپنی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک وہ یہیں متوطن تھے۔ اس طویل عرصے میں احمد آباد اور گجرات سے وؔلی کا والہانہ لگاؤ ایک فطری بات ہے۔ کیوں کہ یہ انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے وہاں کے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ غرض گجرات میں قیام پذیر ہونے کے اسباب خود وؔلی نے اپنے اشعار میں بیان کردیے ہیں۔ احمد آباد کی چہل پہل، وہاں کی دلچسپ صحبتیں، حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ اور مدرسہ کی پُرسکون وحیات پرور فضاء، دوسری طرف اورنگ آباد کی مرہٹوں کے ہاتھوں ویرانی اور وہاں کا خشک وہولناک فوجی ماحول، گجرات کا حسنِ ملیح اور سب سے بڑھ کر سیّد ابوالمعالی کی رفاقت یہ سب چیزیں تھیں، جنھوں نے وؔلی کو آخرکار وہیں رہنے پر مجبور کردیا۔ یہی وہ افتادِ طبع تھی جو وؔلی کو

اورنگ آباد میں گجرات کی یاد تڑپا رہی تھی۔ جب وہ عنوانِ شباب میں تکملِ تعلیم کے لئے اورنگ آباد سے نکل کر احمد آباد پہنچے ہوں گے تو انھیں کیا خبر تھی کہ گجرات کا حسنِ رنگین انھیں ہمیشہ کے لئے بے تاب اور مضطرب کردے گا۔ احمد آباد کی پُر لطف صحبتوں نے ان کے درد آشنا دل میں ایک ایسی تڑپ پیدا کردی تھی کہ جب تکمیلِ تعلیم کے بعد اورنگ آباد واپس ہوئے تو گجرات کی دلفریبوں نے انھیں بے چین کردیا۔ انھیں اپنی زندگی کے اُن حسین لمحوں کی یادیں ستانے لگیں اور اس ہجر کی بے چینی اور بے قراری الفاظِ شعر کا جامہ پہن کر ''درفراقِ گجرات'' کوشکل میں منظرِ عام پر آئی۔ اور اس طرح ولؔی نے گجرات اور یہاں کے متعلق اپنی والہانہ محبت میں ایسے اشعار تخلیق کئے جو اردو ادب میں یادگار بن گئے ولؔی کا قطعہ ''قطعہ درفراقِ گجرات'' مندرجہ ذیل ہے۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل — بے تاب ہے سنے منیں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں — شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز میں — جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل

اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا — آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

میرے سنے میں آکے چمن دیکھ عشق کا — ہے جوش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل

حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی — دیکھا ہے مجھ شکست سوں صبح بہار دل

ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مراگداز — عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں — ہر دم میں بے قرار ہے مثال شرار دل

سب عاشقاں حضور، اچھے تا کہ سرخ رو — اپنا اپس کے خوں کیا ہے نگار دل

حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکست سوں — پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل

مجمر نمن ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں — اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں — اس مے کدے سوں اُٹھ کے چلا سُدھ بسار دل

لیکن ہزار شکر ولؔی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

ولؔی نے ایک عالمِ اضطراب میں یہ مثنوی ''درفراقِ گجرات'' لکھی تھی اس نظم کے علاوہ انھوں نے اپنے اس سفر کی یاد میں ایک دلچسپ مثنوی بھی لکھی تھی جس میں ''سورت'' کی سیر وسیاحت کا ذکر کیا ہے یہ بہت

طویل مثنوی ہے۔ یہاں صرف چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

عجب شہراں میں ہے پر نور یک شہر ۔۔۔ بلاشک وو ہے جگ میں مقصد دہر

اَہے مشہور اُس کا نام سورت ۔۔۔ کہ جاوے جس کے دیکھے سوں کدورت

جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور ۔۔۔ اچھو اس نور سوں ہر چشم بددور

شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب ۔۔۔ ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب

سُرج سن آب اس کی جگ میں کانپا ۔۔۔ سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا

کنارے اس کے اک دریائے تپتی ۔۔۔ کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے پٹتی

کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل ۔۔۔ ہر اک گل کے نزک وہاں پر ہے سنبل

جو کُئی دیکھا ہے اُس کا باغ رخسار ۔۔۔ ہوا اک دید میں وہ محو دیدار

کہاں ہے ساقیِ اخلاص انگیز ؟ ۔۔۔ محبت کی کرے مے مجھ اُپر ریز !

صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ ۔۔۔ کروں اس دُردِ مے کوں مرہم داغ

بھری ہے سیرت وصورت سوں سورت ۔۔۔ ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت

ہر اک کے لب ہیں سوجیوں یاقوت انمول ۔۔۔ کرے وو بات جب میٹھے لباں کھول

وہ باتاں نہیں سراپا ہے مٹھاقند ۔۔۔ کہ جن باتاں اُپر ہے نیشکر بند

پڑا شیریں بچن سن کے اُن بس جو ۔۔۔ پھنسا اس شہد میں جا کر مگس ہو

ہوا اُن کوں نکلنا کام دشوار

رہا وو آخری دم لگ گرفتار

گویا اس آخری شعر میں وؔلی نے شیرین زبان ملیحاں گجرات کے عشق میں گرفتار رہنے کی پیش گوئی کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب دوبارہ وہ اپنے وطن سے نکلے تو آخری دم تک گجرات ہی میں گرفتار رہے۔

''مثنوی در تعریفِ سورت'' اپنی موجودہ شکل میں ایک اچھی نظم کہی جاسکتی ہے۔ اِس مثنوی کی ابتداء شہرِ سورت کی تعریف سے ہوتی ہے۔ یہ مثنوی اٹھارہویں (۱۸) صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کی ہوسکتی ہے، کیوں کہ وؔلی کے دہلی آنے کا زمانہ ۱۷۰۰ء قرار دیا جاتا ہے، ممکن ہے یہ مثنوی اِس سے پہلے کی ہو۔ لیکن اِس کا تعین موجودہ معلومات کی روشنی میں ممکن نہیں ہے۔ بہر حال اِس مثنوی سے ''شہرِ سورت'' کے خوش حال ہونے

کا اندازہ ہوتا ہے۔

ولی کی مثنوی سے بھی یہی مطالب نکلتے ہیں کہ ''سورت'' کی شہری زندگی اپنی ہماہمی اور رنگینی کے سبب صاحبانِ ذوق کے لئے اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتی تھی۔ اور حُسن کے نظارے ہر طرف عام تھے، لہٰذا ولی پکار اُٹھے

ے ختم ہے امرداں اوپر صفائی ولے ہے بیشتر حُسن نسائی

ے نظر بھر کر دِکھوں ہر گلبدن کوں کے ہے پردے سوں بے پروا اُنن کوں

ولی چوں کہ مزاجی طور پر عاشق واقع ہوئے تھے، لہٰذا ''سورت'' شہر کی نسائی اور قدرتی ہر طرح کی خوبصورتی کی انھوں نے تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

اسی طرح ولی نے گجرات سے متعلق اپنی تمام بے تابیوں، اور جذبہ ہائے وابستگی کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور ''در فراق گجرات'' قطعہ کے اوّل سے تین اشعار میں اُنھوں نے اپنی کیفیات کا ذکر کیا ہے اور شعر نمبر ۴ میں لفظ ''سیر'' سے انھوں نے واضح کیا ہے کہ وہ بطورِ سیر وسیاحت ہی احمد آباد (گجرات) گئے تھے۔ لیکن سیّد ظہیر الدین مدنی نے لفظ ''سیر'' سے یہ معنی اخذ کیا ہے کہ وہ (ولی) گجرات سے باہر سیر وتفریح کے لئے گئے تھے۔ گویا ولی کو گجرات ثابت کرنے میں انھوں نے لفظ ''سیر'' کو بھی اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔ گویا ولی کو گجراتی ثابت کرنے میں انھوں نے ایسا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ولی کو ہر ممکن طریقے سے گجراتی ثابت کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ اسی ولی نے اس قطعہ گجرات میں ان خواہشات کا اظہار بھی کیا ہے۔

ع ''پھر اس کے دیکھنے کا ہوا ہے امید وار دل''

اس مصرع سے صاف واضح ہے کہ ولی نے ایک مرتبہ تو احمد آباد (گجرات) دیکھا ہے لیکن اس مقامِ ہوش رُبا کو پُر لُطف رنگینیوں سے اُن کا دل ابھی سیراب نہیں ہوا ہے لہذا وہ اسے دوبارہ دیکھنے کے آرزو مند ہیں اور بھلا اگر ایسا نہیں ہوتا تو آخر ولی ایسا کہتے ہی کیوں کہ میں گجرات کو دیکھنے کا پھر امیدوار ہوں۔ کوئی بھی شاعر اپنے جائے حقیقی کے متعلق اس طرح کے اشعار بھلا کیوں لکھے گا؟ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ گجرات سے واپسی پر ولی نے اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی اِن اشعار میں کی ہے۔ لیکن مدنی صاحب نے اِن اشعار سے ایسے مطالب نکالے ہیں جو ولی کو گجراتی ثابت کرنے میں مددگار ہیں لیکن وہ باتیں

جو ولیؔ کو گجراتی ثابت کرنے میں مانع اور دکنی ثابت کرنے میں معاون ہیں انھیں نظر انداز کر گئے ہیں۔

یہاں اس موقع پر ایک اور واقعہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اردو کے مایۂ ناز شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے اپنی پینشن کی بحالی میں کئی مرتبہ ''کلکتہ'' کا سفر کیا اور کلکتہ کے متعلق اپنے آمد و رفت، وہاں کے قیام، مناظر، حسن و دلکشی پر، اس کی رعنائیوں پر اپنے احساسات اور جذبات کی ترجمانی میں ایک غزل تخلیق کی تو اس کا مطلب یہ ہرگز بھی نہیں ہوا کہ غالبؔ کلکتہ کے ہوگئے یا کلکتے کا کوئی محقق یا مورّخ یا نثر نگار غالبؔ کو ''کلکتوی'' ثابت کرنے کی جراءت کرے۔ کلکتہ کے متعلق غالبؔ کے اشعار مندرجۂ ذیل ہیں۔ حالاں کہ کلکتے سے متعلق غالبؔ کے یہ اشعار انھیں کلکتوی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ تو کیا اس کے معنی لے لئے جائیں کہ غالبؔ کا وطن کلکتہ ہے ایسی صورت میں تو تذکرہ نویس غالبؔ کو بجائے دہلوی کے کلکتوی بہ ثبوت لکھ سکتا ہے لیکن بہر حال یہ دلیل معتبر نہیں، ولیؔ سے متعلق بھی یہی باتیں اہم بن جاتی ہیں۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مُطرا کہ، ہے غضب!
وہ نازنین بُتاں خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزمادہ اُن کی نگاہیں ہیں کہ، حَف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ وشیرین کہ، واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ، ہائے ہائے

اب ان اشعار سے یہ تو ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ''کلکتہ'' کے ہوگئے ہیں۔ بس کچھ اسی طرح کا معاملہ ولیؔ کے ساتھ بھی ہوا۔ چونکہ ولیؔ حصولِ تعلیم کی خاطر احمدآباد تشریف لائے اور واپس ہوگئے۔ لیکن ولیؔ کے احمدآباد میں قیام کرنے کے بعد اور ان کے انتقال کے تین سو (۳۰۰) سال بعد بھی کسی کو یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ ولیؔ گجرات کے باشندہ تھے۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا کہ یہ تنازعہ سیّد حسینی پیر علویؒ اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی پیداوار ہے۔ چونکہ سید حسینی پیر علویؒ علاّمہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے

خاندان کے چشم و چراغ ہیں لہذا وہ اس تنازعہ میں خود کی ذات گرامی کو ملوث نہیں کرنا چاہتے تھے، لہٰذا قاضی احمدمیاں اختر جوناگڑھی کو انھوں نے اس کام پر معمور کردیا اور انھیں روشنی دیتے رہے۔ اسی وجہ سے سیّد ظہیر الدین مدنؔی کی کتاب ''ولی گجراتی'' قاضی احمدمیاں اختر جوناگڑھی کی ولؔی کے متعلق جو تحقیقی مقالات سپردِ قلم کیئے یہ اُسی کا چربہ ہے جس میں موصوف ولؔی کو گجراتی ثابت کرنے میں اپنے خام خیالات اور ناکام کوششوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور صرف وہی معنی اور مطالب کی نشاندہی کرتے ہیں جو ان کے حق میں مفید ثابت ہوں۔ اب دیکھئے غالبؔ کلکتہ گئے اور کلکتہ پر اپنی غزل لکھی تو کیا سیّد ظہیر الدین مدنؔی غالبؔ کو ''کلکتوی'' ثابت کریں گیا ور یہ کہیں گے کہ غالبؔ آگرہ اور دہلی سفر کو گئے تھے انھیں اپنے آبائی وطن کلکتہ کی محبت ان پر اس قدر غالب رہی کہ وہ کلکتہ کا ذکر دہلی اور آگرہ میں بھی کیئے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی تعلق سے یہاں ایک اور واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا دور حاضر میں لکھنؤ کے مشہور و معتبر شاعر سالکؔ لکھنوی ان دنوں بنگال میں مقیم ہیں۔ موصوف کی ادبی خدمات کے عوض حکومت بنگال نے انھیں اردو اکادمی کا صدر نام زد کیا ہے لیکن اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ انھیں بنگال کا تصوّر کیا جائے۔ NRI کی مثال بھی اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے اور میر حسنؔ گو لکھنؤ سے متعلق ہوگئے تھے لیکن دہلوی آج بھی کہلاتے ہیں۔ میرؔ اکبرآباد میں پیدا ہوئے، دہلی میں پروان چڑھے اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے لیکن وہ نہ دہلوی ہوں گے نہ لکھنوی۔ کتنی مثالیں کہاں کہاں سے دی جائیں۔ ولؔی تو چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ۔۔۔

ولؔی ایران و توران میں ہے مشہور
اگر چہ شاعرِ مُلکِ دکن ہے

ولؔی جیسا شاعر جسے خود اپنی عظمت بلندی اور برتری کا احساس ہے اور وہ خود اپنی زبانی اپنے شعر میں اپنے دکنی ہونے کی شہادت پیش کررہے ہیں تو پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی کہ اُن کی ''دکنی'' وطنیت کو تسلیم نہ کیا جائے؟ اسی طرح ''دکن'' لفظ کے استعمال کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

دکھن میں تیرے شعر سن شوق ہوئے تیرے ولؔی
جس کے لکیا ہے دل کے تئیں خوش شعر تجھ دیوان کا

سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے اس شعر کا مطلب یہ اخذ کیا ہے کہ۔۔۔

''اے ولؔی اہل دکن تیرے اشعار کے مشتاق ہیں اور انھیں تیرے دیوان کے مطالعہ

کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ اگر ولی کا وطن اورنگ آباد (دکن) ہوتا تو اس طرح فخریہ اظہار نہ کرتا۔ ۵۸

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ ''دکن'' سے مراد ملک کا کون سا حصہ ہے چونکہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگاروں کے بیانات کے ماخذ اکثر قدیم تذکرے ہی ہیں۔ کیوں کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ولی کو ''گجراتی'' لکھا ہے اور بعض نے ''دکنی'' تو آخر اس غلط فہمی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اس لئے اس بات کی توضیح کے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ لفظ ''دکن'' کا کسی خطۂ خاک پر اطلاق ہوتا ہے۔

مختلف زمانوں میں دکن کے معنی مختلف رہے ہیں۔ کیوں کہ کبھی نربدہ کے جنوب کے پورے علاقے کو دکن کہہ دیا جاتا تھا، کبھی اس میں مراٹھی علاقوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اکبر نے مالوہ، برار، خاندیش اور گجرات کو ملا کر دکن کا صوبہ بنایا اور بعد میں احمد نگر بھی اس میں شامل ہوگیا۔ ان میں سے مالوہ راجستھان کا، گجرات گجراتی کا اور برار کا خاندیش اور احمد نگر مراٹھی علاقے ہیں۔ اس عہد کے دکن میں کوئی دراوڑی علاقہ نہیں تھا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں مالوہ اور گجرات کو چھوڑ کر برار، خاندیش اور احمد نگر کے مراٹھی علاقے دکن میں شامل رہے اور اسی طرح اورنگ زیب کے زمانے (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) میں گولکنڈہ اور بیجاپور بھی مغلوں کے زیر نگیں آگئے، اس طرح اورنگ زیب نے چھ (۶) صوبوں کو ملا کر دکن بنایا تھا جو یہ تھے:

(۱) برار (۲) خاندیش (۳) اورنگ آباد

(۴) حیدرآباد (۵) بیدر (۶) بیجاپور

اسی طرح علاؤ الدین خلجی کی فتح گجرات کے بعد یہاں کی نظامت مسلم ناظموں نے ذریعے عمل میں آئی اس وقت گجرات میں بڑی ابتری کا عالم تھا کیوں کہ نہر والا (پٹن) کے ہندو راجہ خود کے اقتدار والے علاقوں پر منظم طریقے سے حکومت کرنے سے قاصر تھے اور سرحدی علاقوں پر ان کا قبضہ باقی نہیں رہا تھا۔ دار السلطنت سے دور افتادہ ٹھاکر اور زمیندار خود مختار ہوگئے تھے۔ گجرات کے جنگلوں، پہاڑوں اور سرحدی علاقوں میں بسنے والے سرکشی پر آمادہ تھے۔ اس وقت آبو کی شمالی پہاڑیاں اور جالور کے مغرب سے لے کر بمبئی تک اور مالوہ اور خاندیش کے پہاڑوں کی صفحوں سے لے کر سرحد کے مغربی کنارے تک گجرات کا علاقہ شمار کیا جاتا تھا۔ ۵۹

اور اس طرح گجرات خلجی سلاطین کے عہد کے بعد تغلق سلطانوں کے زیرِ اقتدار آیا اس وقت اس کی حکومت جنوب میں تھانے تک، شمال میں دھولکا، دھندھوکا سے لے کر سمندری سرحدی علاقے سومناتھ تک اور اس

کے بعد شروہی کی حد سے نیچے میواڑ، خاندیش اور ناسک علاقے کی سرحد تک اور مشرق میں جھالاواڑ اور شوراشٹر سے اس کے تابع تھے جب کہ کچھ اور شوراشٹر کا زیادہ تر حصّہ خلجی اور تغلق سلطانوں کی حکومت سے باہر تھا۔۶۰

ان بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ولی کی پیدائش سے دو تین صدیاں قبل اور ولی کے زمانے میں بھی سیاسی حکمتِ علمی اور سلاطین کے فاتح علاقوں پر منظّم طریقے سے حکومت کرنے کی خاطر مقبوضہ علاقوں میں توسیع اور کمی ہوتی رہی ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا بعض علاقوں کو چھوڑ دیا گیا اور بعض کو شامل کر لیا گیا، اسی طرح صوبائی حد بندیوں میں علاقوں میں کمی بیشی ہی تذکرہ نگاروں کے متفرق بیان کی وجہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ جن علاقوں کو ایک صوبے میں شامل کیا گیا اور ایک طویل عرصے تک وہ علاقہ اس صوبے کا ایک حصّہ رہا ہو تو طویل مدت تک اس علاقے یا نام کو اسی صوبے کے ساتھ جوڑا جانا ایک عام بات ہے کیوں کہ اس کا چلن اس قدر عام ہو جاتا ہے اور عوام کے ذہن پر اس کے نقوش اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ اتنی آسانی سے یا مختصر سے عرصے میں دور نہیں ہوتے اور اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تذکرہ نگاروں کے مختلف بیان کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ پورا خطّہ جس میں دکن کے علاقوں کو شامل کیا گیا گذشتہ تین چار صدیوں میں اس قدر خلط ملط رہے ہے کہ کبھی کوئی علاقہ کسی صوبہ کا حصّہ رہا اور کبھی کسی صوبے کا، ایسی مخلوط صورت حال میں بھلا اس سے بہتر کیا صورتِ حال ہوسکتی ہے کہ ولی نے خود اپنی زبانی اپنے وطنِ حقیقی کو عیاں کر دیا۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگر چہ شاعر ملکِ دکن ہے

اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد انھوں نے جن چھ (۶) علاقوں کو ملا کر دکن کا صوبہ بنایا اس میں اورنگ زیب کا بسایا ہوا اورنگ آباد بھی شامل ہے جو ایک پُر رونق شہر ہے جسے بعض محققین نے ولی کا وطن قرار دیا ہے۔ حالانکہ ولی کے تمام کلام میں اورنگ آباد کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملتا، جب کہ ولی خود کو ''دکنی'' کہہ رہے ہیں اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ خصوصی اورنگ آباد کے نہ سہی لیکن دکن میں شامل دیگر کسی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں اور اورنگ زیب کے اس شہر اورنگ آباد کو بسانے پر وہاں قیام کیا ہو۔ چونکہ ولی ایک حسّاس دل رکھتے تھے اور اپنے وطن کے متعلق غلط بیانی سے کام لیں یہ ممکن نہیں اس لئے اُن کی ''دکنی'' وطنیت ہی ان کی اصلی اور حقیقی جائے پیدائش ہے۔

ولی کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اُن کی وطنیت کی شہادت میں اس طرح کی دیگر اور بھی

مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ گجرات سے اپنی والہانہ محبت اور اس انتہائی الفت کے باوجود ولی اپنے کلام میں اپنے وطن کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکے۔اور ممکن ہے کہ یہ بھی غیر ارادی طور پر ہو ان کے مندرجۂ ذیل اشعار دیکھئے جس میں انھوں نے خود کو دکنی کہا ہے۔

یو مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس
ولی پروانگی کرتا تری ملک دکھن بھیتر

دکھنی زبان میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولیا ہے کوئی اک شعر خوشتر زیں نمط

ایک خاص بات اور کہ ولی نے بعض دکنی شاعروں کا بھی اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیں کہ وہ گجراتی الاصل تھے تو پھر دکن کے شاعروں کے ساتھ ساتھ گجرات کے قدیم مشہور و معروف اُردو شعراء مثلاً شیخ بہاؤ الدین باجن، خوب محمد چشتی، شاہ علی جیو گام دھنی اور امین گجراتی میں سے کسی کا ذکر ضرور کرتے۔ ولی نے جن دکنی شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں ملاّ خیالی، حسن شوقی، فراقی، آزاد، رنگین اور اشرف وغیرہ، اہمیت کے حامل ہیں۔ جب کہ وہیں گجرات کے مقبول اور بلند پایہ شعراء کا ذکر ولی کے یہاں مفقود ہے۔

سیّد ظہیر الدین مدنی نے ولی کو دکنی ثابت کرنے کی حمایت میں لفظ دکن پر جن علاقوں کا اطلاق ہوتا اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

''قدما نے لفظ دکن کا اطلاق جس حصّہ ملک پر کیا ہے وہ محض اورنگ آباد یا بیجاپور نہیں بلکہ دریائے نربدا کے اس کنارے سے مع سلسلہ کوہ ست پڑا، راس کماری تک کی سرزمین اس میں شامل ہے، اس خطّہ میں گجرات و خاندیش بھی شامل ہیں۔''[۶۱]

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے ولی کو گجراتی ثابت کرنے میں جن دلائل کا سہارا لیا ہے اس کا قوی تاریخی ثبوت نہیں ملتا نیز ''تذکرۂ شعرائے گجرات'' کے مصنف نے اور بعض گجراتی علماء نے ولی کو ''گجراتی'' قرار دینے میں ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ولی کے زمانے میں ممکن ہے کہ گجرات اور دکن کو جدا نہیں سمجھا جاتا ہو۔ چونکہ یہ دونوں خطّے شمالی ہندوستان کے جانب جنوب واقع ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ اہلِ شمال جو سلطنت کا مرکز اور حکمران تھے وہ گجرات اور دکن میں تمیز نہ کرتے ہوں اور سیاسی علاقائی حدبندیوں کے سبب سبھی کو دکنی ہی کہتے ہوں۔ راقم السطور کے نزدیک یہ محض ایک قیاس آرائی ہے اور ولی کے زمانے میں اس

طرح کی کوئی غلط فہمی نہیں تھی اور نہ اس کے تاریخی اور جغرافیائی ثبوت فراہم ہوئے ہیں۔

چونکہ ولی ہی کی زبانی یہ شہادت پیش کردی گئی ہے کہ وہ دکنی تھے۔ لہذا مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اس پر اگر کوئی شخص پھر بھی اُن کے ''گجراتی'' ہونے کی حمایت میں جزوی اور بے جا حقائق کا سہارا لے تو بڑی ہی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی جب ''انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کے ڈائیریکٹر تھے اس سے قبل موصوف نے ولی پر اپنا مقالہ تیّار کیا تھا جو دراصل قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے ولی پر تحقیقی مقالات کا چربہ تھا موصوف کا اُسے کتابی شکل دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ اب انجمنِ اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائیریکٹر تھے اور اس انسٹی ٹیوٹ کا مقصد ہی تصنیف وتالیف تھا لہذا ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے اپنے اس تیار کردہ مقالے کو اپنے استاد اور PH.d. کے نگراں بمبئی کے اسماعیل یوسف کالج کے پروفیسر سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب کو دکھایا، موصوف نے اس مقالے میں کچھ ردّ وبدل کے ساتھ اُسے نیا رنگ وروپ دے دیا۔ جس میں ولی کے گجراتی ہونے کی حمایت میں تمام زور صرف کیا گیا تھا۔ جس کا انکشاف ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی کی اس گفتگو سے ہوا جو انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو وفارسی کے صدر پروفیسر جناب ''امیر احمد عارفی'' سے کی تھی۔ اس گفتگو کے متعلق اورنگ آباد کے ایک محقق جناب مرزا آغا بیگ صاحب نے ولی پر اپنی تحقیقی تصنیف ''ولی اورنگ آبادی'' کے پیش لفظ میں اس گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ جس میں مرزا آغا بیگ صاحب نے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی اور پروفیسر امیر احمد عارفی کی بمقام ''سورت'' (گجرات) ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ۔۔۔

> ''میں نے ولی کا ذکر چھیڑا کہ آپ نے کن بنیادوں پر ولی کو گجراتی ثابت کیا ہے۔ آپ نے جتنے بھی دلائل دیئے وہ مجھے کمزور لگے اور کلامِ ولی سے اس کا گجراتی نہیں بلکہ دکنی ہونا ثابت ہوتا ہے، ہر دور میں ایک تخلّص کے کئی شاعر ہوئے ہیں جیسے وجیہ الدین ولی وغیرہ۔ اس پر وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ ''میاں یہ ساری بحث میں نے اپنے استاد نجیف اشرف ندوی کی ایماء پر کی ہے، انھوں نے فرمایا تھا کہ ''زور صاحب نے ۱۹۳۷ء میں ولی کا جشن منا کر اس کو دکنی ثابت کردیا ہے۔ اور ولی کو گجرات والوں سے چھین لینے کی یہ ایک کوشش ہے۔ اس لئے تم شواہد کی بنیاد پر ولی کو گجراتی ثابت کرو' اور کہا کہ ''یہ مقالہ ڈاکٹر زور

آنے والے ہیں انھیں سناؤں گا۔ اس کے بعد انھوں نے تھیس میں بہت سی تبدیلیاں کیں اور اس کو سنانے کے بجائے شائع کردیا۔ جس کا مجھے آج تک قلق ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے اس کی پھر تردید کیوں نہیں کی۔ فرمایا کہ اس معاملے میں قدامت پسند ہوں، اور اپنے استاد کی شان میں گستاخی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہوئے، اس مقالے پر کئی اعتراضات ہوئے لیکن میں نے ان کی تردید نہیں کی۔ کیوں کہ میں ایک غلطی کر چکا تھا اور اب اور غلطیاں نہیں کروں گا تو میاں عارفی صاحب ولی گجراتی والا قصہ یہ ہے، جو حقیقت تھی وہ اتنی مدت کے گزرنے کے بعد میں نے صحیح صورت حال آپ سے بیان کردی'' ۶۲؎

اگر پروفیسر امیر احمد عارفی اور ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی کی مذکورہ بات چیت (گفتگو) کو صحیح مان لیا جائے تو ان کی ساری تحقیق بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اور ایسی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ عارفی صاحب کے مذکورہ بالا بیان کو غلط مان لیا جائے۔ مذکورہ بالا گفتگو سے راقم السطور نے ایک اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس عہد میں ان علمائے ادب کے درمیان ایک معاصرانہ چشمک رہی ہوگی اور کسی امر میں ایک دوسرے پر فوقیت اور برتری لے جانے کا جذبہ شدّت سے کارفرما رہا ہوگا۔ اور یہ علماء، ادبا اور محقق ادبی مجالس میں شرکت کے وقت اپنی تحقیقی کارناموں سے دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہوں گے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس کے مکالمے سے واضح ہوتا ہے گویا معاصرانہ چشمک کے طفیل ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے اپنے استاد نجیف اشرف ندوی کی ایماء پر ''ولی گجراتی'' کا مقالہ تحریر کیا۔ اس لئے اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

المختصر یہ کہ بیسوی صدی کی تیسری اور چوتھی بلکہ پانچویں دہائی تک ولی کی وطنیت کی تحقیق کا بازار خوب گرم رہا، دونوں فریقین نے اپنے اپنے دلائل سے ولی کو ''گجراتی'' اور ''دکنی'' ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اسی طرح دکنی مصنفین اور محققین نے ولی کی وطنیت کی طرف داری میں جو دلائل پیش کئے اس کے کچھ نکات اگرچہ گذشتہ صفحات میں درج کئے جاچکے ہیں تاہم یہاں اس کا اعادہ بے جا نہ ہوگا کہ ساری باتیں بہ یک نگاہ سامنے آجائیں۔

(۱) تذکرہ نویسیوں نے ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی لکھا ہے۔

(۲) خود ولی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دکنی تھے۔

(۳) ولؔی نے ''در فراق گجرات'' والے قطعہ میں لفظ ''سیر'' لکھا ہے جس سے گجرات میں بطورِ سیر وسیاحت جانا ہی ثابت ہوتا ہے۔

(۴) ولؔی کے کلام میں دکنی الفاظ اور محاورات بکثرت پائے جاتے ہیں۔

(۵) ولؔی نے اپنے کلام میں اپنے ہم عصر دکنی شعراء کا ذکر کیا ہے۔

(٦) دیوانِ ولؔی کا ایک قلمی نسخہ (موجودہ کتب خانۂ انڈیا آفس لندن) کے آخر میں کاتب نے جو ولؔی کے دوست سیّد ابو المعالی کا بیٹا ہے ولؔی کو ''متوطن دکن'' لکھا ہے۔

مندرجۂ بالا دلائل جو دکنی محققین کی طرف سے پیش کئے گئے ان پر گذشتہ صفحات میں سیرِ حاصل بحث بحث کی جاچکی ہے۔ اسی طرح گجرات کے علماء نے بھی ولؔی کے گجراتی الاصل ہونے کی حمایت اپنے دلائل پیش کئے ہیں۔ ولؔی پر گجرات اور دکن دونوں فریقین کی دعوے داری سے سچ کہا جائے تو ولؔی پر کام کرنے والے بہت سے نامور مورّخین مصنفین اور محققین نے ولؔی کو نہ گجرات کا رہنے دیا اور نہ دکن کا۔ ان کو جب چاہا مار دیا اور جہاں چاہا دفن کردیا۔ انھوں نے ایسا ولؔی کی محبت میں کیا یا کدورت میں یا اپنے ذاتی مفاد کے لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر ولؔی کے تعلق سے تحقیق تلاش اور جستجو کے ایسے گوشے بہر حال ضرور پیدا کر دیئے کہ وہ جسے ولؔی سے محبت ہو ان بھول بھلیّوں میں ضرور کھوجائے یا ان ضخیم کتابوں کی ورق گردانی، الفاظ کی معنی آفرینی سے نتیجہ اخذ کرلے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے تھے، کہاں پلے بڑھے، کہاں کہاں سیر وتفریح کی، اور کیا کیا کارنامے انجام دے کر بالآخر دکن یا ارضِ گجرات کے کس گوشہ میں پیوندِ خاک ہوگئے۔

چونکہ ولؔی کوئی غیر اہم نام نہیں ہے اس لئے ذہن میں بار بار کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ولؔی کی سوانح حیات میں اس قدر تضاد اور اختلاف کیوں پیدا ہوئے؟ جب کہ اردو کے اور بہت سے نامور شعراء مثلاً غالؔب، میرؔ، دردؔ، شاہ میراںؔ جی، برہان الدین جانؔم وغیرہ ایسے نامور شعرائے اردو کی جائے پیدائش اور جائے وفات الگ الگ ہیں۔ پھر بھی ان کے متعلق تضادات اور اختلافات نہیں پائے جاتے، تو آخر ولؔی ہی کیوں اس تضاد کا شکار ہوگئے؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس نے ولؔی کی شخصیت کو متنازع فیہ بنادیا۔ اور دانشورانِ اردو ادب اپنے اپنے حسبِ منشا تحقیق کا سہارا لے کر ولؔی کے تعلق سے روایات کو مآخذ قرار دیتے ہوئے ان کی تشہیر کرتے گئے۔

ولؔی کے متعلق اختلافات اور تضادات کا منبع اور مآخذ اوّل تو تذکرہ نگار ہی ہیں کیوں کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ولؔی کو ''دکنی'' یا ''اورنگ آبادی'' لکھا ہے اور بعض نے ''گجراتی'' اور اس طرح بعض تذکرہ نگاروں

نے نہ تو دکنی لکھا اور نہ ہی گجراتی ان تذکرہ نگاروں میں قاضی نورالدین فائق مرحوم (گجراتی) پیش پیش ہیں۔ قاضی نورالدین فائق کے تذکرے ''مخزن الشعراء'' (۱۲۶۸ھ) کا بھی ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح میر تقی میر نے بھی ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ فائق صاحب نے لکھا ہے کہ ''مزارِ ولی مابین مزارِ موسیٰ سہاگ اور شاہی باغ'' یہ ایسی نشاندہی ہے جس کا کوئی حدود اربعہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی خاص سمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ تحریر اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ فائق صاحب بھلے ہی گجرات کے ہوں لیکن انھوں نے خود ولی کے مزار کے مقام کو نہیں دیکھا ہے بلکہ زبانی بیانات پر بھروسہ کر کے لکھ دیا ہے۔ جو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ فائق صاحب کی تحریریں اس قدر مبہم ہیں کہ قاری کسی صحیح سمت آگے بڑھ نہیں سکتا اور جو قاری کو مغالطے میں ڈال دیتی ہے۔ آخر ان تمام تذکرہ نگاروں کے بیان میں اس قدر اختلافات کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ بعض دکنی اورنگ آبادی کہہ رہے ہیں اور بعض گجراتی اور احمد آبادی یہ اختلافِ حالت اوّل تو خود ولی کے اشعار مثلاً۔۔۔

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

سے ہوئی، دوم یہ کہ کسبِ علوم کی خاطر ولی کا احمد آباد کے مدرسے ''مدرسۂ علویہ'' حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ میں قیام پذیر ہونا، لیکن ولی کا احمد آباد میں ایک طریل عرصے تک قیام سے متعلق بھی مدرسہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ میں ایسی کوئی مستند سند نہیں ملتی اور نہ ہی کوئی ایسی ٹھوس بات ولی کے اجداد کے متعلق دریافت ہوتی ہے کہ کسی آخری نتیجہ پر پہنچا جا سکے، اس لحاظ سے غور کریں تو ان تمام تذکرہ نویسوں کے بیانات میں اختلافات پایا جانا کوئی عجب بات نہیں معلوم ہوتی لہذا پھر ولی کی پیدائش، خاندان، وفات کے متعلق ان ہی قدیم تذکرہ نویسیوں کے بیان پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

ولی چونکہ ایک مایۂ ناز اردو شاعر کی حیثیت منظرِ عام پر آئے تھے لہٰذا اس زمانے کے ماحول کے اعتبار سے تذکرہ نویسوں نے اپنی اپنی معلومات اور سنی سنائی باتوں نیز قیاس آرائیوں کا سہارا لے کر ولی کے متعلق بلا تحقیق جو کچھ سمجھا لکھ ڈالا اور چوں کہ تذکرہ نگاروں نے اپنی تحریر کردہ باتوں کا ماٰخذ نہیں بتایا ہے۔ لہذا ان کی کوئی تاریخی یا تحقیقی حیثیت بھی باقی نہیں رہتی، پھر اس ضمن میں کوئی قطعی اور ٹھوس شہادتیں بھی نہیں پیش کی ہیں۔ لہذا ان کی حیثیت ایک ذاتی بیاض کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتی، اس لئے ان تذکرہ نگاروں کے بیانات پر

قانع ہوکر ولی کی وطنیت، پیدائش اور وفات کا فیصلہ کرنا کسی قدر صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ کہ ایسے بلند پایہ شاعر کے متعلق معلومات کا ذخیرہ اس قدر کم ہو کہ تذکرہ نوسیان کسی ایک رائے پر متفق نہ ہوں اور سبھی کے بیانات میں اختلاف پایا جائے اور جس کی معلومات کی رسائی جس قدر ہو وہ اسے اپنی ذہنی اُفتاد کا سہارا لے کر لکھ ڈالے۔

مذکورہ باتوں کی بنیاد پر ایک لازمی اور قطعی نتیجہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ دہلی پہنچنے سے قبل تک ولی ایک غیر معروف حیثیت رکھتے ہوں، نیز اُن کا خاندان اور اجداد بھی اپنے عہد میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز نہ ہو اور نہ اُن کے خاندان کے دیگر افراد نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہو جس کی بنیاد پر اس خاندان کو کوئی اعلیٰ سماجی حیثیت حاصل ہوئی اور جس کی بنا پر اور کوئی بلند مرتبہ حاصل ہوا ہو اس لئے یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ولی ابتداء میں اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ ایک گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن کے خاندان کے دیگر افراد اور اجداد کا حال بھی بہتر طور پر معلوم ہوتا لیکن یہاں تو سوائے ولی کے اور اس خاندان کے دیگر افراد مطلب والد، والدہ، چچا، بھائی، بہن وغیرہ کے متعلق بھی کوئی حال نہیں ملتا۔ اُن کے خاندان کے دیگر افراد کی کوئی تفصیل کہیں بھی نہیں ملتی۔ ظاہر ہے جب ولادت وجائے ولادت اور وفات وجائے وفات میں ہی اس قدر بُعد ہے تو خاندان کا پُرسان حال کون ہوگا؟ کیا اس سے یہ بات مترشح نہیں ہوتی کہ ولی ایک عام خاندان کا چشم و چراغ تھے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُن کے خاندانی حالات اس قدر تاریکی اور گمنامی میں پوشیدہ ہیں؟ کہ بغیر قیاس کا سہارا لئے آگے بڑھنا محال ہو جاتا ہے اور یہی تذکرہ نویسوں کے متضاد بیان کی بنیادی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے جِس وجہ سے اردو کا یہ کم نصیب شاعر گجرات اور دکن کی سرحدوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔

مذکورہ دلائل کی بنیاد پر راقم السطور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دکن اور گجرات کے علماء نے ولی کے متعلق اپنے اپنے جن بیانات کو بنیاد بنا کر بحثیں کی ہیں اس سے اس عقدے کا حل نظر نہیں آتا لہذا ولی کی حیات، ممات، سنِ ولادت، سنِ وفات اور مقامِ مدفن اور دیگر حالات دریافت کرنے کے لئے خود ولی کے بعض اشعار اور کلام کا سہارا لے کر ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گذشتہ مباحث کے پیشِ نظر راقم الحروف ولی کی حیاتِ زندگی سے متعلق مندرجۂ ذیل نتیجے پر پہنچا ہے۔

☆ ولؔی کی حیاتِ زندگی ☆

ولؔی کی پیدائش ۱۶۶۸ء اورنگ زیب کی فتحِ دکن ۱۰۶۲ھ سے قبل اورنگ آباد کے کسی قریبی دیہات میں ہوئی جو چند خاندانوں کے افراد پر مبنی تھا۔ اس وقت اورنگ آباد کا وجود نہیں تھا۔ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں جب اورنگ زیب دکن کا صوبے دار مقرر ہوا، تو اس نے زین العابدین خوانی کے اہتمام میں قلع دولت آباد سے سات کوس کے فاصلے پر ایک شہر اورنگ آباد کے نام سے آباد کیا۔ اور بعد میں ۱۰۶۲ھ کو اُسے دکن کا دار الخلافہ بنایا۔ اور اس شہر کو مزیّن وآراستہ و پیراستہ کیا گیا، جس بنا پر اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے اور یہ ایک پُر رونق شہر بن گیا نیز آہستہ آہستہ اس کی آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

ایسا ممکن ہے کہ ولؔی کے خاندان نے بعد میں اورنگ آباد میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی ہو جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے لیکن اورنگ آباد کے متعلق ولؔی کے کلام میں کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ولؔی کا خاندان اورنگ آباد سے کسی قریبی دیہات میں مقیم رہا ہو اور جو غالبًا ''جولانگری'' کے نام سے جانا جاتا ہو۔ چنانچہ ولؔی نے خود اپنے اشعار میں اپنے محلّہ اور سکونت گاہی سے آگاہی دی ہے۔

؎ جولانگری میں گرم ہے وہ شہ سوار آج سینے میں عاشقوں کے اُٹھا ہے غبار آج

''جولانگری'' اصل میں جولاہہ نگری ہے جو عام بول چال میں رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ''جولاہانگری'' کے نام سے شہرت حاصل کرلی۔ اس محلّے کی خوبی یہ تھی کہ یہاں باشندگانِ پارچہ بافی کی کثرت تھی اور یہ صنعت اپنے عروج پر تھی چنانچہ ولؔی نے ان ملبوسات کے نام اور خوبیاں اپنے اشعار میں پیش کی ہیں۔'' ۶۳

ولؔی کا خاندان ایک متوسط خاندان تھا اور اپنے زمانے یہ خاندان غیر معروف تھا یہی وجہ ہے کہ ولؔی کی تاریخ پیدائش یقینی طور پر معلوم نہیں ہوسکی اور نہ ہی ان کی یومِ ولادت کا حال ہی معلوم ہوسکا ہے۔ غرض ولؔی کی پیدائش کے بعد اس کے نام کا معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ مختلف تذکرہ نویسوں نے ولؔی کے مختلف نام لکھے ہیں (جن کی تفصیلات بیان کی جاچکی ہے) لیکن وہ تذکرے جو زمانی اعتبار سے ولؔی کے دور کے قریب کے ہیں ان میں ولؔی کا نام ''محمد ولی'' لکھا گیا ہے۔ اور ''گلشنِ گفتار'' میں جو دورِ ولؔی سے قریب تر ہے ولؔی کا

نام ''ولی محمد'' لکھا گیا ہے۔

اس نام کی مزید تصدیق ۱۷۲۵ء کے ثناء اللہ کے لکھے ہوئے ''دیوانِ ولؔی'' سے بھی ہوتی ہے اور ۱۷۴۳ء کے اُس دیوانِ ولؔی سے بھی جو ولؔی کے عزیز ترین دوست سیّد ابو المعالی (جن کے ساتھ ولؔی نے ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا تھا اور جن کا ذکر ولؔی نے اپنی غزل میں بھی کیا ہے) کے لڑکے سیّد محمد تقی نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ مختلف تذکروں کے مطالعے اور تجزیے کے بعد راقم اس نتیجے پر پہنچا کہ ولؔی کا نام ''ولی محمد'' ہی تھا اور جو اردو شاعری میں ولؔی کے نام سے مشہور ہوئے اور اسی ولؔی کے آگے اور پیچھے لوگ ''محمد'' کا اضافہ کرنے لگے کیوں کہ نام یا عرفِ عام سے قبل یا ما بعد لفظ ''محمد'' تبرکاً اور علامتِ مسلمانی کے طور پر جوڑنے کا رواج زمانۂ قدیم میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔

ولؔی کے والدین چونکہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہذا یہ کہنا بعید از حقیقت نہیں کہ ان کی تعلیم مقامی مدرسہ سے شروع ہوئی ہوگی اور مزید تعلیم کی خاطر انھوں نے ولؔی کو احمد آباد (گجرات) کی طرف روانہ کرنے کا قصد کیا ہوگا۔ کیوں کہ ان کی مالی استطاعت اتنی قوی نہیں رہی ہوگی کہ نجی طور پر اساتذہ مقرر کرتے اور ان کی مزید بہتر تعلیم کا انتظام کرتے شاید یہی بنیادی وجہ ہو جس کی بناء پر ولؔی کو اس طرح کے خیراتی مدارس میں جہاں مفت اعلیٰ تعلیم ممکن ہو ارادہ کیا ہو اور ولؔی کے مزید اعلیٰ تعلیم کی خاطر انھیں گجرات احمد آباد روانہ کیا ہو۔ عبد الجبار خاں ملکاپوری لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''اپنے زمانے کی مروجہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی عمر کے بیسویں (۲۰)
سال گزارنے کے بعد مزید کسب علم کے لئے مدرسہ علویہ گجرات حاضر ہوا''۔[۶۴]

گجرات اس زمانے میں علم وفن کا بڑا مرکز تھا۔ اور اس کی علمیت کا چرچا ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا تھا اور تشنگانِ علم یہاں کھینچے چلے آتے تھے۔ یہاں بڑے بڑے مدارس قائم تھے۔ جن میں اقامت کے ساتھ طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم عربی وفارسی تھا۔ حساب، زراعت، ہندسہ، تاریخ، ریاضیات، طبیعات وغیرہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ چونکہ تقریباً مدرسے سکونتی تھے، اس لئے معلّم اور متعلّم ایک جگہ رہ کر ایک دوسرے کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ ولؔی نے احمد آباد کے ''مدرسۂ علویہ'' میں اقامت کے ساتھ اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا اہلِ دکن کے لئے دور افتادہ اس مقام تک تعلیمی مقاصید کے لئے آنا کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ دکن کے اکثر خاندانوں نے اپنے بچوں کو ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) تعلیم

کے لئے روانہ کیا تھا، تاریخ اس کی گواہ ہے۔

اس طرح ولؔی کسبِ علوم کی خاطر سرزمینِ دکن سے گجرات وارد ہوئے اور غالباً سات تا دس سال تک یہیں مقیم رہے۔ اس درمیان وہ دکن اپنے ملکِ حقیقی آتے جاتے رہے۔ اس طرح کے اقامتی مدرسوں میں دوردراز سے آئے ہوئے طلباء کو ان کے حقیقی وطن سے جوڑ کر پکارا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج بھی ہندوستان کے بڑے مدارس میں یہ رواج عام ہے ہندوستان کے موجودہ بڑے مدارس میں (۱) مدرسہ دار العلوم دیوبند (۲) مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور (۳) مدرسۃ العلوم سرائے میر اعظم گڑھ وغیرہ میں آج بھی یہ دستور قائم ہے کہ ان مدارس میں ہندوستان کے دیگر صوبوں میں سے آنے والے طلباء کو ان کی شناخت کی خاطر ان کے نام کے ساتھ ان کے صوبوں کا نام جوڑ دیا جاتا تھا۔ مثلاً : عابد بجنوری، ناظم پرتاپ گڑھی، آصف دہلوی، مسیح احمدآبادی جیسا کہ عام طور پر شعراء کے نام کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ اس لئے بھی کیا جاتا تھا تاکہ اگر ایک ہی نام کے کئی طلباء ہوں تو بھی صوبوں کی بناء پر ان کی شناخت قائم کی جاسکے۔ غالباً ولؔی کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہوا چونکہ ولؔی دکن سے وارد ہوئے تھے لہٰذا اس کی شاعری کی ابتداء سے قبل ہی ان مدارس کی روایت کے مطابق انھیں احمدآباد (گجرات) میں ''ولؔی دکنی'' کے نام سے موسوم کیا گیا جس کا اعتراف بعد میں خود ولؔی نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

ولؔی ایران و توران میں ہے مشہور
اگر چہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

لیکن اس کے باوجود احمدآباد (گجرات) سے اُن (ولؔی) کی والہانہ محبت برقرار رہی۔ ولؔی نے بھلے ہی خود اپنے مولد و مسکن کی آگاہی دی ہے، لیکن گجرات سے ان کا تعلق پھر بھی برقرار رہتا ہے۔ اس ضمن میں آپ (ولؔی) کہا کرتے تھے کہ۔۔۔

''میرا نام گجرات سے ایسے جڑا ہے جیسے گوشت سے ناخن'' ۶۵-A

سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے ولؔی کی وطنیت کے معاملے میں سیّد نجیف اشرف ندوی کے حوالے سے جس ''تمسک نامہ'' کا ذکر کیا ہے جس میں بحیثیت گواہ ولؔی اور اس کے دو بیٹیوں کے دستخط ہیں۔ ۶۵-B۔ تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ ولؔی وہی ہے جسے اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے کیوں کہ خود سیّد ظہیر الدین مدنؔی اپنے تحقیقی مقالے ''سخن ورانِ گجرات'' میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

"یہ (ولیؔ) علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی، متوفی ۹۹۸ھ سے نسبتی تعلق رکھتا تھا اس کا سلسلۂ نصب چھے (٦) واسطوں سے علاّمہ موصوف کے بھائی شاہ نصر اللہ تک پہنچتا ہے ولیؔ کے بعض خاندانی دستاویز کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۰٦۰ھ/۱٦۵۹ء سے قبل پیدا ہوا ہوگا مگر یہ محض قیاس ہے"۔ ٦٦

تحریر بالااقتباس کو پڑھ کر یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد ظہیر الدین نے ولیؔ کا تعلق حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے بتایا ہے۔ لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت شاہ کی ولادت ۲۲ محرم ۹۱۰ھ میں بمقام چانپانیر میں ہوئی اور آپ کی وفات ۲۹ محرم ۹۹۸ھ بروز یک شنبہ صبح صادق کے وقت اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے، اس وقت ان کی عمر (۸۸) برس کی تھی ان کا مزار مدرسہ کے وسطِ صحن میں بنایا گیا"۔ ٦٧

مذکورہ اقتباس جس میں علاّمہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کی ولادت با سعادت کا ذکر ہے۔ ہجری سن ۹۱۰ھ بتائی گئی ہے اور جیسا کہ سید ظہیر الدین مدنؔی نے قیاس کر کے ولیؔ کی پیدائش ہجری سن ۱۰٦۰ھ تحریر کی ہے ان دونوں تواریخ میں ڈیڑھ صدی یعنی ایک سو پچاس (۱۵۰) سال کا طویل عرصہ ہے۔ یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کا خاندان کوئی معمولی خاندان نہیں تھا بلکہ علم وفضل وکمال اور مرتبہ میں اپنے عہد کے ممتاز گھرانوں میں شمار کیا جاتا تھا اور موصوف کے والد بزرگوار قاضی نصر اللہ کو شاہِ وقت سلطان مظفر حلیم نے اپنے ساتھ لاکر احمد آباد میں مقیم کیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس خاندان کی عظمت، بلندی اور برتری کا کیا عالم تھا۔ یہاں تک کہ خود حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے حکم اور دستخط کے بغیر کسی امرِ مہم میں سلطانِ وقت احکام نافذ نہیں کرتے تھے اور آپ موصوف کی ۸۸ برسوں کی زندگی میں مختلف سلطانِ وقت آپ کے آستانے پر قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔

ایسے ممتاز خاندان میں ولادت اور وفات کوئی عام بات نہیں ہوگی، اگر ولیؔ کا تعلق اس خاندان سے تھا تو حضرت علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کے شجرۂ نسب میں اس ولیؔ کا یومِ پیدائش، وقتِ پیدائش اور سال ضرور محفوظ ہوتا اگر علاّمہ موصوف کا ایک سو پچاس برس پہلے کا حال دریافت ہوتا ہے تو آپ کے وصال کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیۓ تھا، تو پھر ولیؔ کے سلسلے میں اس طرح کی لاعلمی اور قیاس آرائی کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے یہ بات مترشح نہیں ہوتی ہے کہ ہمارے ولیؔ کا حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان سے کوئی تعلق

نہیں تھا اور نہ ہی وؔلی اس خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت شاہ وؔلی کا نام ''ولی محمد'' تھا اور ولی اللہ یا شاہ ولی اللہ کوئی اور بزرگ تھے جن کا تعلق وجیہ الدین علویؒ گجراتی (۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء) کے خاندان سے تھا۔

''مدرسۂ علویہ'' جس کے بانی حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ تھے۔ آپ نے ۲۵ برس کی عمر میں ۹۳۵ھ میں اس مدرسے کی بنیاد رکھی اس مدرسے سے میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جس میں ابتدائی تعلیم کے علاوہ تفسیر مع اصول، حدیث مع اصول، فقہ مع اصول، معانی وبلاغت، منطق، فلسفہ، ہیئت، مناظرہ وغیرہ نیز فتویٰ نویسی کا بھی باقاعدہ انتظام تھا۔

''مدرسۂ علویہ'' کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوتے ہوئے وؔلی نے علوم عقلی ونقلی سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔ قرآن وتفسیر، تصنیف وفلسفہ، معانی وبیان کی اصطلاحوں کو جس طرح اُنھوں نے اپنے کلام میں برتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام علوم میں غیر معمولی صلاحیتیں حاصل کرلی تھیں۔ اور کتب متداولہ پر بھی اُنھیں پورا عبور حاصل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب احمدآباد میں مشائخ کا سکّہ چل رہا تھا اور تمام سلسلوں کے خدا رسیدہ شیوخ موجود تھے۔ ایسے ماحول اور ایسی علمی صحبتوں کی وجہ سے وؔلی کے خمیر میں جو صلاحیت تھی اُسے پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا اور وؔلی کے مرشد ''مولانا شیخ نور الدین صدیقی سہروردی قدس سرہٗ کی توجہ خاص نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وؔلی کی شخصیت میں وہ تمام علوم سرایت کرگئے جو ایک جیّد عالم اور انشا پرداز میں ہونے چاہیئے۔ اس ''مدرسہ علویہ'' اور یہاں کے دیگر اساتذہ نے اُن کی ذہنی اور علمی سرپرستی کا ایسا سامان بہم پہنچایا کہ وؔلی کی شخصیت شہرۂ آفاق بن گئی۔

یہ مسئلہ بھی ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آرہا ہے کہ وؔلی نے کن کن اساتذہ سے کسبِ علم کیا ہے؟ وؔلی کی علمیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مختلف اساتذہ کے سامنے ادب طے کیا ہے۔ وؔلی نے اپنی ذہنی علمی تشنگی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جو استاد جس علم وفن میں ماہر رہا ہو اس سے کسبِ علم حاصل کرتے رہے ہوں اس لئے ممکن ہے کہ احمدآباد میں اور یہاں سے واپسی پر اُنھوں نے بیجاپور، برہانپور اور اورنگ آباد کے علمائے وقت یا اور کبھی اپنے دوستوں، ہم وطنوں جو علومِ ظاہری وباطنی کے ماہرین ودانشوران ہوں اُن سے فیض حاصل کرتے رہے ہوں۔

علی احسن مارہرویؔ نے وؔلی کے اساتذہ کے متعلق قیاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

''تذکرہ آبِ حیات'' اور محبوب الزمن تذکرہ شعرائے ''دکن'' میں ولؔی کے پیر ومرشد کا
نام ''شاہ نور الدین'' لکھا ہے علّامہ پاک حضرت میر آزاد بلگرامی کی تصنیف ''مآثر
الکرام'' کے صفحہ ۲۱۹/ پر یہ نام پایا گیا ان کا اور ولؔی کا زمانہ حیات اور ممات ایک ہے
اس لئے ''ظن غالب'' ہے کہ یہی بزرگ ولؔی کے پیشوائے طریقت تھے۔'' ۶۸

حالانکہ ''نور المعرفت'' کو ولؔی کی تصنیف قرار دیا جاتا رہا ہے اور ولؔی کے اساتذہ میں اِسی کتاب کے حوالے سے بزبانِ ولؔی کہا جاتا ہے کہ۔۔۔

''میں نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدین کا خاک پا ہوں''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولؔی کے اساتذہ اور پیر ومرشد میں سے سب سے اہم یہی ''مولانا شیخ نور الدین صدیقی سہروردی'' ۶۹ ہی تھے جن سے ولؔی کو والہانہ عقیدت اور حد درجہ انسیت تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ولؔی کے پیر ومرشد کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''علی رضا سرہندی ولؔی کے مرشد تھے'' اور ایک شعر میں ان کا ذکر یوں آیا ہے۔

؎ بادشاہ نجف ولی اللہ
پیر کاملِ علی رضا پایا ۷۰

علی احسن مارہروی نے اس شعر کو یوں درج کیا ہے

؎ نقد شاہ نجف ولی اللہ
پیر کامل علی رضا پایا ۷۱

نور الحسن ہاشمی نے اس شعر کو یوں تحریر کیا ہے۔

؎ بعد شاہ نجف ولی اللہ
پیر کاملِ علی رضا پایا ۷۲

ایسا ممکن ہے کہ کاتب کی غلطی سے یا مختلف دیوان سے یہ شعر نقل کرنے میں میں غلطی سرزد ہوگئی ہو۔ مرزا آغا بیگ نے اس شعر ''علی رضا'' سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ لکھا ہے موصوف مزید آگے لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولؔی جب زیارتِ حرمین وشریفین سے فارغ ہوا تو شاہ نجف حضرت امام علی اور

حضرت امام علی رضا کے مزارات سے مشرف ہوا۔ اور اسی مقام پر یعنی علی رضا علیہ السلام سے روحانی فیض وبرکات حاصل کیں۔ جس کا تعلق روحانیات سے اور جب یہ نعمت حاصل ہوگئی تو ولؔی پکار اُٹھا ''پیر کامل علی رضا پایا''۔۴۳ے

ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنؔی ولؔی کے زیارت حرمین کے متعلق اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

''ولؔی نے فریضۂ حج بھی ادا کیا تھا۔ اس عہد میں سورت باب المکہ تھا اس لئے جب یہ سورت آیا تو یہ وہاں کے حسن ملیح سے بہت متاثر ہوا اور اس نے شہر سورت پر ایک مختصر مثنوی یادگاہ چھوڑی ہے اس مثنوی کے آخری شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عازم حرمین شریفین تھا اس کا ایک قصیدہ ''درمدح بیت الحرام'' بھی اس کے سفر صبح کا غماز ہے۔۴۴ے

مذکورہ دونوں اقتباس میں ولؔی کے فریضۂ حج کا ذکر کیا گیا ہے نیز شہر سورت کا، جو گجرات کے جنوب میں واقع ہے ولؔی کی ایک مثنوی کا بھی ذکر ملتا ہے جو انھوں نے سورت شہر کی خوبصورتی سے متعلق لکھی ہے جس میں سورت کے مناظر کی بالکل تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ چونکہ گجرات سے برہان پور، اورنگ آباد اور دکن کے دیگر صوبوں میں جانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ اس لئے ولؔی کا سورت آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ اسی شہر سورت سے آپ حج کے لئے بھی تشریف لے گئے اور بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے بیت اللہ کی تعریف میں لکھتے ہیں۔۴۵ے

کیا ہے غم محمد کو اگر جگ میں نہیں مونس غم
آہ یہ بس ہے مرے درد کو دل کے مرہم
خلقتِ حق میں تو عرفاں کی نظر کھول کے دیکھ
یہ ذرّہ ذرّہ کے بہتریاں ہے جدا اک عالم
اس کے مشتاق ہیں سب اہل زمیں اہل سماں
شوق کا جسں کے لیا چرخ پہ خورشید علم
آگ دوزخ کی اچھے اُس پہ قیامت میں حرام
اے ولؔی صدق سے دیکھا جو کئی بیت حرم

غرض ولی نے اپنی زندگی میں کئی مرتبہ سورت کا سفر کیا اور اس کے خوبصورت مقامات سے لطف اندوز ہوئے اور اس شہر کے متعلق اپنی دلی کیفیات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر ایک خوبصورت مثنوی تخلیق کی۔ یہ مثنوی اپنی خصوصیات کے باعث اس قابل ہے کہ آج کل کی جدید مثنویوں کے مقابلے میں اس کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر پہلے آچکا ہے۔

گمان غالب ہے کہ ولی نے اپنی شاعری کی ابتداء یہیں احمدآباد گجرات سے کی ہو۔ کیوں کہ اس مثنوی کے اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ولی نے یہ اشعار یہیں تخلیق کئے ہوں گے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، ولی بیس (۲۰) سال کی عمر میں احمدآباد آئے عام طور پر مدارس میں تعلیم کا وقفہ سات تا دس سال ہوتا ہے۔ جیسا کہ موجودہ دور کے مدارس میں بھی تمام علوم کی مکمل تکمیل کے لئے اتنا ہی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اسی لئے غالباً ولی نے احمدآباد میں دس یا بارہ سال قیام کیا ہوگا۔ یا ممکن ہے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی گجرات اور احمدآباد میں کچھ اور سال قیام کیا ہو۔ کیوں کہ اس طویل عرصے میں ممکن ہے یہاں کی دوستانہ صحبتوں اور اقارب کی موجودگی نے انھیں یہاں کچھ اور قیام کرنے پر مجبور کیا ہو۔ اور چوں کہ یہاں ولی کے بہت سے رشتہ دار سکونت رکھتے ہوں جیسا کہ جمیل جالبی کا خیال ہے۔۔۔

> ''ولی کے باپ یا دادا گجرات سے دکن ہجرت کر گئے تھے۔ اس ہجرت اور دکن میں رہنے کے باوجود گجرات سے ان کا تعلق باقی تھا۔ ۶۷ے

لہذا ولی نے ایک طویل مدت تک احمدآباد میں قیام کیا اور یہاں کی پُر لطف فضاء میں اُن کی فنی صلاحیتوں کو نکھرنے کا خوب موقع ملا۔ ولی کے اسی طویل قیام کی بناء پر تذکرہ نویسوں کو یہ غلط فہمی واقع ہوئی کہ ولی گجراتی تھے۔ ایسا ممکن ہے کہ ولی نے شاعری کی ابتداء کم سنی میں کی ہو اور اُن کی فنی صلاحیتوں کا خام مواد جو دکن کی ادبی فضاء میں پرورش پارہا تھا اور جس کا خاکہ اُن کی شخصیت میں پروان چڑھ رہا تھا، اس فنِ شاعری کو پہنچنے کا موقع گجرات کے اس تاریخی شہر احمدآباد میں ملا ہو، ایسا ممکن ہے۔ لیکن ولی کی شاعری کی ابتداء کہاں ہوئی اِس کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی۔ خیر اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے، ولی نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک طویل عرصہ گجرات میں گزارا اور ''مدرسۂ علویہ'' سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مختلف اہلِ فن اور اساتذہ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے ہوئے اپنے مولد و مسکن کی راہ لی۔

ولی کی ابتدائی شاعری دکن میں ہوئی یا گجرات میں اس بارے میں تمام محقق خاموش ہیں۔ نیز تذکرہ

نگاروں نے بھی ان کی ابتدائی شاعری کے متعلق کچھ نہیں لکھا، لیکن ولؔی کے ابتدائی کلام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری کی ابتداء ضرور دکن میں کی ہوگی۔ ولؔی جب تحصیل علم سے فارغ ہوکر دکن پہنچے اس وقت ان کی عمر یقیناً تیس (۳۰) یا پینتیس (۳۵) سال رہی ہوگی اور غالباً انھوں نے اسی عمر میں پہلی مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔ ولؔی کا سفرِ دہلی کے متعلق تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ نے ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں پہلی مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔

''در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعالی نام سیّد پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بہ جہاں آباد آمد''۷۷

ولؔی نے ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا اس بات پر سبھی محقق متفق نظر آتے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ولؔی کو دہلی جانے کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی؟ ولؔی کے سفر دہلی کے متعلق راقم الحروف کا خیال ہے کہ دکن میں اُس وقت کا حکمران طبقہ شیعہ مسلک کا تھا جب کہ ولؔی سن العقیدہ تھے۔ شاید اسی سبب سے وہاں کے حکمرانوں اور رؤسا اور امراء نے ولؔی کے متعلق دانستہ تغافل برتا اور جان بوجھ کر انھیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اور انھیں لوگوں کے تغافل کا نتیجہ تھا کہ ولؔی حکمران طبقے بادشاہِ وقت کے دربار تک رسائی حاصل نہیں کرسکے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ولؔی مایوس اور ہراساں ہوگئے ہوں اور اپنی شناخت قائم کرنے کی غرض سے ہی انھوں نے پہلی مرتبہ دہلی کا قصد کیا ہو۔ غالباً دکن کے حکمران طبقے، رؤسا اور امراء نے جو بے توجہی ولؔی کے متعلق دکھائی، اس کی وجہ سے بھی ولؔی کے حالاتِ زندگی تاریکی میں پڑے رہے اور اُنھیں سرزمین دکن پر منظرِ عام پر آنے کا موقع نہیں ملا۔ یہی وجہ کے ولؔی کے حالات، نام، جائے پیدائش، خاندان وغیرہ کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی۔ گویا ولؔی سن العقیدہ ہونے کے سبب دکن میں بے توجہی کا شکار ہوگئے۔ جب کہ ولؔی سے قبل کے شعراء کے مفصّل حالات تذکروں اور تاریخوں میں محفوظ ہیں اور جس بادشاہ کے دربار پر نظر ڈالو وہاں ''ملک الشعراء'' کا خطاب لئے ہوئے کوئی نہ کوئی بڑا شاعر ضرور نظر آئے گا اور بہت سے شعراء دربار کے اردگرد گردش کرتے نظر آئیں گے جن میں بعض ایسے بھی شعراء شامل ہیں جن سے متعلق تذکروں میں حرف چند سطروں کے علاوہ کوئی مزید معلومات نہیں ملتی۔ لیکن پھر بھی ان شعراء کے نام، جائے پیدائش اور خاندان کے متعلق کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ولؔی کی بدقسمتی ہی تھی کہ جس طرزِ خاص کی اُنھوں نے ابتداء کی اور اپنی غزلوں کو جس نئی راہ پر گامزن کیا اور شاعری میں جو نئے تجربات کئے، اس بنا پر دکن میں اُن کا مرتبہ بہت اعلیٰ

ہونا چاہیئے تھا اور شاہی درباروں میں اس کی پزیرائی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن شاہانِ وقت نے عدم توجہی کا ثبوت دیا، لہذا ولؔی نے شمالی ہند کی طرف رُخ کیا، جہاں کے سلطان سنی العقیدہ تھے اور اس امید پر کہ اپنی شعری صلاحیتوں سے شاید دہلی میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کیا جاسکے شاید اسی مقصد کو دل میں رکھ کر ولؔی نے دہلی کے سفر کا ارادہ کیا ہوگا شاید اس کے سوا ولؔی کے پاس کوئی چارہ بھی نہ ہو؟

ولؔی کے سفرِ دہلی کے متعلق ''شاہ گلشن'' کا بھی اکثر ذکر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ولؔی کو ''ریختہ'' میں شعر گوئی کا مشورہ دیا تھا۔ یہاں اس موقع پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر ولؔی کو دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اور شاہ گلشن کون تھے؟ اور انھوں نے ولؔی کو ''ریختہ'' میں شعر گوئی کا مشورہ کیوں دیا؟ ان سوالوں پر غور وفکر کرنے سے ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس زمانے میں ''دہلی'' دار السلطنت تھا۔ اور شعراء حضرات درباروں سے خود کی ذاتِ گرامی کو منسوب کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے اور انھیں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شاید ولؔی نے بھی اپنی قسمت آزمائی کی غرض سے سفرِ دہلی کا قصد کیا ہو، ورنہ دہلی کے سفر اور ''شاہ گلشن'' کے مشورے سے اور کوئی دوسری بات اخذ نہیں ہوتی اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ولؔی نے ''مدرسۂ علویہ'' میں داخلہ سے قبل ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تعلیمی زندگی میں بھی شعر وسخن میں سعی بلیغ کرتے رہے ہوں اور دکن واپس لوٹنے پر اپنی زندگی کا وہ تخلیقی سرمایہ جو شاید ایک بیاض کی شکل میں انھوں نے محفوظ رکھا ہو اُسے لے کر ''دہلی'' پہنچے تا کہ کسی امراء، رؤسا یا دربار تک رسائی حاصل کی جاسکے تا کہ زندگی کے گز واقعات کے لئے ایک مستقل آمدنی یا وظیفہ کا ذریعہ مقرر ہو جائے تا کہ فکرِ معاش کی پریشانیوں سے نجات حاصل ہوسکے۔

''شاہ گلشن'' کے مشورے سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ ولؔی جب پہلی مرتبہ دہلی پہنچے اور جب اُنھوں نے اپنا کلام سنایا ہوگا، جس پر دکنیت اور دکنی زبان کے گہرے اثرات نیز فارسی زبان وادب کے گہرے اثرات مرتسم تھے جو عوام الناس یا امراء ورؤسا کو اپنی جانب نہ کھینچ سکے ہوں اور انھیں کوئی داد وتحسین حاصل نہ ہوئی ہو، کیوں کہ یہ ولؔی کی شاعری کی کمسنی کا زمانہ تھا اور ابھی وہ نشو ونما کے اعلیٰ ترین مدارج پر نہیں پہنچی تھی۔ اس میں اتنی کشش پیدا نہیں ہوئی تھی اور اس قلیل مدّت میں ان کی شاعری میں وہ کمال پیدا نہیں ہوا تھا جو ایک عمر کی سعی کے بعد لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ممکن ہے ''شاہ گلشن'' نے ولؔی کا کلام سنا ہوگا چوں کہ اس زمانے میں فارسی شاعری پر زوال کے آثار شروع ہو چکے تھے اور زبانِ اردو جسے اس زمانے میں ''ریختہ'' کے

نام سے پکارا جارہا تھا، اس کا چلن ہر طرف عام ہوتا جارہا تھا۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''شاہ گلشن'' نے ولی کو مشورہ دیا جیسا کہ میر تقی میر اور قایم چاندپوری کا بیان ہے کہ شاہ صاحب ہی نے ولی کو ''ریختہ گوئی کی ترتیب دلائی'' میر حسن، علی ابراہیم خاں نساخ اور قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے کہ اُن سے ''استفادہ'' کیا فائق نے بھی رسالہ ''نور المعرفت'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے ''شاگرد'' تھے۔ ولی اور شاہ گلشن کے تعلقات ایک علیحدہ بحث ہے جس پر تفصیلی بحث آگے کے باب میں کی گئی ہے۔

غرض ولی شاہ گلشن سے ''مشورۂ سخن'' کر کے (جیسا کہ روایت بیان کی جاتی ہے) واپس دکن آجاتے ہیں۔ اب ولی کے افکار میں ایک تغیّر پیدا ہو چکا تھا اور وہ اپنی شاعری کی ان روایتی بنیادوں اور اندازوں سے کنارہ کش ہوتے ہوئے انھوں نے نئی بنیادوں پر اپنی شاعری کا قصر رفیع الشان بنانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اور سفرِ دہلی سے واپسی کے بعد دہلی کے شاعرانہ ماحول، ادبی دلچسپیوں، عوام کی ذہنی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ولی نے شاعری کی دیرینہ روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنے افکار کے دھارے کو یکسر موڑ دیا۔ اور اپنے کلام کو مقبولیت کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے لئے نت نئے تجربات کئے اور اپنی شاعری میں وہ تمام خوبیاں پیدا کیں جو ایک کہنہ مشق شاعر میں پائی جاتی ہیں۔ غرض دہلی کے پہلے سفر نے ولی کی شاعری اور زندگی کو زبردست متاثر کیا۔ بعض علماء نے ولی کے اس پہلے سفر کے متعلق لکھا ہے کہ دلی کا سفر چند روزہ اور گزران معلوم ہوتا ہے سورت اور احمد آباد میں البتہ ان کی عمر کا معتد بہ حصّہ ختم ہوا۔ ۷۸ ولی کے دہلی کے سفر سے واپسی پر ''شاہ گلشن'' سے ہوئی ملاقات اور مبینہ مشورے پر بھی بہت بحثیں ہوئی ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ولی کی ملاقات ''شاہ سعد اللہ گلشن'' سے نہ ہوتی تو کیا ولی کی شاعری میں نیا انقلاب پیدا نہ ہوتا۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کا بیان معنی خیز ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''صرف اتنی سی بات زبان میں اتنے بڑے تغیر کا باعث نہیں ہوسکتی اس کی اور بھی وجوہ ہیں''۔ ۷۹

خیر وجوہات جو بھی رہی ہوں ولی غالباً ناکام و نامراد ہوکر دکن کو لوٹ گئے۔ یہ پہلا سفر ۱۷۰۰ء میں عمل میں آیا تھا اس بات پر سبھی متفق ہیں۔ ولی کے سفرِ دہلی کے متعلق عیسوی ۱۷۰۰ء میں کسی دیوان کا ذکر نہیں ملتا لیکن اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے جیسا کہ راقم السطور کا خیال ہے، ولی جب پہلی مرتبہ دہلی گئے تو اپنے ابتدائی کلام سے وہ تاثر پیدا نہ کرسکے اور اپنی شاعری اور کلام کی بنیاد پر وہ کوئی ایسا مقام حاصل نہیں کرسکے جیسا

کہ انھوں نے توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ یوں ولی کو اپنی کس مپرسی کا شدّت سے احساس ہوا اور انھیں اپنی شاعری میں وہ دہلوی عوام کی ذہنی ضرورتوں کی کمیوں کا احساس ہوا، لہذا انھوں نے اپنی شاعری کے رنگِ سخن کو فارسی روایات کے مطابق ڈھالنے کا عمل شروع کردیا۔ اور جب ولی اس رنگِ سخن میں آگے بڑھے تو ان کے کلام کا وہ لازوال سرچشمہ وجود میں آیا جس نے انھیں ''اردو غزل کا بابا آدم'' کہلانے کا مستحق قرار دیا۔

نورالحسن ہاشمی نے ولی کے سفرِ دہلی کے متعلق لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''پہلے یہ خیال یا جاتا تھا کہ ولی دوبارہ دلّی گئے ایک تو ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں اور دوسری بار ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں یعنی ''سلطان محمد شاہ'' کے زمانے میں یہ غلطی اس شعر سے اور بھی تائید حاصل کرتی ہے جو آزاد نے ولی کے نام سے ''آبِ حیات'' میں درج کردیا ہے''۔

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین

جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

وہ مزید آگے لکھتے ہیں کہ۔۔۔

> ''دیوانِ ولی میں نہ یہ شعر ہے نہ ہی محمد شاہ کا کہیں ذکر اور یہ شعر دراصل مضمون کا ہے اور یوں ہے۔''

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین

جو کہو کوئی محمد شاہ سوں [۸۰]

ولی کے دوبارہ دہلی جانے کی بابت میں بڑی چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ولی کے ''دیوان'' کا دہلی جانے کا ذکر ملتا ہے۔ جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''جب ولی کا دیوان جلوس محمد شاہی کے دوسرے سال ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں دلّی پہنچا اور وہاں کے شعراء نے اس میں وہ رنگ ونور دیکھا، جن کو دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستی تھیں، تو انھوں نے بھی فارسی کو چھوڑ کر اسی رنگِ سخن میں پیروی شروع کردی''۔

اصل عبارت یہ ہے۔

''در سنہ دویم فردوس آرام گاہ ''دیوانِ ولیؔ'' در شاہ جہاں آباد آمدہ واشعارش بر زبانِ خورد وبزرگ جاری گشتہ''۔ ۸۱؎

تذکرہ ''مخزن نکات'' میں لکھا ہے

''دراصل ۲ ھ جلوس محمد شاہی یعنی ۱۱۳۱ھ میں ولیؔ کا مکمّل دیوان دلّی پہنچا تھا۔''

ولیؔ کا دیوان ۱۱۳۱ھ میں دہلی پہنچا جیسا کہ تذکروں میں مذکور ہے۔ کیا ولیؔ خود اپنا دیوان لے کر دہلی پہنچے تھے؟ یا کسی کے ہاتھوں سے بھجوایا تھا؟ اگر خود ہی گئے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء تک ولیؔ زندہ تھے۔ کوئی شاعر اپنی تمام عمر کا تخلیق سرمایہ جو اس کی تمام زندگی کا حاصل ہو اور جس کی اس نے اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ہو اور جو اس کی تمام زندگی کا سرمایۂ حیات ہو، بھلا کسی کے اعتماد پر کیسے دے سکتا ہے؟ کہ جاؤ میرا دیوان دہلی پہنچا دو اور لوگوں میں میرا کلام عام کردو یا سناؤ، یہ ممکن ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہی ماضی میں ایسی کوئی نظیر ملتی ہے کہ کس شاعر کا دیوان کوئی دوسرا شخص ایک مقام سے دوسرے مقام متعارف کرانے لے گیا ہو۔ اور ماضی تا حال ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس طرح کے کسی کام پر کسی شاعر نے کسی شخص کو معمور کیا ہو۔ اس بات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ولیؔ بذاتِ خود دوبارہ مع اپنے دیوان دہلی پہنچے اور اس وقت ان کے بقید حیات ہونے کا یہ قطعی ثبوت ہے۔

حالاں کہ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ نے اپنی کتاب ''ولیؔ گجراتی'' میں ولیؔ کی تاریخِ وفات ۴رشعبان ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۹ء بتائی ہے۔ لیکن اس کے لئے انھوں نے کوئی سند نہیں دی ہے۔ اور مذکورہ تاریخِ وفات کے متعلق ایک قطعہ بھی درج کیا ہے۔ جو مندرجۂ ذیل ہے۔

مطلع دیوان عشق سید اربابِ دل　　　والی ملکِ سخن صاحبِ عرفان ولیؔ

سال وفاتش خرد از سر الہام گفت　　　باد پناہِ ولیؔ ساقیِ کوثر علی

آخری مصرع کے اعداد ۱۱۱۸ھ ہوتے ہیں لیکن تاریخ گو نے سر الہام سے تعمیہ کر کے ۱۱۱۹ھ پورا کیا ہے۔ ولیؔ کی وفات کے متعلق سیّد ظہیر الدین مدنیؔ نے ایک ''اعراس نامہ'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ جسے سیّد منظور حسین علویؒ کی مملوکہ بیان کیا گیا ہے۔ اس ''اعراس نامہ'' میں یہ تاریخ دیکھنے کو ملتی ہے۔

''ولی نے ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۹ء میں بتاریخ ۴رشعبان بہ وقت عصر بہ مقام احمد آباد انتقال کیا۔'' ۸۲؎

مدنی صاحب وَلی کے مدفن کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں کہ۔۔۔

"اس (وَلی) کو اس کے جدّی قبرستان نیلی گنبد میں دفن کیا گیا اس کی قبر پر چینی کے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں اس لئے یہ چینی پیر کے نام سے مشہور ہے" ۸۳

وَلی کی وفات کے متعلق جناب مولوی عبد الحق صاحب نے بھی مذکورہ "قطع تاریخ" کی تائید کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ ایک مدّت کی جستجو کے بعد اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے کہ وَلی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ دراصل مولوی عبد الحق نے مصحفی کے تذکرے کے حوالے سے اپنی تحقیق کو تقویت بخشتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

"بعض اصحاب نے اس بیان کو دیکھ کر غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ وَلی محمد شاہ کے عہد میں دلّی گیا تھا حالانکہ اس میں صاف طور پر دیوان کے پہنچنے کا ذکر ہے نہ کہ وَلی کے جانے کا"۔ ۸۴

وہ مزید آگے لکھتے ہیں کہ۔۔۔

"یہ سب تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وَلی دلی گیا تھا اس کا دوبارہ دلّی جانا جیسا کہ بعض صاحبوں نے بیان کیا ہے ثابت نہیں ہوتا غالباً اس شعر سے جو ذیل میں درج ہے۔۔۔

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں" ۸۵

غرض وَلی کی وفات جیسا کہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور مولوی عبد الحق کا بیان ہے کہ وَلی کی وفات ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۹ء ہوئی۔ راقم الحروف کے خیال میں درست نہیں ہے۔ کیوں کہ وَلی نے اپنا پہلا سفر دہلی ۱۷۰۰ء میں کیا تھا اس وقت ان کے کلام کا ذخیرہ اتنا نہیں تھا یا ایسا پُر کشش نہیں تھا کہ دہلی کے باشندوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا لہٰذا حضرت شاہ سعد اللہ گلشن کے مبیّنہ "مشورۂ سخن" پر عمل پیرا ہونے کے بعد ۱۷۰۹ء تک کلام کا اتنا واضح ذخیرہ تخلیق کر ڈالیں یہ بات کچھ عقلِ سلیم میں نہیں اترتی، اس لئے وَلی کے کلام کے اس کثیر ذخیرہ کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وَلی نے اپنے پہلے سفرِ دہلی اور ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی کی تحریر کردہ وفات ۱۷۰۹ء کے ان آٹھ یا نو برسوں کے قلیل عرصے میں اتنا سارا کلام لکھ ڈالیں، یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وَلی ۱۷۰۹ء مین بقیدِ حیات تھے اور اپنی شاعری کو عروج کی منزل

تک پہنچانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس لئے یہ بات مصدق ہے کہ ولؔی نے عمرِ طبعی کو پہنچ کر انتقال کیا ہوگا۔ ورنہ صرف آٹھ یا نو برسوں میں وہ اتنا سارا کلام لکھ ڈالتے اور اپنے کلام کا دیوان بھی مرتب کر لیتے اور کامیابی کی اس انتہا کو بھی چھو لیتے جس کا ہر شاعر متلاشی ہوتا ہے۔ اس لئے اس بات میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ عیسوی سن ۱۷۰۹ء تک وہ حیات تھے اور ولؔی کا دیوان ان کی زندگی میں مکمل اور اور مرتب ہو چکا تھا جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

شاعروں میں اپس کا نام کیا
جب ولؔی نے کیا یوں دیوان جمع

ولؔی کی وفات کے متعلق محققین نے کئی تاریخیں پیش کیں ہیں اور لکھا ہے کہ ولؔی کا انتقال اغلباً ۱۷۰۷ء/ ۱۷۰۸ء کے علاوہ ان کے انتقال کی تاریخیں ۱۷۲۰ء/ ۱۷۲۵ء حتّٰی کی ۱۷۳۵ء اور ۱۷۴۱ء تک تحریر کی گئی ہیں۔ مذکورہ بحث میں ولؔی کے ۱۷۰۹ء تک زندہ ہونے کے قطعی دلائل موجود ہیں۔ ولؔی جب پہلی مرتبہ دہلی پہنچے تھے اس وقت اپنے کلام سے وہ تاثر پیدا نہیں کر سکے تھے، جس کے وہ خواہش مند تھے اور جس آرزو کو لے کر انھوں نے اس سفر کا قصد کیا تھا وہ مقصد بر نہ آیا۔ اس وقت غالباً ان کا کلام بیاض کی شکل میں ان کے پاس رہا ہوگا یا متفرق کاغذات میں انھیں نے اپنے دل کی آواز کو الفاظ کا جامہ پہنا کر محفوظ رکھا ہوگا، لیکن ان کی مراد بر نہ آئی، اور وہ ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے اور اس واپسی کے بعد غالباً انھوں نے اپنی تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کا مستحکم ارادہ کر لیا ہو اور اپنی شخصیت کو کامیابی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کا مکمل عزم کیا ہو اور اس طرح اپنے کلام میں سعی بلیغ کرتے رہے اور اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے کلام میں مشق کرتے رہے اور اس مشق کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ان کی نوکِ قلم سے ایسا لازوال کلام تخلیق ہوا جس کی عظمت اور بلندی آج تک برقرار ہے۔

ولؔی نے اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر دوبارہ دہلی کے سفر کا قصد کیا اور اس مرتبہ وہ ایک مسلح سپہ سالار اور تجربہ کار جنگجو کی حیثیت سے اپنے تمام فن پاروں کے ساتھ ۱۷۱۹ء میں عازمِ سفر ہوئے۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ولؔی کا دیوان ۱۷۱۹ء میں دہلی پہنچا اس سے یہی نتیجہ نکالا جانا چاہیئے کہ ولؔی خود ہی اپنے کلام سے لوگوں کو روشناس کرانے کی غرض سے اپنا دیوان لے کر دہلی پہنچے ہونگے اور جیسا کہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن نے جو مشورہ دیا تھا اُس پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے اپنی شاعری کو

اُسی رنگ میں ڈھالا ہو تو ممکن ہے جب وؔلی دوبارہ دہلی پہنچے ہوں اس وقت دوبارہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات کی ہو اور انھوں نے ہی دہلی والوں میں وؔلی کے کلام کو مشتہر کرنے میں مدد کی ہو ورنہ دہلی میں وؔلی کے دیگر کوئی تعلقات کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لہذا یہ ماننے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہوتا کہ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن کے توسّط سے ہی وؔلی کا کلام دہلی میں رواج اور شہرت پایا ہوگا۔ وؔلی کا کلام جب دہلی والوں نے سنا تو گھر گھر شاعری کا چرچا ہو گیا چاروں طرف وؔلی کے کلام کی دھوم مچ گئی۔ نوجوانوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا، فقیرانہ شوق رکھنے والوں نے وؔلی کے کلام کو اپنا موضوع بنایا، نیز محفلِ سماع میں بھی وؔلی کا کلام گایا جانے لگا۔ قوالوں نے اُسے اپنی قوّالیوں کی دھنوں میں برتنا شروع کر دیا ان حالات کی منظر کشی محمد حسین آزؔاد نے ''آبِ حیات'' میں کچھ اس طرح کی ہے۔

> ''غرض جب ان کا دیوان دلّی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذّت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے، قوّال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے لگے، ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے، جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا''۔ ۸۶؎

وؔلی نے دوبارہ اپنے سفرِ دہلی کے وقت وہاں کتنا قیام کیا اس کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی البتہ ان کے کلام کی مقبولیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انھوں (وؔلی) نے چار تا چھ ماہ لگتا ہے کہ قیام کیا ہوگا کیوں کہ ایسا ممکن نہیں کہ وؔلی اپنے دیوان کے ساتھ دہلی پہنچے ہوں اور راتوں رات یا چند روز میں یہ مقبولیت ان کے حصّے میں آ گئی ہو، بلکہ وؔلی نے دانستہ طور پر ایسی کوشش کی ہوگی اور اس دور میں منعقد ہونے والی چھوٹی چھوٹی شعری نشستوں میں پہلے پہل اپنا کلام سنایا ہوگا اور ایسا بھی ممکن ہے کہ اس وقت کے دیگر رؤسا یا امراء تک رسائی حاصل کرنے کا بھی ارادہ کیا ہو اور یہ موقع انھیں میسّر بھی آیا ہو اور وؔلی کے کلام کی شہرت آہستہ آہستہ دہلی کی تمام فضاء پر چھا گئی۔ اور وؔلی کے کلام کا کچھ ایسا رنگ پیدا ہوا کہ اس وقت کے دیگر مقامی دہلوی شعراء پر بھی وؔلی کا غلبہ ہو گیا اور انھوں نے وؔلی کی طرز اور اسلوب پر اپنی غزلوں کی ابتداء کی اور وؔلی کے کلام کو معیار بنا کر اُسی کی روش پر گامزن ہو گئے۔

وؔلی کے دوبارہ دہلی کے سفر کے متعلق سبھی محققوں نے لکھا ہے۔ اور سبھی نے اس بات کو تسلیم بھی کیا

ہے کہ انھوں نے ۱۷۱۹ء میں دوبارہ دہلی کا سفر کیا جیسا کہ راقم کا خیال ہے کہ ولؔی نے تقریباً چار تا چھ ماہ تک دہلی میں قیام کیا ہوگا اور اس کے بعد واپس اپنے مولِد و مسکن کی راہ لی ہوگی۔ سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے ولؔی کے گجراتی الاصل ہونے اور اُنھیں گجرات کا باشندہ ثابت کرنے میں بڑی ہی طویل بحث کی ہے اور اپنے دلائل سے اُسے گجراتی ثابت کیا ہے اور اس کوشش میں ولؔی کے مزارِ مبارک کی بھی سرزمینِ احمد آباد کے ''نیلی گنبد'' قبرستان میں نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح سرزمینِ اورنگ آباد میں ولؔی کا مزار پایا جاتا ہے۔ اردو کے اس بلند پایہ شاعر کی یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ لوگوں نے نہ انھیں احمد آباد کا رہنے دیا اور نہ ہی اورنگ آباد کا اور یہ بدنصیب شاعران دو علاقوں کی سرحدوں میں بنٹ گیا۔

ولؔی کی وطنیت کو متنازع فیہ بنانے میں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی کا مرکزی کردار رہا ہے اور سوائے مدنؔی صاحب کے گجرات کے کسی محقق نے اس عنوان پر قلم نہیں آیا۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی کے تمام دلائل کی تردید تفصیل سے گذشتہ اوراق میں کی ہیں۔ مدنؔی صاحب نے اپنی تحقیق کو آخری جامہ پہنانے کی خاطر گجرات کے شہر احمد آباد میں ولؔی کے مزار کی نشاندہی بھی کی ہے۔ راقم الحروف نے ولؔی کے اُس مبینہ مزار کی زیارت بھی کی ہے اور وہاں کے ''مُجاور'' سے اس کے متعلق معلومات بھی دریافت کی ہیں۔ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے ولؔی کے متعلق دو کتابیں شائع کیں۔ ایک ''ولؔی گجراتی'' (۵۱-۱۹۵۰ء) دوسری ''سخنورانِ گجرات'' (۱۹۸۱ء) ان دونوں کتابوں میں مدنؔی صاحب نے ولؔی کو ''گجراتی'' ثابت کرنے میں اپنی قلم کی تمام جولانیاں صَرف کردیں۔ اس سلسلے میں ہم ادباً عرض کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ہمیں ایسی توفیق نہ دے کہ ہم اپنے بزرگوں کے کردار کو مسخ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے مذکورہ دونوں کتابوں میں ولؔی کے متعلق بیان کردہ تمام باتیں نامعلوم حالات واسباب کے تحت درج ہیں اور راقم الحروف کی مدنؔی صاحب کی انہی تحریروں سے بحث ہے۔

ولؔی کے مزار سے متعلق جب تک حقائق کا علم نہ ہو بات ادھوری رہتی ہے۔ اور ولؔی کے احوال واقعی سے بے خبری بھی لہذا ضروری ہے کہ ان تمام حقیقتوں کی تہہ میں جائیں جن سے بات بالکل واضح ہو کر سامنے آسکے۔

ولؔی کا مزار احمد آباد کے شاہی باغ علاقے میں ''نیلی گنبد'' قبرستان میں قرار دیا جاتا ہے۔ اس قبرستان کا طول وعرض تقریباً ایک کلومیٹر ہے۔ اور یہ قبرستان احمد آباد کی فصیل شہر سے باہر ہے۔ جہاں احمد آباد کے بہت

سے پیر و مرشد کے مزارات ہیں۔ انھی مزارات میں شاہ ولؔی گجراتی اور حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے والد شاہ نصر اللہ کا مزار بھی واقع ہے۔ حضرت شاہ نصر اللہ نے قبل انتقال وصیّت کی تھی کہ۔۔۔

''میری قبر پر کسی طرح کا کوئی گنبد وغیرہ نہ بنایا جائے کیوں کہ یہ نیلا آسمان ہی میرا گنبد ہے''۔

لہٰذا آپ کے انتقال (۲۰ محرم ۹۵۸ھ) کے بعد انھیں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اسی وقت سے یہ قبرستان ''نیلی گنبذ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

ولؔی بھی اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔ ''نیلی گنبذ'' کا قبرستان جہاں ولؔی مدفون ہیں وہیں سے کچھ دوری پر ''دریائے سابرمتی'' بھی گذرتی ہے۔ اور جو قبرستان کا آخری حصّہ تھا۔ علوی خاندان کے اس آبائی قبرستان میں حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے والد حضرت شاہ نصر اللہؒ کی مذکورہ وصیّت کی وجہ سے ان کے بعد اس خاندان کی کسی بھی بزرگ ہستی کے مزار پر گنبد نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ولؔی کے مزارِ مبارک پر بھی گنبد نہیں ہے۔ البتہ مزار کے گرد چہار دیواریں ضرور بنادی گئی ہے۔ اسی قبرستان میں ایک خاندان کئی پشتوں سے مقیم ہے۔ جو ان بزرگوں کے مزارات پر بحیثیت مُجاور اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔

احمد آباد شہر کے لوگ ''نیلی گنبذ'' کے بہت ہی معتقد ہیں لہٰذا زمانۂ قدیم سے ہی لوگ اس ''نیلی گنبذ'' کے قبرستان میں واقع ان بزرگ ہستیوں کے مزار پر فاتحہ خوانی اور گلہائے عقیدت پیش کرتے رہے ہیں اور نذر و نیاز کا سلسلہ بھی زمانۂ قدیم سے ہی جاری اور ساری ہے۔ چونکہ ولؔی اپنی آخری عمر میں ہندوستان پیمانہ پر بہت مقبول و معروف تھے۔ لہٰذا ان کے انتقال کے بعد جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ولؔی اسی قبرستان میں مدفون ہوئے، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس قبرستان میں آنے والے معتقدوں نے انھیں بھی پیر و مرشد کا درجہ عطا کردیا اور آہستہ آہستہ وہ ایک شاعر نہ رہ کر ایک ولی صفت اور پیر و مرشد کی حیثیت سے مشہور ہوگئے اور رفتہ رفتہ ولؔی کے عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور ایک کثیر تعداد میں لوگ ان کے معتقد ہوگئے اور اپنی حاجت کو پورا کرنے اور اپنی مرادوں کو پانے کے لئے ان کے مزار پر دُعائیں مانگنے لگے۔ شہر احمد آباد کے صرف ادبی حلقوں کے لوگ ہی ولؔی کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، جب کہ ولؔی اسی شہر کے دیگر ناخواندہ اور غیر مسلم لوگوں میں ایک پیر کا درجہ رکھتے ہیں اور ایسا شاید ان کے نام کی وجہ سے بھی ہوا ہو۔ ولؔی کے بہت سے عقیدت مند روزانہ قبلِ مغرب ان کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں اور ان کے مزار پر رکھی ہوئی چندہ پیٹی میں

اپنی حیثیت کے مطابق امداد بھی کرتے ہیں اور یہ سلسلہ عصر کی نماز کے بعد سے لے کر مغرب کی نماز کے بعد تک جاری رہتا ہے۔

''نیلی گنبد'' قبرستان میں مقیم خاندان کے افراد کی کئی پشتیں وؔلی کے مزار پر بھی مُجاور کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ راقم السطور نے اس خاندان کے آخری مجاور محمد علی بن حسن علی، بن قدرت علی، بن محبوب علی سے جب وؔلی کے متعلق معلومات حاصل کیں تو انھوں نے وؔلی کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ ہماری گذشتہ چھ، سات پشتیں اس مزارِ مبارک سے عقیدت رکھتی ہیں اور ہماری مجاوری کا یہ پیشہ ورثے میں چلا آرہا ہے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ''بابا شاہ وؔلی گجراتی'' بہت بڑے پیر و مرشد ہیں۔ دورانِ گفتگو یہ بھی جاننے کو ملا کہ اس خاندان کے بہت سے لوگوں کو ''بابا وؔلی'' خواب میں آیا کرتے تھے اس کے متعلق معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وؔلی گھوڑے پر سوار، سفید لباس میں ملبوس، ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لئے ''نیلی گنبد'' کے قبرستان میں نظر آتے تھے۔ اس خاندان کی ایک خاتون کریمہ بی بی ہیں جن کی زبانی معلوم ہوا کہ احمد آباد میں عیسوی سن ۱۹۶۳ء میں ''دریائے سابرمتی'' پر ایک پُل شاہی باغ کے نزدیک بنایا جارہا تھا (جو آج شھاش پل کے نام سے مشہور ہے) اس پُل کی تعمیر کی وجہ سے راستوں کی توسیع کا بھی عمل شروع ہوا، اور اس عمل کی وجہ سے مزارِ وؔلی بھی اس راستے کی توسیع کی زد میں آرہا تھا۔ لہٰذا اس وقت کے کمشنر کے حکم صادر کیا کہ اس مزار کو منہدم کردیا جائے لیکن اسی رات میں وؔلی کمشنر کے خواب میں آئے اور طیش میں آکر انھیں خوب اُٹھا اُٹھا کر پٹکا اور اس گستاخی کے لئے خوب ڈانٹا، بالآخر کمشنر صاحب اپنی غلطی پر نادم ہوئے، اور دوسرے روز ہی علی الصبح مزارِ وؔلی پر حاضری دی اور گلہائے عقیدت پیش کر کے اپنی اس غلطی کی معافی مانگی اس طرح پھر مزارِ وؔلی کو درمیانِ راہ چھوڑ کر مزار کے دونوں جانب سے راستوں کو بنایا گیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ انھوں نے بتایا کہ عیسوی سن فروری ۲۰۰۱ء میں جب اچانک احمد آباد میں قومی فساد پھوٹ پڑا اس وقت ایک رات کریمہ بی بی اپنے بستر پر دواز تھیں اور سونے کی کوشش کر رہی تھیں، جب آنکھ لگی اور نیند کا غلبہ ہوا تو اسی غنودگی کے عالم میں انھوں نے بابا وؔلی کو سفید لباس میں ملبوس، گھوڑے پر سوار دیکھا، جو ان سے بڑے ہی دردمند لہجے میں کہہ رہے تھے کہ لوگ میرے مزار کو منہدم کرنے والے ہیں آپ لوگ انھیں روکیں۔ لیکن دوسرے ہی روز فساد کچھ ایسا شدید ہوا کہ مت پوچھو ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار عام ہوگیا اور شہر احمد آباد آگ کے شعلوں میں لپٹ گیا۔ اور آگ کی ان لپٹوں میں وؔلی کا مزار بھی محفوظ نہ رہ سکا

اور شر پسندوں کی ایک بڑی بھیڑ نے ولی کے مزار کو منہدم کر دیا اور صرف منہدم ہی نہیں کیا بلکہ اس کی بنیادوں کو بھی کھود ڈالا۔ اور اس مزار کے سنگ ریزوں کو اپنے پاؤں کی ٹھوکروں سے تہس نہس کر ڈالا۔

جس رات ولی کا مزار شہید کیا گیا اسی رات ولی دوبارہ کریمہ بی بی کے خواب میں وارد ہوئے اور سفید لباس میں ملبوس، گھوڑے پر سوار اپنا اترا ہوا چہرہ لئے وہ کریمہ بی بی سے کہہ رہے تھے کہ ''ان بے دردوں نے میرے مزار کو منہدم کر دیا ہے اور اس کی بنیادوں کو کھود کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے یہ میرا آشیانہ تھا جو برباد کر دیا گیا ہے لیکن میں تو یہیں اسی ''نیلی گنبد'' کے قبرستان میں ہی رہوں گا۔''

مذکورہ بالا دونوں خواب کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جیسے ولی ایک زبردست خدارسیدہ بزرگ ہستی تھی جو اپنی ذات سے کمالات دکھا سکتی تھی۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جسے ذہن آسانی سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ کہاں ایک شاعر اور کہاں ایک ولی کی صفات۔ ولی شاید دنیا کے واحد ایسے شاعر ہوں گے جن سے متعلق اس طرح کی آسانی سے عقل میں نہ اُترنے والی باتوں کے صفات وکمالات کا مالک بتایا گیا ہو۔ راقم السطور کا ماننا ہے چونکہ اس قبرستان اور اس کے آس پاس کے مقامات میں متعدد مقدس ہستیوں کے مزارات ہیں ممکن ہے کریمہ بی بی کے خواب میں آنے والی کوئی ولی جیسی ہی خدارسیدہ ہستی ہو جسے غلطی سے ولی مانا جا رہا ہے۔

شاہ ولی کا مزار، مزار نہ ہو کر ایک پرانی قسم کی قبر تھی جسے اینٹ اور چونے سے بنایا گیا تھا اور صرف یہی واحد قبر تھی جسے کسی زمانے میں ''نیلی گنبد'' قبرستان کے مجاوروں نے قبر کی احاطہ بندی کی خاطر دو ڈھائی فٹ دیوار اُٹھا دی تھی۔ ولی کے مزار کی احاطہ بندی ہو جانے سے شاید اس کی قدر و قیمت میں کچھ اضافہ ہوا ہو، کیوں کہ ولی کے اس مزار کے دونوں جانب رہ گزر بھی گزرتی تھی اور شہر احمد آباد میں داخل ہونے کا اس زمانے میں یہ ایک راستہ تھا جسے ''دریائے سابرمتی'' عبور کرنے کے بعد اسی راستے سے ہو کر شہر میں داخل ہوا جاتا تھا۔ چونکہ زمانۂ قدیم میں ''نیلی گنبد'' قبرستان کے اطراف احاطہ بندی یا چہار دیواری نہیں تھی، لہذا، دہلی، اجمیر، آبو، راجستھان وغیرہ کے علاقوں کی طرف سے آنے والے لوگ اسی راستے سے ہو کر احمد آباد میں داخل ہوتے تھے احمد آباد کی بنیاد ۱۴۱۱ھ میں جب اس کے اطراف بارہ (۱۲) دروازہ بنائے گئے تو اسی ''نیلی گنبد'' قبرستان میں سے گزر کر لوگ اس شہر احمد آباد میں داخل ہوتے تھے۔ اسی قبرستان کے قریب جو دروازہ ہے وہ دہلی، اجمیر، راجستھان وغیرہ کی طرف سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے ''دہلی دروازے'' کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو آج بھی اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۶۵۰ء کے بعد تاجران ومسافران اور بعض فوجی دستے اسی راستے سے ہوکر شہر احمد آباد میں داخل ہوتے تھے۔ اسی راستے سے متصل ''نیلی گنبد'' کا قبرستان ہے اور مزارِ ولؔی بھی اسی راستے کے دہانے پر واقع ہے۔ جہاں زمانۂ قدیم میں قبر کے سرہانے پر ایک وسیع سایہ دار نیم کا درخت تھا جہاں دہلی، آگرہ اور اجمیر وغیرہ کی جانب سے آنے والے مسافر وہاں ٹھہر جاتے تھے۔ اس وقت شاید ان مسافروں میں سے بہت سے لوگ ولؔی سے متعارف نہیں رہے ہوں گے اور اپنی مسافرت کی تھکان دور کرنے کے لئے کچھ وقفہ یہاں ٹھہر جاتے تھے، تاکہ تازہ دم ہوکر آگے بڑھ سکیں۔ انھیں مسافران وتاجران وغیرہ نے غیر شعوری طور پر ولؔی کو کوئی پیر ومرشد تصوّر کرلیا۔

ولؔی کے مزار کے مجاوروں نے جو چھ، سات پشتوں سے مُجاوری کی خدمت انجام دے رہے تھے ایک کے بعد دیگر کے ورثے میں آنے والی مجاوری نے اُن کو (ولؔی کو) شاعر ہونے کو بالائے طاق رکھ کر انھیں زبردست ولی، پیر، بابا وغیرہ کی حیثیت سے لوگوں کو متعارف کرایا۔ اور چونکہ یہ مزار راہ میں تھا لہذا وقت گزرنے کے ساتھ مسلسل آنے جانے والے لوگوں نے انھیں ولی ہی تصوّر کرلیا۔ چونکہ ہر شام چراغاں، اور مزار پر گلہائے عقیدت پیش کرتے رہنے سے ولؔی کی حقیقت پیر بابا کی سی ہوگئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ ان مُجاوروں کے خاندان میں ولؔی کے متعلق جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ اپنی ناخواندگی اور لاعلمی کی وجہ سے ان مُجاوروں نے کئی پشتوں سے ولؔی کو ایک شاعر نہیں بلکہ ایک زبردست اولیاء کا درجہ دے دیا۔ جو ان کے ذریعۂ معاش کی بہترین وجہ بن سکتی تھی لہذا شاید اسی وجہ سے ولؔی کے مزار پر اگربتی، چراغاں اور چادر چڑھائی جاتی رہی رفتہ رفتہ ولؔی شاعر نہ ہوکر اولیاء بن گئے۔

ولؔی کے مزار کے مُجاور جو چھ ساتھ پشتوں سے مجاوری کی خدمات انجام دے رہے تھے انھی میں گذشتہ تین چار پشتوں کے مجاوروں سے یہ غلطی شاید لاشعوری طور پر سرزد ہوئی ہے۔ جس وجہ سے آج کے نوجوان طبقے میں جن کا اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں نیز غیر مسلم عقیدت مندوں میں بھی ولؔی بحیثیت ایک ولی، پیر اور بابا کے مشہور ہیں۔ ولؔی کے مزار پر خاص طور سے بروز جمعرات کو عقیدت مندوں کا کافی ہجوم ہوتا ہے۔ اور مزار پر رکھی ہوئی چندہ پیٹی میں چراغی کے لئے لوگ اپنی حیثیت کے مطابق روپیہ پیسہ ڈالتے ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ شہر احمد آباد عقیدت مندوں کا شہر ہے اور یہاں بے شمار بزرگانِ دین مدفون ہیں۔ اس شہر کی بنیاد کے وقت بھی عظیم پیر ومرشد شیخ احمد کھٹو نیز دوسرے تین اور احمد جن

میں احمد آباد شہر کے بانی سلطان احمد شاہ بھی شامل ہیں۔ موصوف اپنے وقت کے پیر اور عالمِ دین تھے۔ شہر احمد آباد کے بانیوں میں چار احمدوں کے علاوہ بارہ باباؤں کا بھی ذکر آیا ہے۔ ۸۷ اس وجہ سے ابتداء سے ہی یہاں کے باشندے پیر، باباؤں کے بہت ہی معتقد رہے ہیں۔ یہاں ایسے بے شمار مزارات ہیں جن کے متعلق کوئی تاریخی شواہد نہیں ملتے، نہ تو ان کے نام کے متعلق کوئی مستند معلومات ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے سلسلے نسب نامہ ہی میسّر ہوتا ہے۔ جس وجہ سے ان مزارات کے متعلق کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی لہذا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اختراعی باتیں وجود میں آئی ہیں اور پھر سنی سنائی روایتی باتوں کو سن کر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ایسے مزارات کثرت سے پائے جاتے ہیں جن کے نام، سلسلے، مقام وغیرہ کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی، اسی وجہ سے ایسے مزارات کو ''غیبن شاہ'' یا ''پیر کمال'' وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہی شبہات ولؔی کے تعلق سے بھی سامنے آتے ہیں کہ کیا یہ مزار ولؔی کا ہی ہے یا کسی اور کا؟

احمد آباد شہر میں علاقہ شاہی باغ میں واقع ''ولؔی'' کے اس مزار کے متعلق جو حال دریافت ہوتا ہے اس سے یہ بات ہنوز تحقیق طلب رہ جاتی ہے کہ یہ مزار شاعر ''ولؔی'' کا ہی ہے۔ اس سلسلے میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اور سید منظور حُسین علویؒ المعروف حسینی پیر صاحب کی خط کتابت کا ذکر گذشتہ صفحات میں بالتفصیل آچکا ہے۔ جس میں مکتوب نمبر۲ میں قاضی صاحب نے اس طرح سوال اُٹھایا ہے۔

> ''ولؔی کی قبر کا جو حال آپ نے تحریر فرمایا ہے اس سے تو شبہ ہوتا ہے کہ فی الحال ان کی قبر کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے لیکن اگر آپ کو یقین ہو کہ یہی ان کا مزار ہے تو اس کا ایک فوٹو درکار ہے۔ ۸۸

مذکورہ بیان ۱۹۴۵ء کا ہے گویا ولؔی کے انتقال کے تقریباً تین و برس بعد بھی ان کے مزار سے متعلق قابل اعتماد شہادتیں نہیں ملتیں۔ اس لئے تاریخ وتحقیق ایسی لایعنی باتوں کو مسترد کر دیتی ہیں اور نہ ہی اس کی اجازت دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج ولؔی کا مزار احمد آباد (گجرات) میں کہاں ہے؟ آیا ''نیلی گنبد'' میں ہے یا گجرات کے کسی اور مقام پر؟ جیسا کہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنؔی نے حسینی پیر صاحب کے حوالے سے اپنی کتاب ''ولؔی گجراتی'' میں لکھا ہے۔

> ''حسینی پیر صاحب نے چند ایسی اپنے دستاویز فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جن پر ولؔی اور خاندان کے دوسرے ارکان کے دستخط ہیں اور ولؔی کا شجرۂ نسب

حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ تک ملتا ہے''۔ ۸۹؎

مذکورہ شجرۂ نسب نامہ کے مطابق ولؔی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن ولؔی کی وفات کو تین سو سال گزر جانے پر بھی ان تمام ادوار میں ولؔی کے تعلق سے کوئی دستاویز، کوئی ''محضر'' کوئی ''تمسک نامہ'' کی کسی دانشورانِ قدیم نے کوئی آگاہی نہیں دی ہے۔ حالانکہ گجرات میں سب سے قدیم کتب خانہ موجود ہے۔ جس میں سینکڑوں عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات، اسناد، محضر نامہ جات وغیرہ پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس کتب خانے میں بھی ایسا کوئی مخطوطہ ہے اور نہ تمسک نامہ اور نہ ہی ولؔی کے تعلق سے کوئی قدیم نسخہ جس میں ان کے خاندانی حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے جس آبائی قبرستان کا ذکر کیا جاتا ہے اور جو ''نیلی گنبذ'' کے نام سے مشہور ہے دراصل موصوف کا مدفن اس سے مختلف علاقے میں ہے اور جہاں آپ کا مزار پایا جاتا ہے وہ علاقہ آج بھی ''خان پور'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ولؔی نے جس ''مدرسۂ علویہ'' میں تعلیم حاصل کی وہ اسی علاقے میں واقع ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر ''نیلی گنبذ'' قبرستان حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کا آبائی قبرستان ہے اور جہاں آپ کے والد بزرگوار شاہ نصر اللہ کا مزار واقع ہے تو آپ (ولؔی) کا مزار اس آبائی قبرستان سے الگ کیوں ہے؟

دراصل ''مدرسہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ'' جہاں ولؔی نے تعلیم حاصل کی یہ جگہ تقریباً دو سو میٹر پر مبنی ہے اور اس سے متصل ایک چھوٹا سا قدیم قبرستان آج بھی ہے جہاں علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کا مزار واقع ہے اور اس مزار کے اطراف واکناف میں اس خاندان کے دیگر افراد کی سیکڑوں قبور آج کی تاریخ میں بھی محفوظ ہیں۔ اس قبرستان اور ''نیلی گنبذ'' کے قبرستان کے درمیان چار کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ تو کیا یہ دونوں قبرستان اسی خاندان کے ہیں اور اگر علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کا مزار یہیں اسی مدرسے کے قبرستان میں واقع ہے اور اس کے اطراف دیگر بہت سی قُبور موجود ہیں تو ولؔی کے مزار کی نشاندہی اس مدرسہ سے دور افتادہ مقام پر کیوں کی گئی؟ اور وہ بھی مشکوک حالات میں۔

گمان غالب ہے کہ یہ ''مدرسہ علویہ'' جس کے بانی علاّمہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ تھے۔ موصوف کی وصیت کی وجہ سے یہیں دفن کیا گیا ہو، کیوں کہ آپ کو اس مدرسہ سے بے انتہا محبت تھی آپ کے بعد آپ کے فرزند اور دیگر رشتہ داروں کے مدفن سے ممکن ہے اس مدرسہ کے پاس ایک دوسرا قبرستان بن گیا ہو۔ تاہم ولؔی کے مزار کے متعلق جو بھی شواہد پائے جاتے وہ تمام کمزور اور مشکوک ہیں۔ جس سے ولؔی کا مزار احمد آباد میں ہونا

قطعی ثابت نہیں ہوتا۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے کہ وؔلی نے ۱۷۱۹ء میں اپنے سفرِ دہلی کے بعد اپنے حقیقی وطن دکن کی راہ لی ہوگی اگر وؔلی احمد آباد میں آئے ہوتے اور ان کا انتقال احمد آباد میں ہی ہوا ہوتا اور اُنھیں علاّ مہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کے آبائی قبرستان نیلی گنبد میں دفن کیا گیا ہوتا تو اُن کے مزار پر ان کے نام کا کتبہ ضرور ہوتا، اور وہ مجاور حضرات جن کی کئی پشتیں اُس مبینہ مزار پر مجاوری کی خدمات انجام دے رہے ہیں، اردو کے اس بلند پایہ اور مشہورِ زمانہ شاعر کے متعلق لاعلمی کا اظہار نہ کرتے اور اس عظیم شاعر کو پیر یا بابا کے نام سے منسوب نہیں کرتے۔ اور نہ ہی وؔلی کی ذات وصفات کے متعلق اس قدر تاریکی اور گمراہی کا شکار ہوتے۔ وؔلی کے مدفن کے متعلق ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی اپنی کتاب ''وؔلی گجراتی'' میں اس طرح رقم طراز ہیں۔۔۔

''وؔلی کو اس کے خاندانی قبرستان نیلی گنبد میں دفن کیا گیا اس خاندان میں علاّ مہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان کے کئی بزرگوں کے مزارات ہیں۔ نیلی گنبد شہر سے کچھ فاصلہ پر ہے اور بمقام شاہی باغ واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مغلوں کے محلات ودیگر عمارتیں موجود ہیں۔ وؔلی کے مزار پر چینی کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں اس لئے یہ ''چینی پیر'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔'' ۹۰

مندرجہ بالا تحریر سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ چینی کے ٹکڑے کب اور کیوں لگائے گئے ؟ اس کی تعمیر میں کس نے حصّہ لیا ؟ اور اس کی تعمیر کس سن میں عمل میں آئی ؟ راقم الحروف نے جب وؔلی کے مزار کے مجاور ''محمد علی حسن صاحب'' سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے ''وؔلی ڈے'' ''Wali-day'' کا ذکر کیا جو غالباً ۱۹۶۴ء میں منایا گیا تھا۔ اس علاقے ''شاہی باغ'' میں ایک پُل تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام ''شبھاش پُل'' ہے۔ جس کی وجہ راستوں کو مزید کشادہ کیا گیا تھا اور یہ راستے وؔلی کے اُس مبینہ مزار کے دونوں اطراف سے گزرتے تھے۔ پُل کی تکمیل پر جب اس کے افتتاح کا عمل وجود میں آیا اس وقت غالباً وؔلی کے اس خستہ مزار کی مرمّت کا بھی خیال ابھرا کیوں کہ اس پُل کی رسمِ افتتاح ریاست کے اہم وزراء کے ساتھ اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ جناب مادھوسنگھ سولنکی کے ذریعہ انجام پانا تھا، لہٰذا اسی غرض سے اس مزار کو مزیّن کیا گیا اور رسمِ افتتاح کے ساتھ گورنر و وزراء نے وؔلی کے مزار پر حاضری بھی دی۔

یہ ایک حیرت انگیز المیہ ہے کہ وہ وؔلی جس کو اردو شاعری کا ''بابا آدم'' کہا جاتا رہا ہے اور جس نے

اردو شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ ایک شاعر نہ رہ کر ''پیر بابا'' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ جہاں عوام زیارت کو آتے تھے۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ اس مزار کا مجاور کئی پشتوں سے اپنی مجاوری کا دعویٰ کر رہا ہے اور اس مزار کے حقیقی حالات سے بھی ناواقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مجاور کے آباء واجداد نے اپنے بیٹوں کو اس مزار کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا؟ خواہ وہ روایتی انداز میں ہی کیوں نہ ہو؟ اور بیٹے نے اپنے بیٹے کو یعنی موجودہ مجاور کو بھی وہی حالات دہرائے ہوں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ موجودہ مجاور غیر تعلیم یافتہ وناخواندہ ہے اور اس مزار سے وابستہ مجاوروں کو ماہانہ اجرت پر رکھا گیا ہے۔

نفس مضمون کے تحت ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ولؔی کا تعلق حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ گجراتی کے خاندان سے ہوتا تو اس خاندان کے افراد ہی ولؔی کے اس مزار پر بحیثیت مجاور اپنی خدمات انجام دیتے جیسا کہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے مزار پر دیتے ہیں۔ جب کہ ولؔی کے مزار کی طرف سے عدم توجہی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شاعر ولؔی کا مزار نہیں بلکہ کسی ایسے گمنام شخص کا ہے جس کے متعلق تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں اور ان کے متعلق کسی مخطوطے، اسناد، تذکرہ جات، نسخہ جات، تاریخ وغیرہ سے کوئی روشنی نہیں ملتی اور نہ ہی احمد آباد یا گجرات کے دیگر کسی علاقے میں ولؔی کا کوئی مزار ہو ایسا کوئی ٹھوس تاریخی ثبوت ہی ملتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے ولؔی کی ولادت، حیات، وفات، مدفن ومزار کی جو بحث اپنی کتاب ''ولؔی گجراتی'' میں چھیڑی ہیں، یہ تمام بحثیں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی اور سیّد منظور حسین علویؒ المعروف بر حسینی پیر صاحب کی ایماء پر کی ہیں۔ جب عیسوی سن ۱۹۳۷ء میں دکن میں ولؔی کا دوصد سالہ یادگار جشن منایا گیا، اس وقت تک گجرات کے اس شہر احمد آباد میں ولؔی کے گجراتی یا احمد آبادی ہونے کا کوئی معاملہ نہیں تھا اور نہ ہی اُن کے مزار وغیرہ کی تلاش وجستجو کی گئی تھی اور نہ سیّد منظور حسینی علویؒ صاحب کے پاس وہ دستاویزات تھیں اور نہ ہی ولؔی کی وہ مہریں تھیں جن کی تلاش وجستجو ولؔی کے اس دوصد سالہ جشن کے بعد کی گئیں۔ تو آخر اس جشن کے بعد حسینی پیر علویؒ صاحب، مدنؔی صاحب اور قاضی میاں صاحب کو ایسی کیا ضرورت آن پڑی جس کی وجہ سے ولؔی کے گجراتی ہونے کی شہادتوں کی تلاش وجستجو میں لگ گئے اور ولؔی کے گجراتی ہونے کی تحریک کو اس پُر زور طریقے سے ہَوا دی کہ ولؔی کی پوری شخصیت ''دکنی'' اور ''گجراتی'' کے جھگڑے میں الجھ کر زبردست مجروح ہوگئی اور نہ صرف ولؔی کے گجراتی ہونے کی تحریک کو ہوا دی گئی بلکہ ولؔی کی پوری شخصیت کو دکنی اور گجراتی کے

جھگڑے میں الجھا کر مجروح بھی کیا گیا۔ اور آج نتیجہ یہ ہے کہ ہر مصنف کی تحریر دوسرے مصنف کی تحریر کے مغائیر اور تضاد پر مبنی ہے اور جب قاری وؔلی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کی وطنیت کی پیچ در پیچ تحریروں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے وؔلی کی وطنیت کے مسئلے کو چھیڑ کر وؔلی کی شہرۂ آفاق شخصیت کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ مدنؔی صاحب کی وؔلی پر پہلی تصنیف ۵۱-۱۹۵۰ء میں منظرِ عام پر آئی جس میں یہ عبارت درج ہے۔

''وؔلی کے مزار پر چینی کی ٹکڑیاں جڑی ہوئی تھیں اس لئے یہ ''چینی پیر'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔'' ۹۱

گویا یہ کہ اس وؔلی کے مبینہ مزار پر چینی کے ٹکڑے اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہی لگے ہوئے تھے۔ جب کہ ۱۹۳۷ء میں دکن میں وؔلی کا دوصد سالہ جشن منایا گیا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ مبیّنہ مزار اس وقت بھی موجود تھا تو گویا وہ چینی پیر کے نام سے ہی موسوم رہا ہوگا تو آخر یہ ''وؔلی گجراتی'' کا مزار کیسے ہوگیا؟ کیا کوئی صاحبِ عقل ایسی کمزور اور اختراعی دلائل پر مبنی باتوں پر اعتبار کرسکتا ہے؟ آپ وؔلی کی عظمت، بلندی، برتری، شہرت کا تصوّر کیجئے جس کا نام کا ڈنکا شمالی ہند میں بج رہا تھا اور جس مایۂ ناز شاعر کے اشعار ہر خاص وعام کی زبان پر وِرد کر رہے تھے، کیا ایسے عظیم المرتبت شاعر کا مزار گمنام ہوسکتا ہے؟ کہ جس کی تلاشِ بسیار کے بعد نشاندہی کی جاتی؟ اور تو اور بھلا وہ شاعرِ عوام ''چینی پیر'' کیسے ہوسکتا تھا؟ اور وہ بھی جو وؔلی کے انتقال کے تین سو برسوں بعد دریافت کیا جارہا ہے؟

سیّد منظور حسین علویؒ المعروف بر حسینی پیر صاحب کی دریافت شدہ اسناد، شجرہ، مَحضر نامہ اور وؔلی کی وہ مہر جس میں وؔلی کو ''علوی'' خاندان کا چشم وچراغ بتایا گیا ہے۔ موصوف کی ایک تصنیف ''تذکرۃ الوجیہ'' ہے۔ یہ ایک مذہبی طرز کی کتاب ہے۔ جو علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ اور اس خاندان کے دیگر افراد کی حالاتِ زندگی پر مبنی ہے۔ اسی کتاب میں ''وؔلی'' کا شجرۂ نسب بتایا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی ''علوی'' خاندان ایک ممتاز اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے اور بہت ہی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس خاندان کے افراد کو آج بھی سماج میں اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ کے زمانے میں حاصل تھی۔ آپ ذرا سوچئے کیا ایسے اعلیٰ مرتبہ خاندان میں ''وؔلی'' پیدا ہوئے ہوں اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر مشہور اور معروف بھی رہے ہوں اور اس خاندان کے افراد کو اُن کی عظمت کا احساس بھی نہ ہوا ہو؟ اور ڈھائی تین سو

سال بعد یہ خیال پیدا ہو کہ ''ولیؔ'' ہمارے خاندان کا فرد ہے اور پھر اسے ''ولیؔ گجراتی'' کے نام سے مشہور کیا جائے، جب کہ وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے ہوں کیوں کہ سترہویں صدی میں احمد آباد ایک مشہور شہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کوئی ایسا چھوٹا موٹا دیہاتی یا گمنام علاقہ نہیں تھا جس کی وجہ سے ولیؔ کا نام اس صوبے گجرات کے ساتھ جوڑا جاتا جب کہ وہ سرزمینِ احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اِس لئے ولیؔ جن کو بجا طور پر ولیؔ احمد آبادی ہونا چاہیئے تھا اس کے برعکس وہ ولیؔ گجراتی کیسے ہوگئے؟

''تذکرہ الوجیہ'' میں ''علوی'' خاندان کے دیگر بہت سے افراد کا ذکر ہے ان سبھی افراد کے ساتھ بھی گجراتی جوڑا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تو صرف اور صرف ولیؔ کے نام کے ساتھ ہی یہ معاملہ کیوں درپیش آیا؟ جب کہ وہ احمد آبادی تھے۔ احمد آباد صوبۂ گجرات کا ایک مرکزی شہر تھا اور آج بھی ہے، جیسا کہ سورت، بڑودہ وغیرہ صوبۂ گجرات میں شامل ہونے کی وجہ سے ان شہروں کا وجود تو ختم نہیں ہوجاتا؟ جیسا کہ صوبۂ گجرات، مہاراشٹر کے ساتھ ضم کر دیا تھا۔ اس سے صوبۂ گجرات کا وجود تو ختم نہیں ہو جاتا گجرات گجرات رہتا ہے اور مہاراشٹر مہاراشٹر رہتا ہے۔

مہاراشٹر اور گجرات دونوں دوسو برسوں تک ایک دوسرے کے ساتھ ضم ہوگئے تو کیا کسی گجرات کے باشندے نے اپنے آپ کو مہاراشٹری لکھا؟ یا کسی مہاراشٹر صوبے کے رہنے والے نے اپنے آپ کو گجراتی کہا ہے؟ کیوں کہ صوبۂ گجرات کے صوبۂ مہاراشٹر میں ضم ہوجانے سے اُس کا اپنا وجود ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس صوبے کی اپنی علیحدہ شناخت تو برقرار ہی رہتی ہے۔ اسی طرح اِن صوبوں کے شہروں کی بھی اپنی علیحدہ شناخت باقی رہتی ہے۔ اس لئے صوبۂ گجرات بھلے ہی ماضی میں دکن کے یا مہاراشٹر کے صوبے میں شامل رہا ہو لیکن اِن صوبوں کے بڑے اور مرکزی شہروں کی اپنی حیثیت اور پہچان ہر زمانے میں مسلّم رہی ہے۔ اور چوں کہ احمد آباد صوبۂ گجرات کا شہر تھا اور ہے، لیکن صوبۂ گجرات کا شہر ہونے سے اِس شہر کا اپنا وجود اور شناخت تو ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ احمد آباد، احمد آباد ہی رہتا ہے اور اس شہر میں پیدا ہونے والا اپنے آپ کو ''احمد آبادی'' ہی لکھے گا ''گجراتی'' نہیں، تو بھلا ولیؔ کو کیا ضرورت پڑتی کہ وہ اگر احمد آباد کے باشندہ ہوتے اور اس ''علوی'' خاندان کے فرد ہوتے تو اپنے آپ کو ''احمد آبادی'' ہی لکھتے نہ کہ ''گجراتی''۔ جیسا کہ ولیؔ کے بعد اس کے گجراتی جانشین ''عزلتؔ'' نے اپنے کو ''عزلتؔ سورتی'' لکھا اور بعد میں یہ روایت آگے بڑھتی رہی۔ مثلاً: گجرات میں غالبؔ میں غالبؔ کے ایک شاگرد جن کا پورا نام افصح الزماں غلام محمد میاں اور تخلّص ''سمجھوؔ'' تھا اور وہ سورت

میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے وطن کے متعلق ایک شعر یوں کہا ہے ۔۔۔

ع کیوں نہ گاہک ہوں اچّھی صورت کے

متوطن بھی ہم ہیں سورت کے ۹۲

بالکل اسی طرح اپنی وطنیت کے معاملے میں ولؔی نے بھی خود وضاحت کی ہے اور خود کو متوطن دکن لکھا ہے۔

ولؔی ایران وتوران میں ہے مشہور

اگرچہ شاعر ملک دکھن ہے

مذکورہ مباحث اور دلائل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر ولؔی ''علوی'' خاندان میں پیدا ہوئے ہوتے اور اگر ان کا مولد و مسکن شہر احمد آباد ہوتا تو ان پر یہ خبط کیوں سوار ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو احمد آبادی نہ کہہ کر دکھنی کہتے ؟ کیا دنیا میں ایسی کوئی نظیر ملتی ہے کہ کسی شاعر نے اپنے حقیقی وطن کے بجائے اپنا مولد و مسکن کسی اور مقام کو بتایا ہے؟ یا ماضی بعید سے لے کر تا حال آج تک کسی گجراتی یا احمد آبادی شاعر نے اپنے کو دکنی کہا ہے؟

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیّد منظور حسین علویؒ المعروف حسینی پیر صاحب (مصنف : تذکرۃ الوجیہ) کا کچھ احوال بیان کیا جائے موصوف وارث حسین علوی المعروف وارث علوی کے والد ہیں۔ وارث علوی نہ صرف گجرات اردو ساہتیہ اکادمی کے صدر اور مشہور ناقد ہیں بلکہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ لیکن وارث حسین علوی صاحب نے ''ولؔی'' پر کوئی خامہ فرسائی نہیں کی۔ جیسا کہ آپ کے والد بزرگوار جناب سیّد منظور حسین المعروف حسینی پیر صاحب نے ''ولؔی'' کی اسناد، شجرۂ نسب نامہ اور مہر وغیرہ پر اپنی تصنیف ''تذکرۃ الوجیہ'' میں روشنی ڈالی ہے اور چوں کہ بعد میں ''ولؔی'' کی وطنیت کی ایک ادبی جنگ گجرات اور دکن کے علماء میں جاری رہی تھی اور اس عنوان کے تحت زبردست بحثیں بھی چھڑی رہیں، لیکن وارث علوی حسبِ سابق ہنوز خاموش ہیں جب کہ انھیں آگے آکر اس مسئلے پر خود گفتگو کرنی چاہیے۔

لیکن اس زبردست متنازعہ کو لے کر ان کی نوکِ قلم نے کوئی جنبش نہیں کی۔ حالاں کہ درس وتدریس، تخلیق وتصنیف ہی آپ کی زندگی کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ''ولؔی'' کی وطنیت کے متنازع عنوان پر آپ نے قلم نہیں اُٹھایا حالانکہ ابتداء تا حال آپ کا قلم مسلسل چل رہا ہے جب کہ ولؔی کے عنوان پر آپ کی طرف سے پیش قدمی ضروری تھی لیکن آج تک آپ نے ولؔی کے متعلق نہ کوئی رائے پیش کی اور نہ ہی کوئی مقالہ سپردِ قلم کیا اور نہ ولؔی کے باب میں کسی طرح کا کوئی اضافہ، آخر ''ولؔی'' سے متعلق موصوف کی اس

خاموشی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ کہ آپ نے اس طرح کی پہلوتہی اختیار کرلی اور اس موضوع پر اپنی ذات گرامی کو اس قدر جامد وساکت کر ڈالا کہ اس موضوع پر ایک لفظ لکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ کیا یہ جمود دانستہ ہے؟ اور اگر یہ جمود شعوری طور پر اختیار کیا گیا ہے تو اس کے صرف یہی معنی ومطالب نکالے جاسکتے ہیں کہ آپ کے نزدیک بھی ''ولی'' کے گجراتی الاصل ہونے کے تمام دلائل کمزور اور مشکوک ہیں۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ یقینی طور پر ولی کو اپنی بحث کا موضوع بناتے۔ کیوں کہ ولی کی وہ اسناد اور مہریں وغیرہ جو آپ کے والد بزرگوار کی مملوکہ بتائی گئی ہیں آپ کے والدِ بزرگوار کے انتقال ۱۹۷۲ء کے بعد آپ کی وراثت میں ضرور آئی ہونگی اور آپ کے پاس آج بھی محفوظ ہوں گی۔ لہذا ضروری تھا کہ آپ ان مملوکہ وموروثی چیزوں کو منظرِ عام پر پیش کرتے اور لوگوں کی آنکھیں کھولتے، لیکن آپ کے ذریعے ایسی کوئی سعی نہیں کی گئی، جس کی ادب کے قارئین کو توقع تھی۔ جناب وارث حسین علوی صاحب کی یہ مشکوک خاموشی اس بات کو تقویت بخشتی ہے کہ آپ کے نزدیک بھی ولی گجراتی نہیں بلکہ دکنی تھے لہذا مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ ولی کے دکنی الاصل ہونے کے دلائل میں یہ ایک اہم اضافہ بھی ہے اور سند بھی۔

اردو کے اس عظیم شاعر ''ولی'' نے جس طرح اردو زبان کو اپنے کلام کے ذریعہ توانائی بخشی، اور اس زبان کی آبیاری کی اور اس زبان کو رواج دینے میں جو تاریخی کردار ادا کیا ہے وہ تاریخ کا ایک زرّین باب ہے، جسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ گجرات میں اردو کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے بھی ولی کے گجراتی نہیں بلکہ دکنی ہونے کی ہی شہادت ملتی ہے۔ اگر ''ولی'' کا مولد ومسکن گجرات اور احمد آباد ہوتا تو یہاں اس پورے صوبے میں آج بھی اردو کا چلن عام ہوتا جیسا کہ ولی کے زمانے میں تھا۔ لیکن آج بھی معاملہ اس کے برعکس ہے۔ پورے گجرات میں آج بھی ایسا کوئی علاقہ نہیں جہاں اردو کا چلن عام ہو۔ اور جسے اردو کے علاقے کی حیثیت سے جانا جاتا ہو۔ آج بھی گجرات میں اردو کی حالت اتنی ہی خراب ہے جتنی کہ ماضی بعید میں تھی۔

گجرات میں اس زمانے میں بھی اردو کا کوئی چلن رہا ہو تو وہ گجرات کے مقامی لوگوں کی وجہ سے نہیں بلکہ شمالی ہند اور دکن سے آئے ہوئے لوگوں کی وجہ سے رہا ہوگا جو سیاسی خلفشار اور جنگوں کی وجہ سے پریشان امن کی تلاش میں سرگرداں گجرات میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ جن میں شمال ومشرق سے آئے ہوئے صوفیائے کرام کا بھی شمار ہوتا ہے جنہوں نے مذہبِ اسلام کی تبلیغ کے لئے اردو زبان کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ اس طرح

گجرات میں اردو کا فروغ دکن اور شمال و مشرقی ہندوستان کے لوگوں کا مرہونِ منت ہے۔ کیوں کہ گجرات کے مقامی باشندے آج بھی اپنے گھروں میں گجراتی بولتے ہیں اور اگر اردو زبان بولنے والا کوئی علاقہ پورے گجرات میں کہیں بھی پایا جاتا ہے تو وہ صرف مشرقی ہندوستان اور دکن وغیرہ سے آئے ہوئے لوگوں کا ہی علاقہ ہے، جہاں اردو کا چلن گھروں سے ہے جب کہ گجرات کے دوسرے کسی علاقے میں اردو کا چلن گھروں میں نہیں پایا جاتا۔

ولؔی کی اردو زبان کو دیکھتے ہوئے جو انھوں نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے عرصے میں اپنے کلام میں استعمال کی ہے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ولؔی یہیں احمد آباد کے ساکن ہوتے تو آج بھی گجرات میں اردو کا چلن عام ہوتا جیسا کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں مالیگاؤں، بمبئی، اچل کرنجی، دھولیا، حیدرآباد اور دہلی وغیرہ میں پایا جاتا ہے، جب کہ گجرات میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ ولؔی کا کلام جس قدر صاف اور شستہ ہے اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ولؔی کے کلام میں یہ روانی اردو کے ابتدائی نقوش کے بعد کی پیداوار ہیں اور زبان کے وہ ابتدائی نقوش گجرات میں نہیں پائے جاتے اور نہ ہی اردو غزل گوئی کی وہ ابتدائی کڑیاں ملتی ہیں جن کو برتنے کے بعد ولؔی کے کلام میں نکھار پیدا ہوا۔

''ولؔی'' جس کا تعلق ''علوی'' خاندان سے بتایا جاتا ہے اس خاندان میں آج بھی مقامی زبان کے طور پر گجراتی آمیز اردو بولی جاتی ہے اس اردو زبان پر گجراتی زبان کے اثرات اس قدر گہرے ہیں کہ اسے کسی طرح بھی اردو نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ اس کی شکل گجراتی ہوکر رہ گئی ہے۔ گجرات میں اردو کی صورتِ حال کم و بیش اسی طرح کی ہے، اگر ''ولؔی'' کا تعلق اس ''علوی'' خاندان سے ہوتا تو آج بھی اس خاندان کی بول چال کی عام زبان اردو ہی ہوتی اور ولؔی کے کلام کے متعدد قلمی نسخے اس خاندان میں محفوظ ہوتے۔ گجرات میں اردو کی صورتِ حال کے متعلق پروفیسر سیّد ابوظفر ندوی صاحب اس طرح رقم طراز ہیں۔

''خود گجرات کے مسلمان بھی اپنے گھروں میں گجراتی بولتے ہیں اور ان کی اردو بہت ہی زیادہ خراب ہے اور وہ ایک گجراتی اردو بن گئی ہے''۔۹۳

الغرض یہ کہ مذکورہ تمام مباحث سے یہ بات واضح اور مترشح ہوتی ہے کہ ''ولؔی'' گجراتی نہیں بلکہ دکنی تھے اور جناب سیّد منظور حسین علویؒ المعروف بر حسینی پیر صاحب، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی صاحب اور آخر میں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی صاحب نے ولؔی کو ادبی سازش کے تحت گجراتی ثابت کرنے کے لئے بے جا اور

غیر ضروری بحثیں چھیڑیں ہیں۔ اور وہ تحقیقی مباحث جو ولیؔ پر ہونے چاہیے تھے پسِ پشت پڑگئے نیز وہ ادبی کام جو ولیؔ کی دیگر فنی صلاحیتوں کا احاطہ کرتے عدم توجہی کا شکار ہوگئے۔ جسے بجا طور پر ولیؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر کی بدقسمتی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

یہاں ولیؔ کے دکنی الاصل ہونے کی ٹھوس اور ناقابلِ تردید شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ گجرات کی تمام تاریخی اسناد وماخذ جن میں تاریخی کتب شامل ہیں ولیؔ کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی۔

(۱) تاریخ احمدی مصنف: مٹھن لال سن تالیف ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء

(۲) تحفۃ الکرام مصنف: علی شیر قانع (جس میں گجرات واحمد آباد کے مشاہیر کے حالات درج ہیں)

(۳) تاریخ مراۃ احمدی مصنف ومترجم: سید ابوظفر ندوی صاحب

(۴) مراۃ سکندری مترجم: پروفیسر مرحوم مرتاض حسین قریشی

(۵) تاریخ گجرات مصنف: میر ابوتراب ولی

مذکورہ تمام تاریخیں گجرات کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے اہم ماخذ ہیں۔ لیکن بالا تمام تاریخی کتب میں ولیؔ کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں ہے۔

(٦) تاریخ گجرات مصنف: ابوظفر ندوی صاحب

اس کتاب میں بھی گجراتی ادب کی ابتداء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک۔ کے شعراء کا ذکر ہے اور گجراتی زبان وادب کے ایسے شعراء کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کے مرتبہ و معیار کا تعین کرنا ابھی باقی تھا۔ اس کتاب میں بھی ولیؔ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اور گجرات کی اردو زبان کے متعلق بھی صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ۔۔۔

''یہاں کی اردو بہت ہی خراب ہے'' ۹۴

ابوظفر ندوی صاحب گجرات کے قدیم ترین کالج ''گجرات کالج'' جو احمد آباد میں واقع ہے عیسوی سن ۱۹۲۱ء میں بمبئی سے تبادلہ ہو کر یہاں آئے تھے اور یہیں ''تاریخ گجرات'' لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا گویا یہ کہ اس کتاب کی تکمیل بیسوی صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں عمل میں آئی اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ گجرات میں ولیؔ کی وطنیت کا تنازعہ دکن میں ۱۹۳۷ء میں ولیؔ کا دوصد سالہ جشن منانے کے بعد شروع ہوا۔ یہاں اس موقع

پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ گجرات میں جب یہ ''تاریخ گجرات'' لکھی جارہی تھی، اس وقت تک بھی ولؔی کی وطنیت کا کوئی مسئلہ گجرات میں نہیں تھا۔ اسی وجہ سے سیّد ابوظفر ندوی صاحب نے اس کتاب ''تاریخ گجرات'' میں ولؔی کا کوئی ذکر نہیں کیا، جب کہ ولؔی استاد الاساتذہ کی حیثیت سے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ آپ کے نزدیک اگر ولؔی گجراتی ہوتے یا اگر ایسی کوئی بحث اس کتاب کی تخلیق کے دوران رونما ہوئی ہوتی تو بھی شاید ولؔی کا ذکر اس کتاب میں ضرور پایا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کی مضبوط دلیل یہی ہے کہ آپ کے نزدیک بھی ولؔی دکنی ہی تھے ورنہ جہاں اردو ادبیات کا ذکر کیا گیا وہاں ولؔی کا ذکر بڑے ہی فخر سے کیا جاتا۔

(۷) گجرات میں ولؔی کا کوئی ''قلمی'' دیوان نہیں ملتا اس کے برعکس دکن میں ولؔی کے متعدّد قلمی دیوان موجود ہیں۔

(۸) احمد آباد کے قدیم کتب خانہ ''حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ'' جہاں سیکڑوں مخطوطات ونسخہ جات وغیرہ موجود ہیں۔ ان میں بھی ولؔی یا اُن کے خاندانی حالات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

(۹) انسائیکلو پیڈیا آف اردو میں بھی ولؔی کو ''دکنی'' ہی لکھا گیا ہے ۹۵

ان تمام مباحث کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ ولؔی کا وطن ''گجرات'' نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ یہاں ضرور گزارا، علم وفضل سے بہرہ ور ہوئے چنانچہ یہ بات نہ تحقیق طلب رہ جاتی ہے، نہ مزید کسی بحث کی متقاضی، کہ ولؔی کا مولد مسکن ''دکن'' تھا، تاہم ان کی وفات اور مرقد کا مسئلہ تحقیق طلب رہ جاتا ہے لہٰذا یہاں پر انھیں دلائل کے ساتھ حقائق کی تلاش کی کوشش کی جائے گی۔

متذکرہ بالا مباحث ودلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احمد آباد میں یا گجرات کے دیگر کسی علاقے میں ولؔی کا مزار نہیں پایا جاتا، جس سے یہ معنی اخذ کئے جاتے ہیں کہ ولؔی نے اپنے دوسرے سفرِ دہلی کے بعد واپسی پر اپنے وطن دکن کی راہ لی ہوگی۔ دہلی کے سفر سے واپسی کے بعد احمد آباد لوٹنے یا یہاں قیام کرنے کا خیال ہی بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ولؔی جیسا مشہور شاعر اپنی زندگی کے آخری ایام اس سرزمین پر بسر کرے اور شعراء ومشاہیر احمد آباد میں اس کا ذکر نہ آئے ؟ ولؔی نے دہلی سے واپسی کے بعد دکن میں سکونت اختیار کی اس سفر کے بعد وہ کتنے سال اور زندہ رہے؟ اور کس سن میں ان کا انتقال ہوا ؟ یہ تمام باتیں آج تک تحقیق طلب ہیں۔

جس طرح ولؔی کی تاریخِ پیدائش میں اختلافات پائے جاتے ہیں اسی طرح ولؔی کی تاریخِ وفات میں بھی

اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف زیادہ تر ان غلط شہادتوں پر مبنی ہیں جو بعض تذکرہ نویسوں کے غلط بیانات اور بعد کے مصنفین کے غلط استنباط اور قیاس کا نتیجہ ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں، میرؔ، قائمؔ، میر حسنؔ، شفیقؔ، گردیزیؔ وغیرہ نے اپنے تذکروں میں اس بابت میں لکھا ہے کہ ہم کو ولیؔ کا سنِ وفات یقینی طور پر معلوم نہیں تھا۔ لہذا اس وجہ سے انھوں نے اپنے تذکروں میں احتیاطاً اس کو صحیح نہیں لکھا ہے۔ لیکن بعد کے محققینِ ادب نے ولیؔ کی وفات تحقیق کرنے میں تساہل سے کام لیا، لہذا اس بے احتیاطی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ولیؔ کی تاریخ وفات عیسوی سن ۱۷۰۷ء، ۱۷۲۰ء، ۱۷۲۵ء، حتیٰ کہ ۱۷۳۵ء اور پھر ۱۷۴۱ء تک جا پہنچی۔ اس ضمن میں علماء اپنی قیاس آرائیوں کو بروئے کار لاکر اپنی تحقیق کو زیادہ معتبر اور قابلِ اعتماد ٹھہرانے کی غرض سے بھی دیگر محققین کی دریافت شدہ تحقیقِ تاریخ کو غلط ثابت کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔

''مولوی سید احمد صاحب'' نے فرہنگِ آصفیہ میں ولیؔ کا سنِ وفات ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۲ء ۹۶ لکھا اس کے بعد مولوی عبد الجبار خان نے اپنے تذکرۂ ''محبوب الزمن'' (جلد ۲ ص ۱۱۳۳) میں ولیؔ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ۔۔۔

''کہتے ہیں کہ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۴ء) کے قریب فوت ہوا'' ۹۷

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ نے ولیؔ کی تاریخ وفات اپنی کتاب ''ولیؔ گجراتی'' میں ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۹ء بتائی ہے اور اس کی تصدیق میں ولیؔ کی مہریں اور اعراس نامہ کو پیش کیا ہے جو حسینی پیر صاحب کی مملوکہ بتائی گئی ہیں۔ لیکن مذکورہ اعراس نامہ اور مہر آج تک منظرِ عام پر نہیں آئی اور نہ اُس کی فوٹو کاپی پیش کی گئی۔ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ کی بتائی ہوئی ولیؔ کی اس تاریخِ وفات پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں۔

> ظہیر الدین مدنیؔ نے ولیؔ کی تاریخ وفات ۴ر شعبان ۱۱۱۹ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مطابق ۱۷۰۹ء کے ہے لیکن یہاں مدنیؔ صاحب سے سہو ہوا ہے۔ ۴ر شعبان ۱۱۱۹ھ کے مطابق انگریزی تاریخ ۳۱ر اکتوبر ۱۷۰۷ء ہے۔ مدنیؔ صاحب نے ''۴ر شعبان'' کے لئے کوئی سند نہیں دی ہے۔ لیکن جہاں تک سوال سنہ کا ہے، تو اس کی بنیاد ایک مشہور (اور، ظاہر ہے، متنازع فیہ) فارسی قطعۂ تاریخ ہے۔ اس سے اس شخص کی تاریخ وفات ۱۱۱۹ھ نکلتی ہے جس کا نام ولیؔ تھا۔ چونکہ مدنیؔ صاحب

نے وہ قطعہ خود بھی نقل کیا ہے، لہٰذا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان کی عبارت میں ۱۷۰۹ء کتابت کی غلطی ہے اور ان کی مراد ۱۷۰۷ء ہی سے ہے۔ ۹۸

مذکورہ اقتباس میں جس قطعۂ تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے وہ مندرجۂ ذیل ہے۔

مطلع دیوان عشق سیّد ارباب دل والی ملکِ سخن صاحبِ عرفانِ ولّی

سال وفاتش خرد از سرِ الہام گفت باد پناہِ ولّی ساقی کوثر علی ۹۹

(۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء)

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ جیسا کہ فرہنگ آصفیہ میں ولّی کا سنِ وفات ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۲ء تحریر کیا گیا ہے لیکن چونکہ ولّی کی سنِ پیدائش ۱۰۷۹ھ پر سبھی علماء متفق رائے نظر آتے ہیں، اس لئے اپنی عمر کے ۲۲ ویں سال میں ولّی کا انتقال ہو گیا ہو یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لئے مولوی سیّد احمد صاحب کی بیان کردہ تاریخِ وفات درست قرار نہیں دی جا سکتی، اس کے بعد ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے ولّی کی وفات ۱۱۱۹ھ تحریر کی ہے یہ قطعہ تاریخ اِن وجود کی بنا پر صحیح معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے۔

(۱) ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء کے بعد تک ہمیں ولّی کے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) یہ بات مصدقہ ہے کہ ولّی جواں سال نہیں بلکہ عمرِ طبعی کو پہنچ کر مرے ۱۰۰

راقم الحروف بھی اس بات سے متفق ہے کہ ۱۷۰۷ء کے بعد تک ولّی یقینی طور پر حیات تھے۔ مدنی صاحب کی بیان کردہ قطعۂ تاریخ کی بنیاد دراصل وہ قطعۂ تاریخ ہے جو مولوی عبد الحق صاحب نے بمبئی کی جامع مسجد کے کتب خانہ سے دریافت کیا تھا اور ۱۹۳۷ء میں ولّی کے دو قد سالہ جشن میں روشناس کرایا تھا۔ جس وجہ سے بعد کے محققین نے موصوف کے دریافت شدہ اس قطعۂ تاریخ کو قبول کر لیا تھا اور چونکہ مدنی صاحب کی تصنیف ''ولّی گجراتی'' اور ''سخنورانِ گجرات'' اس کے بعد کی تخلیق ہے، لہٰذا اِس قطعہ تاریخ کو ہی بنیاد بنا کر درج کر دیا ہے۔

بعض اہلِ علم نے ''دہ مجلس'' کو ولّی کی طرف منسوب کیا ہے اور اُسے ولّی کی تخلیق بتاتے ہوئے درج ذیل قطعہ پیش کیا ہے ''دہ مجلس'' جس کی صحت وتصدیق جناب شیخ چاند مرحوم ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ نے بھی کی ہے اور جناب احسن مارہروی نے ''کلیاتِ ولّی'' کے صفحہ ۳۸۶ پر ''دہ مجلس'' کا قطعہ درج کیا ہے جو ذیل میں ہے۔

ہوا ہے ختم جب یوں درد کا حال　　گیارہ سو پوتھا ایکتا لیسواں سال
کہا ہاتف نے یوں تاریخ معقول　　ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

(۱۷۲۸ء/ ۱۱۴۱ھ)

بعض اہلِ علم حضرات نے اس منظوم نظم میں قدیم دکنی اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے اُسے ولی کی تخلیق بتایا ہے اور اس قطعۂ تاریخ سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء تک ولی کے حیات ہونے کا یہ معتبر ثبوت ہے۔

دیگر بعض حضرات نے مندرجۂ ذیل شعر کی بنا پر بھی ولی کو سلطان محمد شاہ کے زمانے تک بقیدِ حیات بتایا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

شفیق نے اپنے تذکرہ میں اُسے مضمون کا شعر بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں اس شعر کو ولی کے نام سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ وہ اس کے دیوان میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اسی طرح مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ ۲رجلوس محمد شاہی میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تھا۔ اس سے ولی کا عہدِ محمد شاہی میں دوبارہ دلّی جانے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ جس سے اس عہد تک ولی کے بقیدِ حیات ہونے کی قطعی شہادت مِل جاتی ہے۔

بعض حضرات نے حاتم کے اس شعر سے ولی کا حیات ہونا ثابت کیا ہے۔

اے ولی مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے
یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

اس طرح ۱۷۲۸ء تک ولی کے حیات ہونے کے ناقابلِ تردید شواہد موجود تھے۔ شاہ حاتم (۱۶۹۹ء/ ۱۷۹۱ء) کے مخاطبانہ انداز کو دیکھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ولی کی عظمت اور برتری کے کس قدر قائل ہیں، لہٰذا وہ ولی کو مخاطب کر کے اپنی معذوری کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور شعر گوئی کا یہ انداز اسی وقت ممکن ہے جبکہ مخاطب حیات ہو۔

جیسا کہ مصحفی نے اپنے تذکرہ ''تذکرۂ ہندی'' میں لکھا ہے کہ ''در سنہ دویم فردوس آرامگاہ دیوانِ ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ واشعارش بر زبانِ خورد وبزرگ

جاری گشتہ'' ۱۰۱

ولی کا دیوان ۱۷۱۹ء میں دہلی پہنچا جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مرقوم ہو چکا ہے۔ کہ ولی خود ہی اپنے دیوان کو لوگوں میں معروف کرانے کی غرض سے دہلی پہنچے تھے اور غالباً دوبارہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات کی ہوگی اور اُنہی کے توسط سے اپنے کلام کو لوگوں تک پہنچانے کی بھی کوشش کی ہوگی ۱۷۱۹ء تک دہلی میں اردو شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا اور حاتم، آبرو، فائز وغیرہ دادِ سخن دے رہے تھے۔ ان میں سے بعض نے ولی کو اس انداز میں مخاطب کیا ہے۔

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ (شاہ حاتم)

آبرو شعر تیرا اعجاز ہے پر ولی کا سخن کرامت ہے (شاہ مبارک آبرو)

حاتم اور آبرو کے یہ اشعار ولی کے ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے اعتراف میں قلم بند کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ولی نے بھی اس دور کے ایک شاعر فراقی (۱۶۸۵ء تا ۱۷۳۱ء) کا ذکر اپنے ایک شعر میں کیا ہے جسے اکثر تذکرہ نویسوں اور اہلِ تحقیق نے درج کیا ہے۔ جس سے ان دونوں شعراء کی شاعرانہ چشمک اور نوک جھونک کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اشعار یوں ہیں۔

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب، جب کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

مذکورہ اشعار سے ولی اور فراقی کا ہم عصر ہونا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''تاریخِ ادب اردو'' میں ولی کی وفات سے متعلق طویل بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ولی محمد، ولی دکنی جن کا انتقال ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء - ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء کے درمیانی عرصے میں ہوا'' ۱۰۲

جالبی صاحب نے ولی کی وفات کے متعلق کوئی آخری تاریخ نہیں دی اور اس طرح کے مبہم بیان کی وجہ وجدی کی مثنوی ''مخزنِ عشق'' کو بتایا ہے جو ۱۷۳۱ء میں تخلیق کی گئی۔ جس میں اس دور کے موجودہ و مرحوم

شعراء کا بھی ذکر موجود تھا اور مرحومین کی مغفرت کے لئے دُعا بھی مانگی گئی تھی۔ وہ شعر مندرجۂ ذیل ہے۔

کہاں لگ شاعراں کے یوگنوں نانو
خدا کی مغفرت اون پر اچھو چھانو ۱۰۳

یہاں جالبی صاحب کو مغالطہ ہی نہیں ہوا ہے بلکہ اس مثنوی کی سنِ تخلیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے قیاس کی بنیاد پر ولی کا سنِ وفات "۱۷۲۰ء/ ۱۷۲۵ء کے درمیانی عرصے میں ہوا" لکھ دیا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ کسی شاعر کی موت پر اتنے اختلاف پائے جاتے ہوں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ کس محقق یا ادیب کا بتایا ہوا سنِ وفات درست ہے، کوئی حتمی فیصلہ مشکل امر ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے نزدیک تذکروں کے ان اوراقِ پارینہ کا مطالعہ اہم ہو جاتا ہے۔ جو ولی کی موت کے بعد کے ایام میں تحریر کئے گئے ہوں خصوصاً ان تذکروں کا جو قرب وجوار سے ہی تعلق نہ رکھتے ہوں، بلکہ قریبی زمانے سے بھی متعلق ہوں، اور ایسی صورت میں لامحالہ ہماری نگاہ دکن کے تذکرہ نگاروں پر ہی جا کر ٹھہرتی ہے۔ کیوں کہ دیگر مقامات کے تذکرہ نگاروں کے بیانات میں غلط فہمی، غلط بیانی یا قیاس آرائی کے امکانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے دکن کے تذکرہ نگاروں پر اعتبار کر کے یہ ماننا ہوگا کہ، ان کا تعلق ولی کی سرزمین "دکن" سے ہی ہے اور انھیں دیگر مقامات کے تذکرہ نگاروں سے زیادہ اور بہتر معلومات ہو سکتی ہے۔

دکنی شعراء سے متعلق جو تذکرے دکن میں لکھے گئے ان میں سب سے مستند تذکرہ "محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن" ہے۔ جو عبد الجبار خاں ملکاپوری کا تصنیف کردہ ہے۔ دکن میں لکھے گئے تمام تذکروں میں اس تذکرے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور جب بھی کوئی محقق دکن کے کسی قدیم شعراء کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تو اسی تذکرے کو اوّلیت دیتا ہے۔ ہندوستان کے تمام محقق، علماء اور ادباء کے نزدیک یہ تذکرہ سب سے معتبر خیال کیا گیا ہے۔ اس لئے کوئی شک وشبہ کی گنجائش کے بغیر اس میں تحریر کردہ مواد پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اس لئے ولی کی وفات کے متعلق ہمیں بھی اس تذکرے سے استفادہ کئے بغیر کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ عبد الجبار ملکاپوری نے ولی کے حالاتِ زندگی دیگر تذکرہ نگاروں سے زیادہ لکھے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ دکن کے دیگر تذکرہ نگاروں کی بہ نسبت انھیں ولی کے متعلق زیادہ معلومات تھیں۔ عبد الجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرے "تذکرۂ شعرائے دکن" میں ولی کی ولادت اور وفات دونوں پر روشنی ڈالی ہے اور ولی کا انتقال

۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۴ء تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ ولؔی کی حالاتِ زندگی کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ولؔی جواں سال نہیں مرے، کیوں کہ اگر ولؔی کا انتقال ۱۷۰۷ء یا ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۵ء کے عرصے میں ہوا ہوتا تو یہ ولؔی کا جواں مرگ ہوتا اور اس جوانی کی موت کو تذکرہ نگار نہایت افسوس اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتے لیکن کسی بھی تذکرہ نگار کے بیان میں اس طرح کی کوئی بات دیکھنے کو نہیں ملتی۔

لہذا یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ولؔی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر فوت ہوئے لہذا عبد الجبار ملکاپوری کا یہ خیال کہ ولؔی کا انتقال ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۴ء میں ہوا، صحیح معلوم ہوتا ہے جس کی بے جا تردید کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

حواشی

باب دوم :- ولؔی کی سوانح حیات

۱۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد (مطبع کریمی لاہور)	ص : ۹۲
۲۔	مشمولہ مضمون : اردو میں تذکرہ نگاری تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (مولف: سعادت خان ناصر) مرتب : ڈاکٹر شمیم انہونوی		ص : ۱۱، ۱۲
۳۔	اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	ص : ۸۱، ۸۲
۴۔	نکات الشعراء (میر تقی میرؔ)	مرتب: بابائے اردو مولوی عبد الحق	ص : ۸۷
۵۔	مقدمہ تذکرۂ ریختہ گویاں	ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری	ص : ۱۳
۶۔	گلشنِ گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	ص : ۸
۷۔	تذکرۂ ریختہ گویاں (فتح علی گردیزیؔ)	ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری	ص : ۱۶۳
۸۔	تذکرہ مخزنِ نکات	محمد قیام الدین قائمؔ چاندپوری	ص : ۱۸
۹۔	تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسنؔ دہلوی	ص : ۱۸۴
۱۰۔	گلشنِ سخن (مردان علی خاں مبتلاؔ)	مرتب : سید عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی	ص : ۱۲۱
۱۱۔	گلزارِ ابراھیم (علی ابراھیم خاں خلیلؔ)	مرتب : سید عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی	ص : ۱۲۱
۱۲۔	گلشنِ ہند (مرزا علی لطف)	مرتب : مختار الدین احمد	ص : ۹۵، ۹۶
۱۳۔	تذکرۂ طبقاتِ سخن	شیخ غلام محی الدین قریشی (مبتلاؔ میرٹھی)	ص : ۱۰
۱۴۔	تذکرۂ مخزن الشعراء	قاضی نور الدین فائقؔ	ص : ۱۱۰، ۱۱۱

۱۵۔ یادگار شعراء- ڈاکٹر اسپرنگر ہندوستانی اکادمی، الہٰ آبادی۔ مترجم نے اس کے نیچے یہ نوٹ اضافہ کیا ہے کہ "ولؔی کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ اورنگ آبادی تھے۔ ص: ۲۱۷

۱۶۔	سخن شعراء	عبد الغفور خاں نساخؔ	ص : ۵۵۶
۱۷۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	ص : ۹۳

۱۸۔ تذکرۂ آثار الشعراء ہنود (جلد دوم۔ منشی دیبی پرساد) بحوالہ: ولی گجراتی۔ اختر جوناگڑھی ص : ۱۷

۱۹۔ آثار الشعراء: سیّد ممتاز علی بھوپالی بحوالہ: ولی گجراتی۔ اختر جوناگڑھی ص : ۱۷

۲۰۔ الموسیٰ: یادگار ولی نمبر سیّد محمد ایم۔اے۔ سیٹی کالج میگزین، حیدرآباد ص : ۴۷

۲۱۔ گجرات اور خاص کر احمد آباد کے مشہور نقاد پروفیسر وارث حسین علوی المعروف ''وارث علوی'' کے والد ہیں۔

۲۲۔ ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۷

۲۳۔ ایضاً ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۸

۲۴۔ ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۸

۲۵۔ نسب نامۂ ولی بحوالہ ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۸

۲۶۔ ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۹

۲۷۔ ولی نور الحسین ہاشمی (ساہتیہ اکادمی دہلی۔ ۱۹۹۰ء) ص : ۱۱

۲۸۔ ایضاً " " " ص : ۱۱

۲۹۔ اردو کے نامور نقاد وارث حسین علوی کے والد ماجد آپ کی پیدائش ۱۸۹۸ء اور وفات ۱۹۷۲ء ہے۔

۳۰۔ تذکرۃ الوجیہ سید حسینی پیر علویؒ ص : ۱۷

۳۱۔ نکات الشعراء مقدمہ (طبع ثانی) میر تقی میر ص : C، ہ

۳۲۔ تذکرۃ الوجیہ سیّد حسینی پیر علویؒ ص : ۱۸۷

۳۳۔ بحوالہ۔ ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۹

۳۴۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی پیدائش ۱۸۹۷ء اور وفات ۱۹۵۵ء میں کراچی میں ہوئی آپ ایک ''شہاب'' نامی پرچہ نکالتے تھے۔

۳۵۔ ولی گجراتی قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ص : ۴۶

۳۶۔ ایضاً " " " ص: ۱۳۱، ۱۳۰

۳۷۔ ایضاً " " " ص : ۱۳۳

۳۸۔ ایضاً " " " ص : ۱۳۴، ۱۳۳، ۵۱، ۵۰

۳۹	ایضاً	" " "	ص : ۳۸
۴۰	ایضاً	" " "	ص: ۱۵۰، ۱۴۲
۴۱	ایضاً	" " "	ص : ۳۸
۴۲	ایضاً	" " "	ص : ۱۵۴
۴۳	ایضاً	" " "	ص: ۵۲، ۲۹
۴۴	ایضاً	" " "	
۴۵	ایضاً	" " "	ص : ۸۷، ۵۵، ۴۵
۴۶	ولی گجراتی	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرتب: محی الدین بمبئی والا	ص : ۱۳
۴۷	ایضاً	" " "	ص : ۱۳
۴۸	ایضاً	" " "	ص : ۱۴
۴۹	مجلّہ : سابر نامہ	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی سنِ اشاعت ۱۹۹۹ء	ص : ۳۸
۵۰	یہ پورے خط کا اقتباس ہے۔ دیکھئے سابر نامہ		ص : ۴۰
۵۱	یہ مکتوب نمبر ۲ کا اقتباس ہے جو سابر نامہ کے ص ۴۰ پر درج ہے		ص : ۴۰
۵۲	یہ مکتوب نمبر تین کا اقتباس ہے تفصیل کے لئے دیکھئے ''سابر نامہ''		ص : ۴۳
۵۳	یہ مکتوب نمبر چار کا اقتباس ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ''سابر نامہ''		ص : ۴۵
۵۴	یہ مکتوب نمبر پانچ کا اقتباس ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ''سابر نامہ''		ص: ۴۸، ۴۷
۵۵	مجلّہ ۔ سابر نامہ	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۹ء	ص: ۵۵، ۵۳
۵۶	ایضاً	" " "	ص : ۵۵
۵۷	ولی گجراتی	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	ص : ۴۷
۵۸	ایضاً	" " "	ص : ۵۸
۵۹	سلطنت کال (گجراتی)	رسک لال پرکھ اور ہری پرشاد مشتری	ص : ۲۰۴
۶۰	ایضاً	" " "	ص : ۲۰۴
۶۱	ولی گجراتی	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	ص : ۵۵

۶۲ـ ولی اورنگ آبادی (پیش لفظ) آغا مرزا بیگ۔ اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر امیر احمد عارفی کا لکھا ہوا ہے ۔موصوف شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر ہیں۔ ص : ۱۱،۱۲

۶۳ـ ولی اورنگ آبادی ۔ آغا مرزا بیگ ص : ۱۸۶

۶۴ـ تذکرۂ شعرائے دکن عبدالجبار ملکاپوری ص : ۱۲۲

A-۶۵ـ شاعر : جلد۔۷۳، شمارہ۔۸ اگست ۲۰۰۲ء ص : ۱۶

B-۶۵ـ ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۴۷

۶۶ـ سخن ورانِ گجرات ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص:۸۵،۸۴

۶۷ـ مجلّہ : سابرنامہ گجرات اردو ساہتیہ اکادمی سنِ اشاعت ۱۹۹۹ء ص : ۵

۶۸ـ کلیاتِ ولی علی احسن مارہروی ص : ۲۱،۲۰

۶۹ـ آزاد بلگرامی نے مولانا نور الدین صدیقی سہروردی احمد آباد کے کسبِ علم، خلافت، تصانیف، پیدائش اور وفات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کی ولادت ۱۰۶۴ھ اور وفات ۱۱۵۵ھ ہے۔

۷۰ـ تاریخِ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی ص : ۵۳۸

۷۱ـ کلیاتِ ولی (ضمیمہ اوّل) علی احسن مارہروی ص : ۴

۷۲ـ کلیاتِ ولی نور الحسن ہاشمی ص : ۱۲۲

۷۳ـ ولی اورنگ آبادی آغا مرزا بیگ ص : ۲۲

۷۴ـ سخن ورانِ گجرات ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی ص : ۸۶

۷۵ـ تذکرۃ الوجیہ سیّد حسینی پیر علویؒ ص : ۱۹۵

۷۶ـ تاریخِ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی ص : ۵۳۴

۷۷ـ مخزنِ نکات قائم چاندپوری مرتب : ڈاکٹر اقتدا حسن ص : ۲۲،۲۱

۷۸ـ کلیاتِ ولی علی احسن مارہروی ص : ۱۷

۷۹ـ خطباتِ عبدالحق (مولوی عبدالحق) مرتب : ڈاکٹر عبادت بریلوی ص : ۱۹۲

۸۰ـ کلیاتِ ولی نور الحسن ہاشمی ص : ۴۲

۸۱ـ تاریخِ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی ص : ۵۳۱

۸۲ ولی گجراتی — ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی — ص: ۸۱

۸۳ سخن ورانِ گجرات — ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی — ص: ۸۶

۸۴ الموسی (یادگار ولی نمبر) — سٹی کالج میگیزن، حیدرآباد — ص: ۶۲،۶۳

۸۵ ایضاً (سیّد محمد ایم۔اے) " " " — ص: ۶۳

۸۶ آبِ حیات ۔ محمد حسین آزاد ۔ اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۲۰۰۳ء (چھٹا ایڈیشن) ص: ۸۷

۸۷ مراۃِ سکندری — مترجم: پروفیسر مرتاض حسین قریشی — ص: ۳۲،۳۱

۸۸ مجلّہ: سابرنامہ گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر، سنِ اشاعت ۱۹۹۹ء — ص: ۴۰

۸۹ ولی گجراتی — ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی — ص: ۶۹

۹۰ ایضاً — " " " — ص: ۹۸

۹۱ ایضاً — " " " — ص: ۸۲

۹۲ دیوان سمجھو سورتی — مرتب: ڈاکٹر نور السعید اختر — ص: ۵

۹۳ تاریخِ گجرات — سیّد ابوظفر ندوی — ص: ۳۴

۹۴ ایضاً — " " " — ص: ۳۴

۹۵ انسائیکلو پیڈیا آف اردو — مدیر اعلیٰ: پروفیسر فضل الرحمٰن — ص: ۵۲

۹۶ بحوالہ: ولی گجراتی — قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی — ص: ۷۰

۹۷ ایضاً — " " " — ص: ۷۰

۹۸ اردو کا ابتدائی زمانہ — پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی — ص: ۱۲۷،۱۲۶

۹۹ سخن ورانِ گجرات — ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی — ص: ۸۶

۱۰۰ تاریخِ ادب اردو — ڈاکٹر جمیل جالبی — ص: ۵۳۵

۱۰۱ تذکرۂ ہندی (مصحفی) — بحوالہ: تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی — ص: ۵۳۷

۱۰۲ تاریخ ادب اردو — ڈاکٹر جمیل جالبی (جلد اوّل) — ص: ۵۳۹

۱۰۳ ایضاً — " " " — ص: ۵۳۸

★★★★★★★

Chapter - 3

باب سوم

ولی سے قبل صنفِ غزل کا فروغ

باب سوم

ولی سے قبل صنفِ غزل کا فروغ

دکن میں غزل کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لینے سے قبل ان عوامل ومحرکات کا جاننا ضروری ہے کہ وہ کیا عوامل ومحرکات تھے، جس کی سبب غزل کا حیولا تیار ہوا اور اس کے لئے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ دکن میں اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں کیا حالات اور مذاق تھے اور اردو کی پیدائش سے پہلے پورے ملک کے رسوم وخیالات کیا تھے۔ اپنی مخصوص جغرافیائی اور تمدنی کوائف میں ہندوستان مسلم حملہ آوروں کی تہذیب وتمدن سے کتنا علیٰحدہ تھا اور دونوں قوموں کے یکجا ہونے کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیوں کہ دو مختلف مذاہب اور قوموں کے یکجا ہونے سے ایک نیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ جن کی بدولت مذاق شعری اور مظاہراتِ ادب میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ چنانچہ ادباء وشعراء بھی ان نمایاں تبدیلیوں سے دو چار ہوتے ہیں یہی تبدیلی ادب میں منعکس بھی ہوتی ہے۔ انھی حالات ونظریات میں ادباء یا شعراء ادب تخلیق کرتے۔ ہیں کیوں کہ حالات اُسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ گویا ادباء یا شعراء کو اِس طرح سوچنے اور کہنے پر مائل کرنے والے اسباب وعلل کا جائزہ لینا ضروری ہوجاتا ہے۔ جس نے شاعر کے ماحول اور ذہن کو اس سانچے میں ڈھالا ہوگا۔ جس سے وہ براہِ راست متاثر ہوئے ہوں گے اور اِن تاثرات کی تعمیر میں متعدد رجحانات کارفرماں رہے ہوں گے، نیز ادبی مذاق، سیاسی تغیرات، سماجی کش مکش، مذہبی تحریکات اور فنّی روایات سب نے مل کر شاعر کے ذہنی رجحانات کی تشکیل کی ہوگی اور پھر شاعر کا انفرادی ذہنی ارتقاء بھی کسی خاص رُخ پر جانا چاہتا ہوگا۔ لہٰذا شاعر کی اِس ذہنی کاوِش کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تمدّنی حالات کو مدّ نظر رکھنا از حد ضروری ہوجاتا ہے۔

پورا ہندوستان اپنی قدرتی جغرافیائی حدود بندیوں کی وجہ سے مختلف ومتعدد خطّوں میں پہلے سے تقسیم تھا۔ جس میں شمال اور جنوب دو بڑے خطّے تھے۔ ہر خطّے کی اپنی مخصوص الگ الگ بولیاں تھیں۔ لوگوں کی طرزِ معاشرت بھی جداگانہ تھیں۔ نسلی اعتبار سے بھی ہر خطّے کے افراد دوسرے خطّے کے باشندوں سے خود کو علیٰحدہ تصوّر کرتے تھے۔ ہر حصّے میں حکمراں بھی جدا جدا تھے۔ لہٰذا کوئی مرکزی حکومت نہ ہونے کے سبب اِس کمزوری

سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مختلف گروہوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ آپسی اتحاد کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بیرونی ممالک کی آنکھیں بھی ہندوستان کی طرف اُٹھیں، اِن بیرونی حملہ آوروں نے ہندوستانی تہذیب اور تمدّن کو زبردست متاثر کیا۔

سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں دکن کو فتح کر کے اُس کو دہلی کے ماتحت کردیا۔ اُس وقت سے شمالی ہند کی حکومت کا راستہ جنوبی ہند کے لئے کُھل گیا۔ جس وجہ سے پہلی بار دکن کا براہِ راست تعلّق دار السلطنت دہلی سے قائم ہوا اور دکن بلاواسطہ اِن تہذیبی اثرات کے دائرے میں آگیا جو دہلی اور اس کے گرد ونواح میں ایک واضح شکل اختیار کر رہے تھے۔ مگر اِس حملے سے بہت پہلے مسلمان یہاں دکن میں اپنا ذاتی واخلاقی رسوخ قائم کر چکے تھے۔ پروفیسر عبد القادر سروری لکھتے ہیں کہ۔۔۔

> ''علاؤ الدین خلجی کی فتح دکن سے قبل بھی صوفیاء اپنے خیالات وأفکار کی تلقین واشاعت کے لئے دکن کے بعض علاقوں تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ صوفی مسلمان گجرات اور مالوہ کے راستے سے ہوتے ہوئے دیوگیری پہنچے۔''[۱]

علاؤ الدین خلجی کے بعد ۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق نے دکن پر فوج کشی کر کے ''دیوگری'' کو ''دولت آباد'' سے موسوم کر کے دہلی کے بجائے ''دولت آباد'' کو پایۂ تخت قرار دے دیا۔ اِس کے باعث نہ صرف فوجی اشخاص بلکہ اہلِ علم وفضل، اہلِ حرفہ، صناع، عمائدین سلطنت اور تجّار وغیرہ سب ہی دہلی چھوڑ کر دکن آگئے۔ اِس سے قبل ہی علاؤ الدین خلجی کی دکنی فتوحات نے قدیم مرہٹی، تیلگو، تامل اور ملیالم بولنے والوں کی سرزمین میں شمال کی ایک نوخیز زبان کی اشاعت کے لئے راستہ کھول دیا۔ دہلی سے آئے ہوئے افراد نے اس نئی زبان کے ارتقاء کی اہم کڑی کا رول ادا کیا۔ اور کچھ ہی عرصے میں ''دولت آباد'' ایک وسیع اور بارونق شہر ہوگیا۔ لیکن محمد بن تغلق کا یہ نیا دار السلطنت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور کوئی سال بھر کے اندر ہی اندر دوبارہ دہلی دار السلطنت قرار دیا گیا۔ محمد بن تغلق کی دہلی کو مراجعت زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ لوگ جنہوں نے سفر کی مشقتیں برداشت کر کے دہلی اور نوائے دہلی سے دکن آئے تھے وہ سب کے سب دہلی واپس نہ جا سکے اور یہیں دکن میں ہی مقیم ہوگئے اور یہیں اِسی سرزمین میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

یہ فاتح اپنی ساتھ شمالی ہند کی زبان دکن میں لے آئے اور یہ زبان یہاں آزادانہ نشو ونما حاصل کرنے لگی اور مقامی زبانوں کے اختلاط سے ایک نیا حیولا زبان تیار ہوا اور اِس اشتراک سے وجود میں آنے والی نئی

زبان کا رواج عام ہوگیا۔ غرض کے اس طرح اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور اِس کی ترقّی میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور امیر وغریب ادنیٰ واعلیٰ ہر شخص نے اِس نئی زبان کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا۔ چونکہ شمالی ہند میں اب تک اس جدید زبان کا کوئی نام رائج نہیں تھا۔ لیکن ''دکن'' میں یہ نئی زبان ''دکنی'' اور ''ہندی'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ دنیا میں جس قدر زبانیں عالمِ وجود میں آئیں اُن میں اوّل نظم ہی کا رواج ہوا ہے مگر دکنی زبان میں ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں نظم کی ابتداء نثر کے بعد ہوئی۔ یہاں یہ سوال بھی ضرور ابھرتا ہے کہ آخر نظم کی ابتداء کس صنفِ سخن سے ہوئی؟ اِس ضمن میں نصیر الدین حاشمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم کیا ہے ---

''اس کے متعلق بھی گو تیقن کے ساتھ کوئی رائے نہیں دی جاسکتی مگر جہاں تک تحقیق کی گئی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے بعد رباعی، غزل اور قصیدے کا آغاز ہوا۔'' ؎۲

لیکن محمد بن تغلق کے بعد اِس کے جانشین کے ہاتھوں میں دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوگئی اور ۱۳۴۷ء میں بہمنی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ یہ حکومت ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ ۱۳۵۰ء کے بعد یہ تمام علاقے بہمنی سلطنت میں شامل ہوکر امن وامان کا گہوارہ بن گئے۔ اِس خاندان نے ۱۳۴۷ سے ۱۵۲۵ء تک اِس ملک کی تہذیب ومعاشرت اور ادب وسیاست پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ بہمنی خاندان مجموعی حیثیت سے علم دوست وتہذیب نواز تھا اِس خاندان میں کچھ اٹھارہ (۱۸) بادشاہ ہوئے جنھوں نے دو سو بیس (۲۲۰) برسوں تک حکومت کی، ان میں اکثر حکمراں علم پرور، مردم شناس اور مدبّر اور مخیّر گزرے ہیں۔ دراصل اسی عہد سے ہمیں اردو کی نثر ونظم کا پتہ چلتا ہے، اِس نئی زبان کے ابتدائی نقوش دراوڑی زبانوں میں فارسی، ترکی اور عربی الفاظ کی شکل میں آج بھی ملتے ہیں۔ دکن کی مخصوص گنگا جمنی تہذیب کی نشو ونما اور صورت گری میں سلاطینِ بہمنیہ نے اہم حصّہ لیا۔ گو یہ علمی اور ادبی سرپرستی فارسی تک محدود تھی۔ مگر عوام میں اس نئی زبان کا چرچا تھوڑا بہت شروع ہو چکا تھا۔ جس کی ترویج واشاعت میں صوفیائے کرام کا اہم رول رہا تھا اور چونکہ صوفیائے کرام علاقائی زبان میں ہی تبلیغی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ صوفیائے کرام نثر کے علاوہ شاعری میں بھی اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جن صوفیائے کرام

کے نام اِس عہد میں معروف ہوئے اُن میں حضرت برہان الدین غریبؒ، شیخ عین الدین گنج العلم، میرانجی شمس العشاق، سید محمد حسینی گیسودراز، امیر حسن سنجری، زین الدین خلد آبادی، محمد اکبر حسینی، ملاّ محمد تقی، مؤمن باللہ، حاجی رومی، نصر اللہ اور پیر جمنا وغیرہ۔ اِس عہد میں صوفیاء نے رشد وہدایت کی جو خدمات انجام دی اِس سے اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اردو کی نشو ونما جس قدر صوفیائے کرام کی مرہونِ منّت ہے، اتنی کسی اور طبقے کی نہیں، گو اُن کی لسانی کاوشوں کا مرکز مذہب تھا مگر تشکیلِ زبان کو جو فائدہ پہنچا وہ بہت اہم ہے۔

ہر چند کہ اِن صوفیائے کرام کی مادری زبان فارسی تھی مگر ضرورت ومصلحت سے مجبور ہوکر کوشش کرتے تھے کہ عوام ہی کی بولیوں میں باتیں کریں، اِس وجہ سے دہلی کی مروّجہ عوامی بولی میں گفتگو کرتے تھے۔ چنانچہ دکن میں بھی یہی ہوا، دکن کی خاص بولیوں میں گفتگو کرنا کچھ دشوار عمل تھا۔ لہذا انھوں نے اِسی زبان کو ترجیح دی جو شمالی ہند میں عوام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اِن بزرگوں کا دائرۂ اثر اتنا بڑھا کہ لوگوں نے عقیدت مندی کے لحاظ سے اِن صوفیاء ہی کی زبان کا اتباع کرنے میں خوشی محسوس کی۔

بہمنی سلطنت کا زوال ہوا تو اِس کی خاکستر سے پانچ نئی اور خود مختار حکومتوں کا لبادہ تیار ہوا، جن میں (۱) بیدر کی بریدشاہی (۲) احمد نگر کی نظام شاہی (۳) برار میں عماد شاہی (۴) بیجاپور میں عادل شاہی اور (۵) گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومتیں منظرِ عام پر آئیں۔ اِن پانچوں سلطنتوں نے اپنی خود مختاری کا نقارہ بجا کر مستقل سلطنتوں کی شکل میں تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوگئیں۔ مگر تمدّنی اور ادبی روایات جو سلاطینِ بہمنیہ نے قائم کی تھیں وہ اِن خود مختار حکومتوں نے بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ علماء کی سرپرستی، فنونِ لطیفہ کی قدردانی اور شعر وسخن سے دلچسپی کم وبیش ہر سلطنت میں باقی رہی۔ اِن میں کچھ ایسے بادشاہ بھی تھے جو نہ صرف شعراء کی قدردانی کے لئے مشہور ہوئے، بلکہ خود بھی بحیثیت شاعر شہرت پائی۔ لیکن عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے خاتمے کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر کی جانب سے یہاں دکن میں صوبے دار مقرر ہونے لگے اور ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۶ء میں یہ تمام علاقہ بیجاپور اور گولکنڈہ وغیرہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوگئے اور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اِس متحدہ سلطنت کو کوئی حکمراں سنبھال نہ سکا اور آخرکار اِس کے بھی ٹکڑے ہوگئے اور بالآخر ۱۱۳۶ھ میں دکن میں ایک طرف نظام الملک آصف جاہ اور دوسری طرف مرہٹہ حکومتیں برسرِ اقتدار رہیں۔ اِن سلطنتوں کی علمی اور ادبی خدمات کے متعلق نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''غرض زبانِ اردو اور ادب کی جو خدمت اِن سلطنتوں نے انجام دی ہیں وہ تاریخ

اردو میں آبِ زر سے لکھی جائے گی اور جب تب زبانِ اردو کے جاننے والے اِس
پردۂ عالم پر موجود رہیں گے اِن سلطنتوں کے احسان کے منّت پذیر رہیں گے'' ۔[۳۳]

دکن کے تمام سلاطین میں سے بعض نے ایرانی علماء کے زیرِ اثر فارسی زبان کی سرپرستی کی کیوں کہ یہ تمام تر سلاطین ترکی اور ایرانی نژاد تھے اور بعض سلاطین نے اردو کی ترویج واشاعت میں بطورِ خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ لہٰذا دکن میں ایرانی اور دکنی ثقافت کا ایک دلکش امتزاج بن گیا۔ اور دونوں مقامات کی تہذیب وتمدن باہم شیر وشکر ہوگئے۔ اِس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب اور زبان کی سطح پر بھی یہی تہذیبی امتزاج نمایاں ہوا اور ہند ایرانی تہذیب سے تربیت یافتہ نئی ہندوستانی زبان اور اُس کا ادب مقبول ہوا اور اسی تہذیبی سنگم نے دکن میں اردو ادب کو فروغ دیا۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں۔۔۔

''اِس دور میں دکنی ''ریختہ'' بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ نہ اب وہ ویسی دکنی رہی ہے جیسی ہمیں قلی قطب شاہ، غواصی اور ابنِ نشاطی کے ہاں نظر آتی ہے اور نہ ویسی ''ریختہ'' جو ہمیں آئندہ دور میں ولؔی، سراؔج، داؤؔد اور قاسؔم کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ زبان نئی تشکیل کے دور سے گزر رہی ہے'' ۔[۳۴]

اِن حکمرانوں نے اپنی سلطنت کو برقرار رکھنے کی ذہنی کش مکش اور سیاسی انتشار کے باوجود تعمیری وتہذیبی تحریکات کو اپنی قابلیت سے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اُن کی سرپرستی اتنی عام ہوئی کہ ہندوستان سے باہر کے علماء اور ماہرینِ فن فیضیاب ہونے کے لئے دکن اور بیجاپور میں جمع ہوتے رہے۔ ایران، عراق، عرب، آزربائیجان وغیرہ کے اہلِ کمال برابر اِس شہر کی ثقافتی محرکات میں حصّہ لیتے رہے۔ اِس طرح ہندو اور مسلم کی مشترکہ تہذیب سے ایک نیا معاشرہ نشو ونما پاتا رہا۔

بہر حال دکن کی تمام حکومتوں کے زمانے میں مختلف علوم وفنون کی ترقی ہوتی رہی۔ تاریخ ہو یا فلسفہ یا ریاضی، اِن سے قطع نظر افسانوں یعنی منظوم داستانوں اور نثری داستانوں کا ذخیرہ اِن حکومتوں کے علمی شغف اور علم کی سرپرستی کا شاندار کارنامہ ہے۔ جس میں شاعری، مصوّری، نقاّشی، بت تراشی، موسیقی اور فنِ تعمیر وغیرہ شامل ہیں۔ اِس تمام عہد میں شعراء اپنے افکار کو نظم کا خوبصورت جامہ پہناتے رہے۔ سلاطین کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی، خوشی کی تقریبوں، شادی بیاہ، ولادت، تخت نشینی، تہواروں اور دیگر سماجی رسوم پر موسیقی کا خاص انتظام کیا جاتا تھا۔ اِسی طرح مصوّری سے لگاؤ بھی اِن سلاطین کا خاص شوق تھا۔ فنِ تعمیر سے لگاؤ بھی اِن تمام

سلاطین کے یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اِن تمام سلاطین نے اپنے درباروں کے دروازے بلا امتیاز مذہب وملّت ہر اہلِ علم وفن کے لئے کھول دیئے تھے۔ بعض سلاطین نے تو ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کی عورتوں سے شادیاں کیں، بہترین محلات اور باغات تیار کروائے، عوامی فلاح وبہبودی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے رفاہِ عام کے بہت سے کام بھی بخوبی انجام دیئے، عبادت گاہیں، مدارس، کتب خانے، شفاء خانے وغیرہ تعمیر کروائے۔ اِن سلاطین نے علمی مباحث میں شرکت، شعروشاعری سے دلچسپی، صوفیاء کی سرپرستی، تخت نشینی اور تیہواروں کے موقعوں پر ہونے والی رسوم وغیرہ کے ذریعے اردو زبان وادب کی سرپرستی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ ۔۔۔

''اِن تمام بین قومی اور بین لسانی قدر افزائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی فضاء اردو کے لئے بہت سازگار بن گئی۔'' ۵

اِس پورے دور میں شعراء کو بادشاہوں کا قرب حاصل رہا، اِسی تقرب و وابستگی کے زیرِ اثر شعراء اپنے تخلیقی فن پارے سے ادب کو تقویت بہم پہنچاتے رہے۔ نیز اپنی مثنویوں، قصیدوں اور مرثیوں سے دکنی ادب کو مالامال کیا۔ اِس عہد میں بادشاہوں نے بھی شاعری کے میدان میں دادِ سخنوری دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اِس دور میں محمودؔ، وجہیؔ، غوّاصیؔ اور ابنِ نشاطیؔ گولکنڈہ کے مشہور شعراء تھے، دوسری طرف بیجاپور کے شعراء میں مقیمیؔ، رستمیؔ، ملک خوشنودؔ، نصرتیؔ اور ہاشمیؔ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ شعراء نے جو تخلیقی مواد چھوڑا ہے اس کی بدولت دکن کی مختلف گوشہ ہائے تہذیب وثقافت نمایاں ہوئے ہیں۔ دکنی شعراء نے اپنے ماحول اور اپنے مخصوص تمدّن میں غزل کے فنّی خدوخال ابھارے ہیں۔ اگرچہ باکمال شعراء کی اصل پسند صنفِ مثنوی ہے۔ مگر اِن شعراء نے غزلیں کہہ کر اِس صنف کو بھی سرخ رو کیا ہے۔ اور ہر چند کہ بعض جگہ فارسی اور ہندوی عناصر کی آمیزش سے کلام زیادہ مستحسن معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اِس کے باوجود پورا دکن ایرانی عالموں، مذہبی پیشواؤں اور ادیبوں سے بھرا ہوا تھا اِس لئے فارسی لسانی، عروض، روایات وغیرہ آسانی سے دکنی روپ میں شامل ہوگئیں تو جابجا اِن روایات کا استعمال کیا جانے لگا۔

اردو ادیبوں نے نہ صرف فارسی الفاظ واصناف کو اپنایا بلکہ فارسی ادب کے معیار تک پہنچنے کے لئے اپنی تخلیقات ایرانی اسالیب وتخیّلات سے سنوارنے کی کوشش کی، اُن کی نظریں زیادہ تر فارسی کے محبوب نمونوں کی طرف ہی گئیں۔ یعنی انھوں نے قصیدے میں خاقانیؔ، انوریؔ اور عرفیؔ، مثنوی میں فردوسیؔ، نظامیؔ اور جامیؔ اور

غزل میں سعدیؔ، خسروؔ اور حافظؔ کو پیشِ نظر رکھا۔ اِس طرح تمام دکن میں شمالی ہند کی طرح ایرانی تہذیب کی چھاپ پڑی تھی۔ بزم میں ساقی وشراب، ساقیان، لالہ، محبوب کی جلوہ گری ہندوستانی تہذیب پر اپنے اثرات مرتّب کر رہی تھی۔

یوں تو اردو غزل کا تاریخی دور امیر خسروؔ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی وفات ۱۳۲۵ء میں ہوئی۔ تاریخوں اور تذکروں میں اُن کی دو ''ریختہ'' غزلیں ملتی ہیں جن کے اشعار مندرجۂ ذیل ہیں۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

مذکورہ شعر میں سیدھے سادھے الفاظ کے ذریعے عشق وعاشقی کے وہ معاملات اور واردات رقم ہوئے ہیں جو فارسی اور اردو غزل کا سرمایۂ کمال ہیں۔ اِن میں انھیں مضامین کی صدائے بازگشت ہے جو ایرانی شعراء کا طرّہٗ امتیاز تھا۔ جسے بعد کو سلطان قلی قطب شاہ نے اپنایا۔ دکن میں غزل کی ابتدائی تاریخ محمد قلی قطب شاہ، وجہیؔ،، نصرتیؔ، غواصیؔ اور شاہی جیسے فنکاروں سے شعری افکار اور وجدانی تجربات سے مزیّن تھی۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ (۱۶۵۸ء تا ۱۷۲۱ء) کی شاعری کا اصل مزاج ہندوستانی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے لباس، زیورات، طرزِ معاشرت اور تہذیبی اقدار کی ایسی کامیاب عکّاسی کی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود یہ تصویریں آج بھی دھندلی نہیں ہوئیں، محمد قلی قطب شاہ کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے۔

منج عشق گری آگ کا یک چنگی ہے سورج
اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

لطافت بیش ہے دن دن سو اس سروہی قدسوں
پیالہ آس کا میرا سو بھر سمدور کر ساقی

قلی قطب شاہ پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہے جنھوں نے تقریباً تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے احساس کو کسی حد تک نظم کی شکل میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اُن کی نظموں میں روایتی

تقلید کے بجائے اُن کے اپنے جذبات کی جھلک ملتی ہے۔ دکنی دور میں نظم کے جو نمونے مثنوی، مرثیہ، اور قصیدہ وغیرہ قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں اُن میں تصوّف، تاریخ اور سماجی مسائل اور واقعات کا بیان ملتا ہے۔ یہ وہ روایات تھیں جس نے طویل نظم کے لئے راہیں ہموار کیں۔ دراصل طویل نظم انسانی زندگی کی ایک مکمّل یا ایک نا مکمّل داستان سے مماثل ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی کثیر الجہت زندگی، اُس کی تہذیبی، معاشی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں شاعر کے فکر و تشویش کا اظہار بھی اُسے کئی وسعتوں سے ہمکنار کرسکتی ہیں۔

چوں کہ طویل نظم موضوع اور مسائل کے اعتبار سے ہمہ گیر ہوتی ہے اور شاعر کا تخیلی رویّہ بھی وسیع ذہنی اور فکری پس منظر کا حامل ہوتا ہے اس لئے فطری طور پر نظم کا کینواس بھی وسیع ہوجاتا ہے اور اسی وجہ سے اشعار اور مصرعوں کی تعداد عام نظموں سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ اردو میں طویل نظم اُس وقت کی اہم ضرورت تھی اور زمانے کی شکست و ریخت، سماجی وسیاسی مسائل، مادّی حالات اور فطری ضروریات، طویل نظم کی اصل محرک بنی۔ اردو میں طویل نظم نگاری کا آغاز دکنی شاعری میں غیر شعوری طور پر ہوچکا تھا۔ متعدّد شعراء نے ایک ہی موضوع سے متعلق مسلسل اشعار کہنے کی ابتداء کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ اور شہر آشوب اس دور کی اہم اصناف ہیں۔ اِس دور کے بیشتر شعراء نے مثنوی نگاری کی طرف توجّہ دی کیوں کہ یہ ایک بیانیہ نظم کی صورت ہے۔

فخر الدّین نظامؔی کی مثنوی ''کدم راوَ پدم راوَ'' نہ صرف دکن کی اوّلین شاہکار مثنوی قرار دی جاسکتی ہے بلکہ اُسے اردو نظم کی اوّلیت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس کے بعد اشرفؔ کی ''نوسرہار'' اور فیروزؔ کی'' توصیف نامہ'' سب سے اہم مثنویوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ دکنی شعراء نے جو مثنویاں لکھی ہیں اُن سے دکنی تہذیب اور ثقافت کے مختلف گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔

شعرائے عادل شاہی نے مقیمؔی کی ''چندر بدن''، رستمؔی کا ''خاورنامہ''، قدرتؔی کا ''قصص الانبیاء''، ملک خوشنودؔ کی ''بازارِ حُسن''، نصرتؔی کی ''گلشنِ عشق'' اور ''علی نامہ''، حاشمؔی کی ''یوسف زلیخا'' اور قطب شاہی شعراء میں وجہؔی کی ''قطب مشتری''، غوّاصؔی کی ''چندا ولورک'' اور ''سیف الملوک و بدیع الجمال''، ابنِ نشاطؔی کی ''پھول بن''، طبعؔی کی ''بزم گل اندام'' وغیرہ نے ایسی مثنویاں تصنیف کیں، جس میں اُس زمانے کی معاشرتی زندگی اور تہذیبی وتمدنی قدریں آئینہ ہوگئی ہیں۔ نیز رزم وبزم کے واقعات بھی نہایت شرح وبسیط کے ساتھ

سامنے آگئے ہیں۔ اِس ضمن میں عبد الستار دلوی رقم طراز ہیں ۔۔۔

''بہمنی سلطنت کی شمع بجھی تو دکن میں پانچ خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جن میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں نے ادب نوازی اور فن پرستی میں ایک خاص امتیاز حاصل کرلیا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور قدردانی نے اِن دونوں سلطنتوں میں اچھے فنکار پیدا کئے اور یہیں سے دوسری اصناف کے پہلو بہ پہلو غزل گوئی کی باقاعدہ اور منظم کوششوں کی ابتداء ہوتی ہے۔''٦

اس دور کے شعراء نے ہندوستان کے ماحول، یہاں کے مناظر، سبزہ زاروں، قدرتی مناظر، پھلوں اور باغوں کی خوبصورت مصوّری کی ہے۔

دکن میں صنفِ مثنوی کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ دکنی ادب کا ایک اہم باب ہے۔ کیوں کہ دکن میں مثنویاں ادبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ چونکہ سلاطین خواندہ اور صاحبِ ذوق تھے اور شعر وسخن کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بھی آگاہ تھے اِس لئے اُن کے شایانِ شان مثنویاں گزرائی جاتی تھیں۔ گولکنڈہ میں بزمیہ اور رزمیہ، مذہبی اور اخلاقی مثنویاں اصحابِ فن وکمال کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں۔ اِن مثنویوں کے موضوعات سیر وتفریح ، شکار، زیوروں کی تعریف، باغ کی تعریف، حُسن وجمال وغیرہ چھوٹے چھوٹے عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مثنوی کے مقابلے میں صنفِ غزل دکن میں مقبولیت حاصل نہ کر پائی۔ جو کہ دکنی شعراء نے صنفِ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اِن مثنوی نگاروں نے منہ کا مزہ بدلنے یا اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دینے کے خیال سے ہی غزلیں کہی ہیں۔ اِس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تنگ نائے غزل کے سبب مثنوی میں قلم کی جولانیاں اور فن کی کرشمہ سازیاں پیش کرنے کے مواقع زیادہ مل جاتے ہیں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاہی حکمرانوں کی سرپرستی میں مثنوی اور ادب کی دوسری اصناف کے علاوہ مرثیے کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔ جس کے ابتدائی نقوش پندرہویں صدی عیسوی کے وسط سے ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ دکن میں مرثیے کے فروغ کے بنیادی محرّک بہمنیوں کے آخری زمانے میں حکمرانوں کا شیعت کی طرف رجحان تھا۔ بہمنیوں کے آخری دور میں ایران کے کئی علمائے دین دکن آئے جو اثنائے عشری مذہب کے پیرو تھے۔ بہمنیوں کی درباری وسرکاری زبان فارسی تھی۔ اس لئے ان علماء کی بڑی قدر ومنزلت کی جاتی تھی۔ اِن علماء کے علم وفضل کے ساتھ ساتھ اُن کے معتقدات کا بھی اثر دربار اور اہلِ دربار پر پڑنے لگا۔ چنانچہ بہمنی

سلطنت کے زوال کے ساتھ منظرِ عام پر آنے والی پانچ خود مختار شاہی سلطنتوں کی تہذیبی اور ادبی روایات کے ساتھ ساتھ شیعہ عقائد بھی تر کہ میں چلا آیا۔ قطب شاہی خاندان کے حکمراں ابتداء سے ہی شیعہ عقائد کے پیرو رہے تھے اور یہ خاندان گولکنڈہ کی سلطنت پر تقریباً دو سو سال تک حکومت کرتا رہا تھا تو ظاہر ہے کہ ان دو صدیوں میں شیعہ عقائد کے ساتھ ساتھ صنفِ مرثیے کا فروغ بھی لازمی طور پر ہوتا رہا۔ اور مراسم عزاداری میں کچھ روایات کی بھی نشوونما ہوئی اور چونکہ ماتم، بُکا، نوحہ خوانی، سینہ کوبی کا رواج ایران میں عام تھا اور ایران میں شبیہوں، تعزیوں اور علمبرداری کا رواج بھی تھا۔ لہٰذا ایران سے ہندوستان میں آنے والے علماء کے ساتھ ساتھ یہ عقائد بھی یہاں پہنچے۔ لیکن رفتہ رفتہ دکن میں اِن رسوم کے نئے خدوخال ابھرنے لگے۔

دکن میں ایرانیوں کی کثرت اور اُن کے اثر واقتدار کا لازمی نتیجہ سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثرات کی شکل میں نمایاں ہوا۔ اپنے مذہبی رسوم اہتمام سے منانے کے لئے خود اُن کی تعداد دکن میں کم نہیں تھی، پھر ایرانی علماء اور مشائخ اپنے اپنے دائرۂ اثر سے معتقدین کا دائرہ بڑھاتے جارہے تھے، منّتیں اور مرادیں حاصل کرنے کا جذبہ عام ہوتا جارہا تھا۔ لوگ اِسی کے سہارے بہت سی مذہبی اور نیم مذہبی رسموں کے پابند ہوتے جارہے تھے۔ اِسی بناء پر یہ قیاس کرنا غلط نہیں ہے کہ ایرانیوں کی رسمیں مقامی باشندوں نے بھی اختیار کرلی ہوں اور اِن رسوم کو معاشرت میں اور زیادہ وسعت حاصل ہوگئی ہوگی۔ دکن میں محرّم اور عزاداری کی مخصوص روایات کی ابتداء کے بارے میں محمود خاں محمودؔ مؤلّف ''تاریخ جنوبی ہند'' کا خیال ہے کہ یہ ہندوؤں اور خاص طور پر مرہٹوں کی اتباع کا نتیجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔۔۔

> ''جنوبی ہند میں محرّم جس صورت میں منایا جاتا ہے اُس کا آغاز اُس زمانے میں ہوا جب کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں پر مغلوں نے حملے شروع کئے تھے۔ مغلوں سے بچاؤ کے لئے اِن سلطنتوں نے ضروری سمجھا کہ مرہٹوں اور ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملالیا جائے۔ دکن کی اِن اسلامی سلطنتوں میں مرہٹواڑی کے قرب وجوار میں رہنے کی وجہ سے مرہٹوں کا بہت زیادہ اثر ہوچکا تھا اور یہاں کے مسلمان بہت سے مرہٹی رسوم اختیار کر بیٹھے۔'' [۷]

ممکن ہے موصوف کے بیان کی کچھ ٹھوس وجوہات ہوں لیکن دکن میں مرثیے کے فروغ کی ایک اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ دکن میں شیعہ عالموں کی ایران سے آمد کے ساتھ ایرانی اثرات دکن میں پھیلنا شروع ہوگئے

اور لاشعوری طور پر ہی سہی ایرانی عقائد کی طرف دکن کے لوگوں کا ذہن مائل ہوتا رہا۔ لہٰذا دکن کے تمام بڑے مثنوی گو شعراء نے صنفِ مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی اور اِس صنف کو فروغ دیا۔ گولکنڈہ سلطنت کے آخری زمانے میں دکن کی خودمختار سلطنتوں پر دہلی کا شہنشاہی دباؤ بڑھ گیا تھا اور عادل شاہی حکومت کے خاتمے کے ساتھ گولکنڈہ اور دیگر مقامات میں بے امنی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ گولکنڈہ کے شعراء جہاں پہلے بلند پایہ ادبی کارنامے پیش کر چکے تھے اب یا تو مذہبی تصنیفات کی طرف متوجّہ ہونے لگے تھے یا پھر مرثیہ نگاری کی طرف راغب ہوگئے۔ کیوں کہ اُن کے نزدیک دنیاوی اعتبار سے بھلے ہی اس سے کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن آخرت میں نجات کا ذریعہ ضرور تھا۔ گویا اِن سیاسی حالات کی وجہ سے بھی فنِ مرثیہ کے فروغ کے امکانات زیادہ روشن رہے لیکن ۱۶۸۷ء میں قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے خاتمے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کی جانب سے یہاں صوبہ دار مقرر ہونے لگے اور اورنگ زیب نے دکنی سلطنت کو ختم کر کے ۱۰۶۲ھ میں ''اورنگ آباد'' کو اپنا صدر مقام بنایا۔

اورنگ زیب کی فتح دکن کے ساتھ ہی دکن میں مرثیہ اور شیعہ عقائد کے فروغ کے امکانات تاریک ہوگئے۔ مغلوں نے قطب شاہی محرم سے بہت سی چیزوں کو دور کردیا۔ دکن میں مغلیہ سلطنت کا تسلّط ۱۶۸۷ء سے ۱۷۳۲ء تک جاری رہا۔ پروفیسر عبد القادر سروری نے اُس وقت کی ادبی فضاء کا صحیح تجزیہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں ---

> ''پرانے زمانے میں عوام کی وفاداریاں شخصی یا خاندانی ہوتی تھیں، اصول کے ساتھ لگاؤ کی بہت کم مثالیں مل سکیں گی۔ اپنے حکمرانوں کے ختم ہوجانے کے بعد عوام کے ذہنوں پر جو پژمردگی چھاگئی تھی اُس کے نمائندے دراصل یہ شاعر ہیں۔ تصوّف ناکام تمناؤں کا ایک سہارا ہوسکتا ہے اور مذہبی موضوع شاعر کے لئے روحانی تسلّی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ اُس زمانے میں کچھ مرثیہ نگار بھی تھے جو شہدائے کربلا کے مصائب پر آنسو بہا کر دراصل اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔''[۸]

عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں کے خاتمے نے بہت سے شاعروں اور مرثیہ نگاروں کو منتشر کردیا اور وہ دکن کے گرد ونواح میں گجرات، کرناٹک، کرنول وغیرہ میں چلے گئے۔ جہاں شعر وسخن کی بزم آراستہ کرنے میں اپنا بھرپور تعاون کیا۔ دکن میں چونکہ مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کے فروغ پر ایرانی اثرات غالب تھے

اور یہ اصنافِ شاعری چونکہ فارسی اور عربی سے منتقل ہوئی تھیں۔ اسی طرح اردو غزل کے ابتدائی نقوش میں بھی فارسی کے اثرات کا غلبہ تھا۔ گویا دکن میں اردو غزل گوئی فارسی روایت کا ایک نیا باب تھا اور اس میں اجتہاد کے بجائے تقلید و تتبع کا چلن عام تھا۔ نہ صرف یہ کہ فارسی غزل کی ہیئت بلکہ اس کے مضامین، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات بھی مستعار لے لی گئی تھیں۔ اس دور کی اردو غزل تجربے کی جدّت اور خود روانی کی کیفیت سے بڑی حد تک نا آشنا بھی تھی اور پھر چونکہ فارسی غزل کو ہندوستانی زبان میں منتقل کرنے کا تجربہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا اردو غزل کے ابتدائی مراحل میں اس کو ہیئت کے اعتبار سے تو یقیناً غزل کا ہی نام ملے گا۔ لیکن مجازاً یہ ایک ایسی فضاء کی غمّاز تھی جس میں شعوری طور پر درآمد کئے گئے فارسی مضامین کے ساتھ ساتھ یہ غیر شعوری طور پر ایرانی مزاج کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ گویا ایران اور ہندوستان کے درمیان ایک ثقافتی رشتہ قائم ہوگیا تھا۔

تہذیبی قدروں، رواجوں اور رسموں کے لحاظ سے یہاں کچھ اختلاف تھا۔ مگر روایت کی بنیاد ایک ہوگئی تھی۔ رہن سہن، تہوار اور شادی بیاہ میں زیادہ فرق نہ تھا۔ رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے سماجی و تہذیبی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر اس کا جو پہلو روایات، تہوار اور شادی بیاہ کے رسوم سے وابستہ ہوتا ہے وہ صدیوں کے بعد بھی بنیادی طور پر ایک سا رہتا ہے۔ چنانچہ جو رسم و رواج ایران میں رائج تھے قریب قریب وہ تمام دکن اور شمال میں رائج ہوگئے تھے۔

گذشتہ صفحات میں دکنی معاشرے کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ دراصل شاعر کے ذہنی نشو و نما کا جز و بن جاتی ہے۔ وہی سارا سامانِ نشاط و آرائشگی شعراء کے خیالات و شاعری کا مواد بن جاتا ہے، رسم و رواج اور تہوار، اُن کے شعری محرکات کی بنیاد ہوجاتے ہیں۔ حُسن و عشق کی داستانیں جو وہ دیکھتے ہیں وہ اُن کی طبعِ رسا کی غذا قرار پاتی ہے۔ گویا اُن کی شاعری کی خمیر میں وہ مذاقِ معاشرہ شامل ہے جو تمدّنی فضاء کا پروردہ ہے اور یہی مذاقِ زمانہ اُن کی فکرِ رسا کو اتنا متاثر کرتا ہے کہ وہ اپنے طور پر اُس کو قلم بند کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ۔۔۔

> ''تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک تہذیب یافتہ قوم فاتحین سے شکست کھا کر پسپا ضرور ہوجاتی ہے۔ لیکن اُس کی تہذیب دیکھتے ہی دیکھتے خود فاتح کی تہذیب کو فتح کرلیتی ہے۔ تہذیبی فتح زمینی فتح سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔'' ۹

اِس طرح دکن کے تمام معاشرے پر چھائی ہوئی تمدّنی فضاء، ماحول کی تفریحات، ملبوسات، زیورات

وغیرہ جن کے زیرِ اثر شاعر کا ذہن پرورش پاتا ہے وہ اُسے اپنے طور پر اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ یہ تمام معاشرے کے عام چلن جو شاعر کے مختلف حسّیات کو برانگیختہ کر کے جذبات کو نظم کی صورت میں پیش کرنے پر مائل کرتے ہیں اور اُس کے ذہن کو بالیدگی اور زبان کو گویائی عطا کرتے ہیں۔ اِن تمام باتوں کے بعد جب ہم اُس وقت کی دکنی اردو شاعری کے مواد ومحرکات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے خیالات اور جذبات کو شعر کا جامہ پہنانے میں اُس وقت کا تمدّن ہی شاعری کا سب سے بڑا مواد تھا۔

ہندوستان اور بالخصوص دکن میں زندگی، رسوم وعقائد، رہن سہن، وضع قطع میں جس طرح شب وروز گزار رہی تھی یہی سب روداد ہمیں اُس وقت کے شاعروں میں کم وبیش نظر آئیں گی۔ اِس قسم کے موضوعات پر کہی گئی شاعری کا بڑا حصّہ مسلسل نظم پر مشتمل ہے۔ لیکن بعض جگہوں پر غیر مسلسل نظم بھی پائی جاتی ہے۔ جسے اُردو غزل کی ابتدائی شکل کہا جاسکتا ہے اور جو آگے چل کر اردو ادب کی سب سے شاندار اور مقبول صنفِ سخن قرار پائی۔

دکن میں غزل کے مقابلے میں مثنوی کا پلّہ گراں نظر آتا تھا۔ کیوں کہ دکنی اردو جس ادبی ماحول میں ارتقائی مناظر طے کر رہی تھی۔ خاص کر ابتدائی عہد میں اِس کے اردگرد ہندوستانی زبانیں تھیں۔ جن کے ادبی خزانے میں زیادہ تر مسلسل نظموں کا سکّہ رائج تھا۔ کیوں کہ اِس دور میں شاعروں کے سامنے فارسی کی مثنویاں اور قصیدے موجود تھے جس میں ایک ربط اور تسلسل تھا۔ اِسی انداز میں اپنی کسی بات کو پیش کرنے میں شاعروں کے لئے مسلسل نظمیں زیادہ مفید اور کارآمد تھیں۔ جس میں وہ اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتے تھے۔

اس کے برعکس ابتداء میں غزل میں چونکہ اِس طرح کے مسلسل مضامین باندھنا دشوار تھا، نیز اِس نئی ابھرتی اردو زبان میں غزل کے ہر نئے شعر میں نئے خیالات پیش کرنا شعراء کے لئے بھی مشکل تھا اور عوام کو سمجھنا بھی محال تھا اس لئے شعراء نے مثنوی اور قصیدے کو زیادہ اہمیت دی۔ کیوں کہ اِن دونوں اصناف میں اپنے خیالات پیش کرنے کے مواقع زیادہ وسیع تھے، اس لئے شعراء نے بطورِ خاص مثنوی پر زیادہ توجّہ دی۔ یہی وجہ تھی کہ قصیدہ کسی خاص موقع یا شخص کے لئے مخصوص ہوگیا اور اِس کی ارتقائی رفتار دھیمی ہوتی چلی گئی۔ نیز شعراء کو دوسری اصناف میں ہر قسم کے جذبات اور خیالات پیش کرنے کی گنجائش نہیں بنتی تھی۔ لہٰذا شعراء نے اس صنف سے قطع نظر کرتے ہوئے مثنوی کو اوّلیت دی۔ کیوں کہ مثنوی اپنی ضخامت وتنوع کے لحاظ سے قصیدے سے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی کیوں کہ اس میں سیاسی، اخلاقی، افسانوی، رومانی، مذہبی اور تاریخی

غرض ہر موضوع پر طبع آزمائی کی جاسکتی تھی اس لئے مثنوی ہی شاعروں کی توجّہ کا مرکز بنی رہی۔

غزل چونکہ فارسی زبان کی ساختہ پرداختہ تھی اور دکنی غزل گوشعراء کے سامنے فارسی شاعروں کی غزل کا نمونہ موجود تھا۔ اس لئے بظاہر اردو زبان پر فارسی زبان اور اُس کی شعری روایات کا زبردست اثر پڑا۔ لہٰذا دکنی شعراء بھی اِس سے علیٰحدہ نہیں رہ سکے اور انھوں نے فارسی غزل گوشعراء کے موضوع ومعیار کو اپنایا۔ اِس کے ساتھ فارسی الفاظ، تراکیب، محاورے وغیرہ کا بھی بڑی ہی بے تکلفی سے استعمال کیا۔ یہی سبب ہے کہ دکنی شعراء کے کلام میں ہندوی اور فارسی دونوں زبانوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

اِس بات میں کوئی کلام نہیں کہ اردو کو پروان چڑھانے والے زیادہ تر لوگ فارسی زبان کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اُس کی ہر صنف کی تقلید کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ لہٰذا فارسی غزل جو اپنا پورا عکس اردو پر ڈال رہی تھی، اردو غزل مزاج و مذاق کے لحاظ سے فارسی غزل سے بہت کچھ اثر پذیر ہوتی رہی۔ لہٰذا دکن کے غزل گوشعراء کے یہاں بھی اِس کے نشانات واضح نظر آتے ہیں۔ چنانچہ طرزِ تخیل، طرزِ بیان، جذبات نگاری کے لئے ہمارے ہندوستانی شعراء نے اردو غزل کو ایرانی اندازِ فکر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

دکن کی غزلوں میں جابجا ایسے نشانات ملتے ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ دکنی اردو غزلوں نے اپنے ماحول کا اثر ضرور قبول کیا ہے لیکن فارسی زبان کے اثر سے دامن نہیں بچا سکی۔ یوں ہماری اردو غزل روایت، موضوع، مواد، ہیئت اور لہجے کے اعتبار سے فارسی غزل کی آوردہ اور پروردہ ہے۔ فارسی غزل کے متعلق الطاف حسین حالؔی اِس طرح رقم طراز ہیں ---

> ''جن لوگوں نے غزل کو چمکایا اور مقبولِ خاص وعام بنایا یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہلُ اللہ اور صاحبِ باطن یا کم سے کم عشقِ الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سعدؔی، رومؔی، خسرؔو، حافظؔ، عراقؔی، مغربؔی، احمد جاؔم، اور جامؔی وغیرہ۔ اُن کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہراً الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشقِ مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے، وہ عشق ومحبت کے رنگ میں شرابور تھے۔ اُن کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جسے روحانیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اُن کی غزل سُن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔''[۱۰]

دکنی غزل گوشعراء نے فارسی شاعری کی تقلید ضرور کی لیکن اُس کی بنیاد پوری طرح ہندوستانی روایت پر رکھی۔ دکن میں ہاشمی بیجاپوری کی غزلوں سے اُسے نیا لہجہ ملا۔ لیکن یہ تمام مضامین اور خیال انھیں فارسی غزلوں سے روشنی لئے ہوئے ہیں۔ اُن کے بعد آنے والی نسلوں نے بھی اِنھیں فارسی شعراء کے برتے ہوئے مضامین سے اپنی غزلوں کو آراستہ کیا۔ فارسی شعراء نے محبوب اور معشوق کی اصطلاحوں میں جہاں معشوق، محبوب، صنم، دلربا وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں وہیں دکنی شعراء نے اپنے محبوبِ ارضی کو پیو، سجن، گوری سہیلی، موہنی، سندری، پدمنی اور پیاری جیسی ہندوستانی اصطلاحات دے دی۔ اور عشقیہ اصطلاحات میں راز و نیاز، ناز و انداز، عشوہ یا غمزہ اور محبوب کی فرقت سے بے قراری اور اُس کے ملن کے امکان اُردو غزلوں میں فارسی غزل کی طرز پر ہی ادا کئے گئے ہیں اور بعض مقامات پر اِس کا اظہار عورت کی جانب سے بھی کیا گیا ہے۔

مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

ے سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیاں کا پرونے ہار بیٹھوں گی
انو یہاں آؤ کہیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اُٹھی ہور بیٹھتی جب گھڑی دو چار بیٹھوں گی

ے پیا باج پیالا پیا جاے نا
پیا باج یک تل جیا جاے نا (قلی قطب شاہ)

ے چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا
کہ اس بن نیں ہمیں یکتل قرارا (قلی قطب شاہ)

ے طاقت نہیں دوری کی اب تو بیگی آمِل رے جا
تجھ بن منج جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا (وجہی)

ے بولیا میں کئی دنوں میں تیری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر یونچہ کتک ماہ وسال بول (نصرتی)

مذکورہ اشعار میں ہندوستانیت کی مکمل چھاپ دکھائی دیتی ہے اور اِس کی وجہ بھی وہی ہے کہ دکن کے

غزل گوشعراء کے پیشِ نظر ایرانی شعراء کی روایت موجود تھی اور اُردو شعراء منتہائے کمال اِسی کو سمجھتے تھے کہ فارسی شعراء کی روایت اور تقلید کر کے اُن کے ہم پلّہ ہو جائیں۔ لہٰذا ایرانی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کو آزادانہ نشوونما اور اپنی راہ بنانے کا موقع جلد نہ مل سکا۔ اُردو غزل کو ابتداء میں فارسی شاعری سے جو علامتی نظام ورثے میں ملا تھا وہ اُس کی ضروریات کے لئے بہت کافی تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہی میں جب خطّۂ دکن شاعری کا مرکز تھا، غزل کے ہندوستانی خد وخال نمایاں ہونے لگے تھے۔ دکنی شاعروں کے یہاں غزل کا رشتہ ایک طرف فارسی سے استوار تھا تو دوسری طرف ہندوستان کے قدیم شعری روایات سے مستحکم تھا۔ بقول محمد حسین آزاد۔۔۔

> ''ولؔی وغیرہ متقدمین کے کلاموں میں ایسی (فارسی) ترکیبیں بہت ہیں بلکہ آدھے آدھے اور سارے سارے مصرعے فارسی کے ہیں۔۔۔ علیٰ ھٰذا القیاس بھاشا کے الفاظ اور ترکیبیں بھی زیادہ ہیں اور اِس طرح ہیں کہ آج لوگوں کو فصیح نہیں معلوم ہوتیں۔'' [۱۱]

دکن میں غزل گوئی کی ابتداء پر بھلے ہی فارسی روایت کا اثر رہا ہو لیکن اِس کے باوجود ہندوستانی عناصر سب سے پہلے دکنی شعراء کے یہاں نمایاں ہوئے اور سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنی شاعری میں ہندوستانی مزاج اور اور ماحول کی عکّاسی شروع کی۔ اور اپنے ذاتی رجحان اور میلان کی بنا پر مقامی تہذیب وروایات سے اپنی شاعری کو بہرہ ور کیا۔ بااین ہمہ فارسی شاعری کے اثرات سے وہ اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ اِس اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا میں جو خیالات استعمال ہونے تھے اور جو اِس ملک کے حالات کے مطابق تھے اس حد تک غائب ہوگئے کہ کوئل کی صدا اور چمیلی کی خوشبو کو لوگ بھول گئے اور صرف گل وبلبل کی توصیف ہونے لگی۔ لیکن فارسی شاعری کی تقلید کا الزام دکن کے تمام شعراء پر لازم نہیں ہوتا۔ فارسی شاعری کا اثر اور نفوذ ضرور غالب تھا لیکن اِس کے باوجود قلی قطب شاہ اور دیگر شعراء کے کلام میں فارسی اثرات بہت کم نظر آتے ہیں۔

اوّل اوّل جب دکن میں اردو غزل گوئی کی ابتداء ہوئی تو اُس وقت جذباتِ محبت کو نہایت سادہ طور پر ظاہر کیا گیا کیوں کہ اوّل تو اِس نوزائیدہ زبان میں الفاظ کا ذخیرہ بہت کم تھا اور دوسرے یہ کہ جس چیز کو سامنے رکھ کر شاعری کی گئی وہ زیادہ تر ہندی گیت، مثنوی اور قصیدے تھے۔ جن کی سادگی آج بھی اِسی حال پر قائم ہے۔ لیکن چونکہ فارسی کے اثرات بھی کچھ کچھ اِس میں شامل ہو چکے تھے اِس لئے ہندی گیتوں سے اتنا تفاوت

ضرور ہوگیا کہ عشق کا اظہار بجائے عورت کے مرد کی طرف سے ہونے لگا۔ گو بحور و اوزان اور ہیئتی سانچے فارسی شاعری کے اختیار کئے گئے۔ تاہم دکنی زبان (قدیم اردو) کے اثرات کی وجہ سے جذبات میں فی الجملہ سادگی بھی تھی۔ اور مقامی رنگ بھی زیادہ جھلکتا تھا۔ چنانچہ اِس مقامی اثرات کے نتیجے میں معشوق کو سجن یا پیا کہنا، بجائے بلبل کے پپیہا کا ذکر کرنا اور تشبیہات وغیرہ میں ملک کی وضع و معاشرت اور تہذیب وتمدن کو سامنے رکھنا اُردو کی قدیم شاعری کی نمایاں خصوصیات تھی۔ کیوں کہ علاقائی اور جغرافیائی اثرات شاعر کے دل ودماغ پر حاوی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اِس سے مختلف رویّہ شاعری میں اختیار کرنا شاعر کے لئے ممکن نہیں ہوتا، یہی کچھ اُس وقت کے ابتدائی اُردوغزل گوشعراء کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے اِس خیال کی ترجمانی اِن الفاظ میں کی ہے ۔۔۔

''ہر ملک میں جو رنگ رنگ کی اشیاء، مختلف اجناس اور مخلوقات ہیں۔ وہ حقیقت میں مختلف کیفیتیں ہیں کہ اِس سرزمین کی طبیعت یا مزاج نے باہر نکالی ہے۔ اِسی طرح ہر ملک کی زبان ایک سرزمین ہے کہ بیان کو وہیں کے اجناس واشیاء کے استعاروں میں جلوہ دیتی ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ ملک کا شاعر جو اپنی تشبیہیں اور استعارے کام میں لاتا ہے اُسے اُس کا قصداً ارادہ نہ سمجھو بلکہ اشیاء وہاں کی جو ہر دم سامنے رہتی ہیں، مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہی کو کام میں لاؤ اور ہم ہی میں مطالب ادا کرو اور وہ (شاعر) بھی جانتا ہے کہ اِسی طرح اپنے مطلب پر جلد کامیاب ہوگا۔ کیوں کہ اشیائے موجودہ کے پیرائے میں جو باتیں ادا کی جاتی ہیں، سننے والوں کے دلوں پر فوراً اثر کرتی ہیں۔'' [۱۲]

اِس سلسلے میں شعراء کی یہ کاوشیں بطورِ نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

سب عاشقاں تجھ عشق میں چوں پھول بن تارے چھپیں
حوراں، پپیہے، کویلاں، تج شوق تھے گاویں بعث (قلی قطب شاہ)

تجھ مکھ کمل پہ پھرتا ہے بھنوار ہوکر اکاس
دیوے پہ جوں پتنگ پھیرے بے خبر اکاس (قلی قطب شاہ)

مقامی اثرات کے علاوہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ خاص ہند الاصل استعمال کئے جاتے تھے اور

فارسی ترکیب کی آمیزش سے بالکل پاک ہوتے تھے۔

ے تو ں اوّل توں آخر تو قادرا ہے — توں مالک توں باطن تو ظاہرا ہے

توں مخفی توں میدی توں واحد سچّا — توں تو اب توں رب توں ماجد سچّا (وجہی)

ے تجھ مکھ کے درس کا یو سورج سو درتی ہے

تج نو جھمکے تے سب جگ میں روشنی ہے (وجہی)

ے اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں

دینے کو وصل کاہل لینے کو جیو اُتالی (نصرتی)

دکن میں مقامی زبان میں شاعری منظم طور سے اور اجتماعی طریقے پر کی گئی ہے اور اِس کی ابتداء تو سلاطینِ بہمنیہ کے زمانے سے ہی ہوگئی تھی۔ لیکن رفتار میں تیزی تو گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں قائم ہونے کے بعد آئی اور اردو غزل کی سر پرستی میں سلاطین کا بھی جمِ غفیر دکھائی دیتا ہے۔ اِن سلاطینِ وقت نے شاعرِ شاہانِ وقت کی سر پرستی میں قابلِ داد دادِ سخن دی ہے۔ جس کا واضح نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمینِ دکن میں مرثیہ، مثنوی اور قصیدے کے غلبے کے باوجود بہت سے شعراء نے اُردو غزل میں طبع آزمائی کی۔ حالانکہ اُردو غزل کے ابتدائی دور کی غزلیں زبان کے نامانوس ہونے کے ساتھ ساتھ مضامین کے اعتبار سے بھی معیاری نہیں تھی نہ خیالات میں ہمہ گیری و وسعت تھی اور نہ مضامین میں تنوع۔ بلکہ عشقِ مجازی کے چند پہلو بار بار نمایاں کئے گئے ہیں اور بس وہ بھی نہایت عامیانہ انداز میں عام جذبات اور لطیف احساسات جو غزل کے اشعار کو ہمہ گیری اور جامعت عطا کرتے ہیں تقریباً مفقود نظر آتے ہیں۔ اِس کے باوجود دکن کے اِن ابتدائی غزل گو شعراء نے اپنی کم مائیگی کے باوجود اُردو غزل کی جانب توجّہ کی تا کہ دیگر اصنافِ نظم کی طرح اِس صنف میں بھی اپنی فنّی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جاسکے۔ کیوں کہ دکنی شاعری میں قصائد کی تشبیب اور مرثیوں میں گھوڑے اور تلوار کے بیانات تک اِس کے جادو کا شکار ہوکر رہ گئے تھے۔

دکنی شاعری کے ابتدائی دور میں خلوص وصداقت، حقیقت پسندی، معصومیت وسادگی، تخیّل کی بلند پروازی اور الفاظ کی صنعت گری کم تھی۔ یہی حال اردو غزل کا بھی تھا۔ کیوں کہ ابتداء میں شعراء کے تجربات کا میدان زیادہ وسیع نہیں تھا، اُن کے پاس موضوعات کی فراوانی نہیں تھی، اِس کے باوجود اُنھوں نے جو مضامین اپنے اشعار میں ڈھالے ہیں وہ اُن کی صداقت پسند طبیعت کے مظہر ہیں۔ اُن کے کلام میں خلوص، رنگینی، اثر

آفرینی، شیرینی اور موہنی کی کمی نہیں ہے۔ یوں فن کے اعتبار سے کلام میں شادابی، روانی ہر جگہ قائم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتیؔ، وجہیؔ، غوّاصیؔ، محمد قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ، ہاشمیؔ، لطفی اور بحریؔ وغیرہ کی غزلیں بے ساختگی رنگین اور اثر آفرینی کے سبب ہر دور میں خراجِ تحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔

دکنی شعراء کے کلام میں خوبصورت استعارے اور حسین ودلفریب تشبیہیں بھی موتیوں کی طرح بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ جو فارسی سے مستعار لی ہوئی ہیں اور ایران کی معاشرت اور وہاں کے ماحول کی غمّاز ہیں۔ دوسری طرف مقامی تہذیب کے عناصر اور مقامی طرزِ فکر کی چھاپ بھی واضح نظر آتی ہے۔ زبان کی قدامت اور اجنبیت، طرزِ ادا کی ناہمواری اور کھردرے پن سے دکنی غزل گوئی کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ہر زبان کے ابتدائی ادوار میں یہ خصوصیت فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ اِس کے باوجود وہ تمام شعری سرمایہ جو دکن میں غزل کی شکل میں منظرِ عام پر آیا، اُردو ادب کا ایسا لازوال کارنامہ ہے جو ہمیشہ جواں دلوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا اور اُس کی ادبی اہمیت ہمیشہ مسلّم رہے گی۔

چونکہ اردو غزل گوئی کا اصل موضوع محبوب ہے اور سلاطینِ دکن میں بہت سے سلاطین عاشق مجاز واقع ہوئے تھے جنھوں نے اپنے محل سراؤں میں شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسّم پیکروں کو دیکھنے میں سارا وقت صرف کیا تھا اور رُخساروں کی گل گوئی و کرشمہ وادا کی سحر آفرینی سے لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیّا کیا تھا۔ جن شعراء نے پری صفت، حور پیکر، معشوقوں کے عشوہ وغمزہ کو غزلوں میں پیش کیا ہے اُن میں قلی قطب شاہ اور وجہیؔ کا نام سرِ فہرست ہے جنھوں نے اپنی غزلوں میں رنگین خیالی، مضمون آفرینی، تخیّل کی بلند پروازی، خیالات کی جدّت، تشبیہات واستعارات کی لطافت میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ دکنی شاعروں نے جہاں عشق کی لذّت کو صفائی اور ندرت سے بیان کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے وہاں جنگ وپیکار کی داروگیر کو بھی نہایت سلیقہ اور ہنر مندی سے مرتّب کیا ہے۔ دکنی شعراء نے رزمیہ، تاریخی، اور اخلاقی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور نہایت ہی خوش سلیقگی کے ساتھ مضامین ادا کئے ہیں۔

دکنی شعراء کے یہاں محبوب کا جو تصوّر ملتا ہے وہ حقیقت پسندانہ اور سچّائی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دکنی شعراء نے اپنے محبوبِ مجازی کے رنگا رنگ جلوؤں، اُس کی اداؤں اور اُس کی خوشبو سے بخوبی آشنا تھے۔ شاید اس لئے دکنی شعراء کے یہاں محبوب کی ایک متحرّک اور گویا تصویر نظر آتی ہے۔ اس لئے دکنی غزل میں تصوّرِ حسن بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ جاندار محبوب اپنی چال ڈھال، وضع قطع، زیورات وملبوسات، آرائشِ جمال وغیرہ میں بھی

ایرانی، کبھی ہندی اور کبھی دکنی نظر آتا ہے۔ محبوب کے حسن و جمال کو واضح کرنے کے لئے حُسنِ فطرت سے کام لیا گیا ہے، اُن کے کلام میں تشبیہوں، استعاروں، تمثیلوں وغیرہ سے اِن شاعروں کے طرزِ فکر اور طرزِ تخیل کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جذبات اور کیفیات کے بیان میں بھی حقیقت واصلیت زیادہ اور مبالغہ کم ہے۔

چند مثالیں بطورِ نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

ے منجے غنچے کون دیکھ یاد آوتا ہے
النکار سون سائین مسکاوتا

ے تیرے نین کا کاجلا دیکھ دھن
آپ کا جلا ہونے جلتا شمع

ے میں نہ جانوں کعبہ وبت خانہ کون
دیکھتا ہوں ہر کہاں دستا ہے تج مکھ کا صفا

ے نین ہیں دو پیاری کے جیسے مولے
بھنوان کی ترازو میں بھوچند تولے

ے نین کوں کیا ہے دو کنجن پیا کے
نین کوئی کیان چلبلاتے سنپولے

ے درس تیرا سو دین کا دیوا
لٹ تیری کفر کی ہے دیوالی

ے تج مست نازنین کی دستاں ہے لال انکھیاں
سوکیان کے لئے کٹارے گنج ناگ سون لڑے ہیں ۱۳؎

یوں دکنی غزل گو شعراء نے اپنے محبوبِ ارضی یا حقیقی کے تصوّر میں اپنی سچّی عاشقانہ تڑپ کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور اپنے محبوب کے ناز وادا، زلفوں اور آنکھوں کے لئے مختلف استعارات کا استعمال کیا ہے جو خالص دکنی طرزِ معاشرت اور ہندوستانی انداز کی عکّاسی کرتا ہے۔ جہاں تک فارسی الفاظ، تراکیب اور اصطلاحوں کا تعلّق ہے، دکنی شعراء ہندی زبان کے ساتھ اِن الفاظ، تراکیب اور اصطلاحوں کو بہتر طریقوں پر برتنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ اُن کلام میں فارسی عناصر کی آمیزش کا میل بے جوڑ اور اٹپٹا سا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایک خاص

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فارسی کے معیار وموضوعات کو کام میں لیتے ہوئے فارسی کا چربہ نہیں اُتارا گیا۔ بلکہ دکنی شعراء نے اپنے اپنے اختراعی ذہن اور خود اعتمادی کی بدولت غزلوں میں کہیں کہیں جدّت سے بھی کام لیا ہے۔ اِس اعتبار سے دکنی شعراء کی شعری تخلیقات اُردو ادب کا اَن مِٹ نقش بن گئی ہے۔

کہنے کو تو دکن میں تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی گئی ہے اور شعراء حضرات نے اپنی زبردست فنّی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن دکن کے تمام شعری اصناف کے سرمائے پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن تمام اصنافِ شاعری میں ''مثنوی'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ قصائد کا چلن بھی شاہانِ وقت کی وجہ پروان چڑھتا رہا، اِسی طرح مرثیہ بھی سلاطینِ دکن کے شیعہ عقائد سے وابستہ رہنے سے فروغ پاتا رہا، اور غزل چونکہ شاہ پسند خاصے کی چیز تھی اور خود سلاطینِ دکن نے اس کی سرپرستی میں حصّہ لیا تھا اِسی وجہ سے غالباً اہلِ کمال نے بھی اپنے ذوق وپسند کو شاہان کی پسند پر ترجیح دی۔ لیکن اِس کے باوجود مثنوی کا فن دکنی شعراء پر غالب رہا۔

جب ہم دکن کے تمام بلند پایہ شاعروں کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن شعراء کا اصل میدان تو صنفِ مثنوی ہی ہے۔ لیکن چونکہ اردو غزل بھی عالمِ وجود میں آچکی تھی اِس لئے اِن شعراء نے اپنے کلام کا جوہر دکھلانے، اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کرنے یا اپنی استادی کا لوہا منوانے کی غرض سے ہی تبرّکاً غزلیں کہی ہیں۔ تاکہ اپنی ذات کو ایک مسلّم الثبوت شاعر کی حیثیت سے پیش کیا جاسکے اور یہ الزام عائد نہ ہو کہ فلاں شاعر نے غزلیں نہیں کہیں۔ اِسی وجہ سے تقریباً دکن کے تمام شعراء کے یہاں دس بیس غزلیں ضرور ہی مل جاتی ہیں۔ اِن شعراء نے جس طرح دیگر اصنافِ نظم میں اشعار تخلیق کیے، بس اسی طرح ضمنی طور پر غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن اُردو غزل کو ایک مستقل صنف کی حیثیت سے نہیں برتا، بلکہ جزوی طور پر غزلیں کہہ کر اپنا وقار برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں اُردو غزل کو اپنا شعار نہیں بنایا۔

یوں اردو غزل کو اپنے اِس ابتدائی مرحلے میں وہ بھرپور اور مکمل زادِ راہ میسّر نہیں ہوا اِس لئے اپنے اِس ابتدائی زمانے میں غزل ایک طفلانہ اور معصومانہ سادگی کے سوا کوئی دوسری اعلیٰ ادبی خصوصیت اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ تاہم شعراء کو غزل کی وسعتوں کا احساس ضرور ہوگیا۔ ایک جانب تو یہ صورت تھی، لیکن دوسری طرف اردو غزل میں طبع آزمائی کرنے والے یہ شعراء اُس وقت ذہنی اور تمدّنی ارتقاء کے منازل سے گزر رہے تھے اور اِس نئی زبان میں ردّ وقبول کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لہٰذا ایسی نوزائیدہ زبان میں اشعار قلم بند کرنا شعراء کے نزدیک ایک بڑی آزمائش تھی اور اُنھیں اِس نئی زبان میں موزوں کلام کہنے میں شاید کچھ

دشواری بھی ضرور محسوس ہوتی تھی۔

اِس کے علاوہ اُنھیں ایک خطرہ یہ بھی لاحق تھا کہ سامعین یا دیگر عوام کو اِس نئی زبان میں شاعری پسند آئے گی یا نہیں؟ اگر عوام الناس کی ذہنی تلاش و تشنگی پر اُن کا کلام پورا نہیں اُترا تو یقیناً اُن کی اپنی شخصیت ضرور مجروح ہوگی اور اُن کے سماجی معیار میں بھی کمی واقع ہوگی، اِس خوف کی بنا پر راقم الحروف کا خیال ہے کہ بہت سے شعراء نے اُردو غزل میں پیش قدمی سے احتراز کیا۔ اور قدیم شعری اصناف اور روایات کی ہی پیروی کرتے رہے۔ اور اگر غزل کو کہیں موضوعِ سخن بنایا بھی ہے تو صرف اِس بنا پر کہ کہیں لوگ اُنھیں ''یک فنا'' (ایک ہی فن کا جاننے والا) نہ کہیں۔ اِس لئے اپنی مسلّم استادی کے ثبوت کے طور پر اُردو غزلیں کہہ کر کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

اُردو غزل کا بنیادی ڈھانچہ چونکہ فارسی غزل سے مستعار ہے اور اِس کے اسالیب کی بنیاد بھی چونکہ فارسی غزل ہی ہے۔ لیکن مقامی فضاء اور مقامی عناصر کی آمیزش سے اُردو زبان کا نیا ہیولا تیار ہوا تھا۔ اِس کے باوجود کچھ عرصے کے لئے فارسی روایات اتنی غالب رہی کہ اُردو غزل گو شعراء کی اپنی ذہنی افتاد اور اپنی طبیعت کی ایجاد کا مادّہ فنا ہوگیا تھا۔ لہٰذا اِس فارسی روایات کے غلبے کی ایک بنیادی وجہ مرکز میں فارسی زبان کا سرکاری زبان ہونا بھی تھا۔ اور اِسی زبان کے بولنے والے ہندوستان کے حکمران تھے۔ یہ ایک ایسی ذہنی کش مکش تھی کہ فارسی زبان اور اس کے حاکم کا غلبہ بھی لوگوں پر اِسی قدر حاوی رہا اور اردو غزل گو شعراء نفسیاتی طور پر اِس کا شکار ہوگئے اور ایک طرح کی احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئے۔ چنانچہ اِس کیفیت کا واضح نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شعراء کی پیروی اور تقلید اُردو شعراء کے لئے احساسِ برتری کا ضامن بنی رہی اور انھوں نے فن کی اُن بلندیوں کو چھونا چاہا جہاں فارسی شعراء کھڑے تھے۔ لیکن جیسے جیسے اُردو زبان اور اُس کی شاعری کا ارتقاء ہوا یہ بات عیاں ہوتی گئی کہ ایک دن فارسی زبان کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ چونکہ اردو شاعری کی عمر فارسی کے بہت کم تھی اور اِس کے پاس اُن ساز وسامان کی کمی تھی جس سے گذر کر فارسی کی ادبی روایات وجود میں آئی تھیں۔ راقم الحروف کے نزدیک غالباً یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس نے اُردو کے ابتدائی غزل گو شعراء کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو کہ کبھی دکنی شعراء اپنے آپ کو فارسی شعراء کا ہم پلّہ بھی قرار دیتے تھے اور کبھی اُن کی ہمسری کا دعوہ بھی کرتے تھے انھیں میں دکن کا شاعر ولی بھی شامل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

باب سوم :- ولؔی سے قبل صنفِ غزل کا فروغ

۱	اُردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری	ص : ۵۹
۲	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی (ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء)	ص : ۴۲
۳	ایضاً	" " "	ص : ۲۹۶
۴	تاریخِ ادب اردو (جلد اوّل)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ص : ۵۱۵
۵	دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زورؔ	ص : ۶۵
۶	دکنی اردو	پروفیسر عبد الستار دلوی	ص : ۲۸۴
۷	تاریخِ جنوبی ہند	محمود خاں محمود	ص : ۳۷۴
۸	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری	ص : ۱۲۷
۹	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ص : ۵۳۰
۱۰	مقدمہ شعر وشاعری	خواجہ الطاف حسین حالؔی	ص : ۱۱۸
۱۱	آبِ حیات	محمد حسین آزادؔ	ص : ۴۶
۱۲	سخندانِ فارس	محمد حسین آزادؔ	ص : ۱۶۹، ۱۷۰
۱۳	تمام اشعار ''دکنی اردو''	پروفیسر عبد الستار دلوی	ص: ۲۸۹ تا ۲۹۱

☆☆☆☆☆☆☆

باب چہارم (الف)

ولی کی شعری وسعتیں

باب چہارم (الف)

ولی کی شعری وسعتیں

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ دکن میں غزل فارسی کے شانہ بشانہ ترقی کے مدارج طے کرتی رہی لیکن اس کی ترقی کی رفتار سُست تھی۔ کیوں کہ غزل اپنے زمانے امیر خسرو سے لے کر ولی سے قبل تک، کسی شاعر کی منظورِ نظر نہیں بنی، کیوں کہ دکنی شعراء نے سب سے زیادہ صنفِ مثنوی کی طرف توجہ مبذول کر رکھی تھی۔ اس لئے دکن میں صنفِ مثنوی کے فروغ اور ارتقاء، کثرت اور فراوانی کی وجہ سے وہاں مثنوی نگاری کو ہی شاعرانہ اظہارِ کمال کا معیار تصوّر کیا جاتا تھا اور جب تک کوئی شاعر اس صنف میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم نہ کر دے اس وقت تک پایۂ اعتبار حاصل نہ کرسکتا تھا۔ اس لئے جن شاعروں نے بھی غزل میں طبع آزمائی کی انھوں نے صرف و محض تفریح یا تفنن طبع کی خاطر یا اپنے ذہنی مذاق کو بدلنے کی خاطر ہی غزلیں کہی ہیں۔ دکنی غزل کی وہ روایت جو محمود، فیروز، خیالی، حسن شوقی، قلی قطب شاہ، وجہی اور نصرتی وغیرہ سے ہوتی ہوئی ولی تک پہنچی ہے، ان کو پوری طرح اردو غزل کا شاعر تو نہیں کہہ سکتے لیکن بہر حال انھوں نے جس قدر اور جیسی بھی کوششیں کی ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل میں اپنے احساس وجذبات کی ترجمانی سادہ اور عام لفظوں میں کردی ہے۔ یہ تمام شعراء چوں کہ بنیادی طور پر مثنوی نگار تھے اور دکن میں صنفِ مثنوی رائج تھی، اسی لئے انھوں نے اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مثنوی پر ہی خاص توجہ دی جب کہ غزل گوئی کی طرف مراجعت ذہنی جزوی حیثیت سے بھی، تاہم غزل کی عمارت تعمیر کرنے میں ان کا حصہ بہر حال ہے۔

ولی نے دکن میں رائج صدیوں پرانی مثنوی کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے مثنوی کے بجائے غزل کو اپنا مطمع نظر قرار دیا اور اس صنفِ غزل میں نغز گوئی وتازہ کاری کے وہ نقوش قائم کئے کہ آئندہ کے لئے غزل گوئی ہی معراجِ فن اور معیارِ سخن قرار پائی۔ کیوں کہ ان سے پہلے اردو کا کوئی بھی ایسا غزل گو نہیں ملتا جو اردو غزل پر اس قدر سایہ فگن ہو۔ یہ ولی کی غزلوں کی شیرنی کا اثر تھا کہ اردو غزل کا دائرہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوتا گیا کہ آج تک کوئی شاعر اس کے احاطے سے باہر نہیں جاسکا، ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''اردو غزل میں ولی کی حیثیت ایک پُل کی سی ہے''۔[1]

چوں کہ ولی دکن کا ساکن ہے اس لئے اس کی شاعری اور غزلوں میں دکنی شاعری کی بنیادی خصوصیات تو موجود ہیں ہی لیکن ولی کے قیامِ دہلی اور وہاں کی زبان ''ریختہ'' کے عناصر بھی موجود ہیں۔ یوں ولی کی غزل دکنی اور شمالی ہند کے امتزاج کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس کی غزلوں کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ اس نے دونوں مقامات کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر غزل کو اس کے اصل مزاج کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے ولی غزل کا وہ ''مجدد'' ہے جس نے اردو غزل کو نئی وسعتوں اور منزلوں سے آشنا کیا۔ گویا ولی شعری روایات کے اعتبار سے ہندوی اور عجمی رجحانات کے درمیان کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور اس صورتِ حال میں شمال اور جنوب کے باہم ملاپ سے پیدا ہوئے حالات سے غزل کو نئی پہچان عطا کرنا اور اس کارگراں میں اپنی ذات کو فن کے اعتبار سے بلند وبالا کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ لیکن ولی چوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور بلند افکار کے مالک تھے نیز اپنی محرّک طبیعت کے اعتبار سے بھی ہندوستان کے سیاسی اور ادبی اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھے، لہذا اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے انھوں نے دکن اور شمالی ہند کے درمیان ایک نیا لسانی رشتہ قائم کیا اور تمام عظیم شعری سرمایہ جو دکن اس وقت ان کے پیشِ نظر تھا، اس سے کام لیتے ہوئے شمالی ہند میں رائج ہو چلی نئی زبان کے وسیلے سے اپنے خیالات کو نظم کرنا شروع کیا، جس سے دکنی زبان کی اہمیت اور وقار بھی برقرار رہا نیز دکنی زبان جو قدیم اردو کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اُسے بھی آزاد کر کے نئی زبان کے توسط سے سارے ہندوستان میں ادبی ابلاغ وترسیل کے ایک مؤثر وسیلے سے روشناس کروادیا۔

یہ ولی کا بڑا ادبی کارنامہ تھا کہ ابھی جو کہ شمالی ہند میں فارسی زبان کا سکہ چل رہا تھا اس کے باوجود ولی کی یہ نئی کوشش اور تجربہ بڑا ہی کامیاب ثابت ہوا اور دہلی میں اردو غزل گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ ولی کے اس طرزِ جدید اور لسانی اجتہاد نے شمالی ہند کے سخن گستروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، چنانچہ اردو غزل گوئی کا رواج بہت جلد سارے دہلی میں پھیل گیا اور دہلی اردو شاعری کا مرکز بن گئی۔ دراصل ولی نے فارسی زبان سے اظہارِ خیال اور بہت سی نئی ترکیبوں اور پیکروں کو مستعار لیا تھا، اس لئے ولی نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اس نئی زبان میں ایسے الفاظ اور محاورات کا انتخاب کیا جو مروّجہ زبان سے بخوبی ہم آمیز ہوسکیں۔ ولی نے چونکہ اپنی تعلیم کے دوران فارسی کے برسرِ آوردہ فارسی اساتذہ شعراء کو تو پڑھا ہی تھا، اس لئے ان کا اسلوب اُن کے مدِّ نظر تھا، اس لئے انھوں نے ان فارسی شعراء کے نئے اور جدید خیالات سے استفادہ تو کیا ہی لیکن فارسی

زبان کے عام فہم الفاظ اور محاورات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی تھی۔ لہذا کہہ سکتے ہیں کہ ''ریختہ'' اور فارسی زبان کی آمیزش سے نئی شاعری پیش کرنے کا سہرا ولؔی کے سر ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں۔۔۔

> ''ولؔی کی حیثیت ایک'' مشعل بردار'' کی سی ہے، جو دکن کی خاک سے اردو غزل کی مشعل اُٹھائے دہلی تک پہنچا، چنانچہ ولؔی کے بعد اردو غزل کی نشوونما کا مرکز دکن سے دہلی منتقل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُردو غزل کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہو جاتا ہے''۔ ؎۲

ولؔی نے بڑی ہی فنکاری اور صنّاعی سے فارسی مضامین اور خیالات کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا۔ ولؔی نے فارسی محاورات کا ترجمہ کر کے اردو غزل کی لفظیات کے سرمایے میں بھی اضافہ کیا اور فارسی مصادر ''کمر بستن، جفا کشیدن، آب کردن، شیوہ گرفتن، دام گرفتن، روا داشتن، تنگ شدن، دَم زدن وغیرہ بہت سے فارسی مصادر اور فارسی ترکیبوں کو بھی بڑی فنی چابک دستی (چابکدستی) سے اپنی اردو شاعری اور غزلوں میں استعمال کیا ہے۔ اور ان کے استعمال سے ایسا رنگِ شاعری ایجاد کیا، جس نے نہ صرف اردو غزل کو وقار بخشا بلکہ اس کی زندگی کو وسعتوں کی طرف گامزن کردیا اور اسے نئے مقامات اور نئے منازل سے گزار کر ایک نیا رنگ وروپ دے دیا اور بطورِ خاص غزل جو کہ ایران کی شاعری سے ہم تک پہنچی تھی اس ایرانی غزل میں ہندوستانی رنگ کی آمیزش کی اور غزل میں ہندوستانی فضاء اور یہاں کی روایتوں کو برقرار رکھا۔ اس لئے ولؔی کی غزلوں میں سرزمینِ ہند کے مختلف مظاہر کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو ہندوستانی معاشرے کی عام فضاء سے آزاد نہیں کیا۔

ولؔی نے فارسی کے مروّج و مستعمل مضامین کو نہ صرف اردو میں منتقل کیا بلکہ اپنے خلّاقانہ ذہن اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو بھی شعر کا روپ دیا جو خود ان کے اپنے ماحول و حالات کی دین تھے۔ اس لئے ہمیں اُن کی غزلوں میں ہندوستانی مٹی کی خوشبو اور یہاں کی تہذیبی روایات کو بھی عکّاسی نظر آتی ہے، اور جو ہمیں ہماری اپنی ہی داستان معلوم ہوتی ہے۔ ولؔی کی غزلوں میں جو حسین پیکر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں وہ یہیں کے ساکن ہیں اور ان کا حلیہ، چال ڈھال، وضع قطع اور کردار سب کے سب ہندوستانی نظر آتے ہیں اور ان کے بیان میں ولؔی نے اپنے احساسِ حُسن اور ذوقِ شعر سے اپنی غزلوں کو پوری طرح ہم آہنگ کر لیا ہے۔

ولؔی کی شاعری کا امتیازی وصف فارسی خیالات اور رنگ وآہنگ کی آمیزی ہے۔ ولؔی نے جہاں ایرانی

شعراء کی آواز کے ساتھ اپنی آواز بلند کی ہے، وہیں اپنی شعری صلاحیتوں کو بھی بروئے کار کرتے ہیں اور صرف اپنی آواز ہی بلند نہیں کرتے، بلکہ اپنی اس آواز کی شناخت بھی قائم کرتے ہیں اور ولی اپنی اس شناخت کو قائم کرنے میں جن روایات کی تقلید کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ایرانی روایات تھیں۔ ولی کی اسی خصوصیت نے شمالی ہند کے شعراء کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ کیوں کہ ولی فارسی زبان کے پروردہ وتربیت یافتہ تھے اور انہی چیزوں کو معتبر وقابلِ اعتنا خیال کرتے تھے جس کی سند فارسی اساتذہ کے کلام میں مل سکتی تھی۔ لہذا ولی نے قدیم اور کلاسیکی فارسی استعاروں اور علامتوں کو رسمی وروایتی مضامین کے علاوہ اپنے مخصوص احساسات، تصوّرات اور تجربات کے اظہار کا بھی ذریعہ بنایا۔ ولی نے قدیم ایرانی تغزّل کے نغموں میں نئی گونجیں، نئی تانیں اور نئی گہرائیاں پیدا کیں۔ ولی نے ہزاروں رسم پرست اور تقلید پرست دکنی اور شمالی ہند کے شعراء کی فرسودہ نوائی اور مبتذل نگاری کے باوجود غزل کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کیا اور اُسے نئے مضامین سے مسلح کر کے نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ ترقی کے نئے راستوں پر گامزن کردیا۔

مختصر یہ کہ ولی نے غزل کو قدیم اور روایتی مضامین کی قید سے آزاد کر کے نئے انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے علمی طور پر اردو غزل کے اتنے اور ایسے اعلیٰ نمونے پیش کئے کہ اردو کے ہر شاعر کو یہ معلوم ہو سکا کہ اردو میں بھی اس قدر اعلیٰ اور ارفع غزل کہی جاسکتی ہے۔ اور صرف اردو کے شاعر ہی نہیں بلکہ بیدل (۱۶۴۴ء تا ۱۷۲۰ء) جیسا فارسی کا غزل گو شاعر ولی کی شاعری سے متاثر ہوتا ہے کہ اردو میں غزل کہنے لگتا ہے۔ قائم چاندپوری نے لکھا ہے۔۔۔

> "ولی کے دیوان کی ہر بیت مطلع آفتاب سے زیادہ روشن تھی۔ ریختہ کو اس قسم کی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ کہتا تھا کہ اس وقت کے اکثر اساتذہ از راہِ ہوش ریختہ موزوں کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ مرزا عبد القادر بیدل نے بھی ایک غزل اس زبان میں کہی ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔
>
> مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہے ہم میں
> اس جنس بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
> جب دل کے آستاں پر عشق آن کہر پکارا
> پردے سے ہار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں ۳؎

غرض یہ کہ وَلی نے اپنی شاعری کی بنا جن بنیادوں پر استوار کی اس سے اردو زبان کی صفائی کا عمل بھی شروع ہوا اور وَلی نے صرف یہ کہ زبان کو صاف کیا بلکہ اردو غزل کو فارسی سانچہ میں مکمّل طور پر ڈھالنے کی سعی بھی کی، جس کے سبب وَلی کی غزلوں کا اثر پورے ہندوستان میں پھیلنے لگا۔ جس سے نہ صرف دکن بلکہ گجرات اور شمالی ہند کے شعراء بھی زبردست متاثر ہوئے، چونکہ وَلی کے زمانے میں مثنوی کا رواج عام تھا اور شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کو باعثِ فخر تصوّر کرتے تھے اور پورے دکن کے خطّے پر مثنوی ہی کا طوطی بول رہا تھا۔ اس کے باوجود وَلی نے جس طرح اپنے دور کی زبان اور روایت سے انحراف کر کے نئی طرز کی (ریختہ) زبان اپنے کلام میں استعمال کی اسی طرح اُس روایتی صنفِ سخن سے بھی کنارہ کشی اختیار کی، یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی شاعری میں مثنویاں اور قصائد برائے نام ہی ملتے ہیں۔ وَلی نے اپنے لئے صنفِ غزل کو مخصوص کر لیا اور روایتی شعری ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اس سے انحراف کرتے ہوئے نہ صرف غزل کو اپنایا بلکہ اس کی ترقی کے امکانات روشن کر دیئے، ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے مضمون میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ''اس میں شبہ نہیں کہ ان شاعروں کی محبوب ترین صنف صنفِ مثنوی تھی۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے اس صنف میں کمال حاصل کیا ہے۔ بعضوں نے کبھی کبھی غزلیں کہہ لی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی غزل کی طرف باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کر سکا ہے، وَلی نے اس صنف کی طرف سب سے پہلے باقاعدگی کے ساتھ توجہ کی اور اس کا صحیح ماحول پیدا کیا۔[۴]

یوں تو قطب شاہی دور سے لے کر وَلی کے ظہور تک سینکڑوں شاعر اور ادیب پیدا ہوئے اور اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض انجام دیا۔ لیکن شاعری کے اعتبار سے اور خصوصاً غزل میں طبع آزمائی کی کوششوں میں وہ رنگینی اور کشش پیدا کرنے سے محروم رہے۔ جو دراصل شاعری کی جان ہوتی ہے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہ صرف وَلی کی ذات تھی جس نے اس صنف کو فارسی کے خوشگوار، لطیف اور شیرین امتزاج سے بڑا ہی دلکش بنادیا اور اگر وَلی کا ظہور نہ ہوتا تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتنی مدّت تک دکنی شعراء زبان کی ناہمواریوں اور بھاشا اور فارسی کے غیر فطری آمیزش کے الجھاؤ میں گمراہ رہتے۔ وَلی کی پختہ کاری ہمارے لئے بار بار نہ صرف حیرت کا باعث ہوتی ہے بلکہ اُن کی استادی کا ڈنکا بھی بجاتی ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے

ہیں کہ ''نقش اوّل اتنا کامل، پہلا نغمہ اور اتنا بے نظیر خصوصاً جب کہ وؔلی کی زبان ایسے دور سے متعلق ہو جس میں اردو ہنوز عہدِ طفولیت میں تھی۔ وؔلی نے غزل کو جدید زبان اور پیرایۂ اظہار سے آشنا کر کے اردو زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دی۔ یہ صرف وؔلی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے اپنے عہد کی شعری روایت کی توسیع کی اور اس میں زندگی کے رنگ بھرے اور ساتھ ہی فکر وخیال کی ندرت سے بھی آشنا کیا اور ایسے ادب کی بنیاد رکھی جس میں ہر نوع کے مضامین، تاریخ، شریعت، تصوّف، اخلاق اور جمالیات کی نازک سے نازک حسیات، واردات اور کیفیات کی عکّاسی کی قدرت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ وؔلی سے پہلے کی اردو شاعری پر مقامی لفظیات اور مقامی طرزِ اظہار کا غلبہ تھا۔ حالانکہ وؔلی کی ابتدائی شاعری بھی اس غلبے سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔ لیکن بہت جلد انھوں نے اپنی شاعری کا رُخ فارسیت کی جانب موڑ دیا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ فارسی لفظیات اور فارسی اظہار کو اردو کا غالب رجحان عطا کردیا۔

وؔلی کی شاعری شہنشاہ عالمگیر کے زمانے کی نمائندگی کرتی ہے۔ جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب اپنے عروج پر تھا۔ اس وقت دہلی میں زیادہ تر فارسی شاعری کا رواج تھا۔ لیکن بعض فارسی شعراء نے ریختہ کہنا شروع کردیا تھا۔ لیکن جب مغلیہ سلطنت کی جڑیں کمزور ہونے لگیں اور مسلسل زوال، انتشار اور پس ماندگی کا دور شروع ہوا تو مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوگئیں اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے اثر اور اقتدار میں بھی کمی واقع ہوتی گئی اور فارسی زبان اور شاعری کے زوال اور انحطاط کا دور شروع ہوگیا۔ رسمیہ قصیدہ نگاری شعراء کے لئے ذریعۂ معاش بن گئی۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور ان سے بچاؤ کی خاطر معرکہ آرائیاں اہلِ وطن کے لئے مایوسی اور ناکامی کا سبب ہوئیں۔ لہٰذا اس دور کے شعراء نے شہر آشوب اور نوحے تو ضرور لکھے لیکن رزمیہ لکھنے کا جذبہ پیدا نہ کر سکے اور ان میں اتنی سکت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا انھوں نے اپنے جذبوں کی تسکین کی خاطر مرثیہ کو اپنا لیا۔ یوں سیاسی اثرات کا واضح نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے اثر اور اقتدار میں کمی واقع ہوتی گئی۔

وؔلی کے زمانے میں دکن اور گجرات کے علاقے میں اردو کی دو ادبی شاخیں دکنی اور گجراتی رائج تھیں۔ جب کہ شمالی ہند میں اس وقت اردو بول چال تک ہی محدود تھی۔ اس لئے دکنی زبان کے دیگر شعراء کی طرح وؔلی کے کلام میں بھی دونوں زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور چونکہ وؔلی کی شاعری کی ابتداء دکن میں ہوئی تھی، اس لئے وؔلی کے پیشِ نظر دکن کا وہ تمام شعری سرمایہ موجود تھا۔ جو مختلف اصناف کی شکل میں موجود تھے اور

بہت سے بلند پایہ مثنوی نگار شاعر موجود تھے ان شعراء کی بھیڑ میں قدیم شعری روایات کو برتتے ہوئے اپنا مقام بنانا بڑا دشوار امر تھا۔ اس لئے ولیؔ نے غزل کو اپنے لئے مخصوص کرلیا، جس میں طبع آزمائی کر کے اپنا مقام بنانے کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ راقم الحروف کے نزدیک غالباً یہی وجہ تھی کہ ولیؔ نے دکن کی تمام شعری اصناف سے انحراف کرتے ہوئے اپنے لئے اس صنفِ غزل کو زیادہ قابلِ اعتنا تصوّر کیا، تاکہ شاعروں کو اس انبوہ اور شاعری کے اس کارزار میں ہزاروں آوازوں کے بیچ اپنی آواز کی شناخت قائم کی جاسکے۔

ولیؔ نے غزل طبع آزمائی کرنے کے اپنے مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے پہلے پہل دکنی زبان اور دکنی انداز میں سخن گوئی شروع کی۔ لیکن فارسی طریقۂ اظہار اور اس کی خوشنمائی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انھیں اس بات کا فوراً احساس ہوگیا کہ مقامی زبان اور انداز وہ رنگ پیدا نہ کرسکے گا جس کے وہ متلاشی ہیں۔ کیوں کہ اس انداز میں فارسی کے مقابلے انھیں بڑا ہی بھدّا پن محسوس ہوا اور فارسی زبان کی دلکشی کا عشرِ عشیر بھی اس میں انھیں انظر نہیں آرہا تھا۔ لہذا یہ بات فوراً ان کے ذہن نشین ہوگئی کہ فارسی زبان کے الفاظ اور انداز اختیار کرنے پر بہت جلد ان کی شاعری وسیع حلقوں میں مقبول ہوسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کی ابتدائی غزلوں میں دکنی الفاظ کی آمیزش اور کثرت ہے۔ لیکن ابتدائی غزلوں میں زیادہ تر غزلیں ایسی ہیں جن میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے اور چونکہ ولیؔ کے دیوان کی ترتیب ردیف وار ہے اس لئے صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سی غزل کس سن کی ہے اور اس زما۔۔نے میں کیا رنگ تھا۔ مگر یہ بات قرین قیاس ہے کہ دہلی جانے سے بیشتر جو غزلیں کہی ہونگی ان میں فارسیت زیادہ نمایاں رہی ہوگی، کیوں کہ یہ مغلیہ سلطنت کے عروج کا زمانہ تھا اور فارسی سرکاری اور درباری زبان تھی۔ اس وجہ سے ایرانی اثرات ہندوستانی تہذیب میں نفوذ کر چکے تھے اور فارسی زبان ادبی زبان تصوّر کی جاتی تھی اور جسے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن یہ نئی زبان اردو جس طرح دردِ دل کے اظہار کے لئے مؤثر ذریعہ بن رہی تھی، محفلوں اور مُشاعروں میں باریاب نہیں ہونے پائی تھی۔ یہ گنگا جمنی زبان میں ہندی وفارسی کی پیوندکاری تھی۔ لہذا خالص اردو زبان میں شعر کہنا اس وقت کے مشاہیر کے لئے گویا مرتبے سے گری ہوئی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کی ابتدائی غزلوں میں دکنیت کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے اور کہیں فارسی کی پیوندکاری بھی غالب ہے۔ اس کے متعلق اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''انھوں (ولیؔ) نے غزل گوئی کا آغاز اس وقت کیا، جب گویا اردو زبان نے شیرِ مادر کی چاشنی سے آشنا ہوچکنے کے بعد لبِ گفتار کھولے ہی تھے۔ ان کے لب ولہجے

میں وہی تازگی مٹھاس اور الڑھ پن یعنی Naivety ہے جو آغاز کار کی شاعری سے ہمیشہ اور ہر زبان میں مختص رہی ہے۔ ۵

ولی سے قبل اور ولی کے زمانے میں بھی دکن میں غزل گوئی عشق وعاشقی تک ہی محدود تھی اور یہ صنف اپنے موضوعات یعنی نسوانی حسن کی دل آویزی، صنفِ لطیف کے دل کش ناز وانداز اور جسمانی خدوخال، ان کی صحبت اور اس قسم کے دیگر لطف انگریزیوں کے بیانات تک ہی محدود تھی اور غزل میں عامیانہ اور سطحی انداز میں عشقیہ مضامین باندھے جاتے تھے اور غزل شاعری کی جزوی صنف کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے ولی نے ابتداء میں جو غزلیں کہی ہیں وہ اسی عشقیہ طرز کی ہیں اور ان میں دکنی الفاظ کی کثرت ہے۔ لیکن ایسی غزلوں کی تعداد زیادہ ہے جو فارسی زبان کے الفاظ سے لبریز ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ولی اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں گجرات اور دکن کے درمیان مسافت کیا کرتے تھے اور غالبًا احمد آباد (گجرات) کے ''مدرسۂ علویہ'' سے حصولِ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ مستقل طور پر اورنگ آباد میں ہی مقیم ہوگئے۔ اس لئے ولی کی ابتدائی شاعری میں دکنی الفاظ کی جو آمیزش ہے وہ مقامی اثرات کا نتیجہ ہے۔ جسے ولی کی شاعری کا **''پہلا دور''** کہا جاسکتا ہے یوں ولی کی شاعری کا انداز اُس وقت بالکل وہی تھا جو دیگر دکنی شعراء کا تھا۔ ولی کی خالص دکنی انداز کی غزل مندرجۂ ذیل ہے۔

جب سوں دیکھا ہوں زلف کی میں لٹ
یاد میں اس کی تن گیا سب، کھٹ
ہوش اُڑ کر گیا ہے میرا دیکھ
پیچ چہرے ترے کی سب لٹ پٹ
جاوے تجھ مکھ انگے سوں رستم ٹل
گر وہ غمزے ترے کا دیکھے ٹھٹ
اور نئیں کام مجھ کوں کچھ ساجن
عشق تیرے کانت ہے، مجھ کھٹ پٹ
ہجر تیرے سوں اے پری پیکر
اشک پڑتے ہیں چشم سیں ٹپ ٹپ

خاک مکھ پر لگا کے جوگی ہو

لے کے بیٹھا ہوں تجھ برہ کی مٹ

تجھ بنا اب نہیں مجھے طاقت

کب تلک جیو کروں اُپس کا کھٹ

تب سیں مجنوں نمن ہو پھرتا ہوں

جب سوں تجھ سکھ کی مجھ لگی ہے چٹ

اب ولؔی پر پیا رحم کر توں

کب تلک اس ستی کرے گا ہٹ

متذکرہ بالا غزل ولؔی کے دکنی انداز کی نمائندگی کرتی ہے کیوں کہ یہ ولؔی کی شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے اور غالبًا سفرِ دہلی سے پہلے کی کہی ہوئی غزل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بعض غزلیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن میں فارسی زبان کے الفاظ کی بہتات اور کثرت ہے۔ اس کی وجہ بھی غالبًا یہی معلوم ہوتی ہے کہ ولؔی کا زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا اور چونکہ پورا دکن عالمگیر کے زیرِ نگیں تھا اور فتح دکن ؁ء کے بعد دہلی سے ایک لسانی رشتہ قائم ہوگیا تھا اور یہ لسانی رشتہ ہزاروں افراد پر مشتمل تھا۔ جن میں ایرانی نژاد بھی تھے۔ اورنگ زیب بذاتِ خود سیاسی مصلحتوں کے تحت اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ عالمگیر کی سرزمین دکن میں موجودگی کے باعث سینکڑوں درباری، امراء، وزراء اور دیگر افراد کی دہلی اور دکن کے درمیان آمد ورفت بھی جاری تھی۔ لہذا اس وجہ دکنی زبان میں فارسی زبان کے اثرات اور الفاظ پائے جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ولؔی کی ایک ایسی ہی غزل ملاحظہ ہو جس میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ ہیں۔ جس میں دکنیت کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی امتزاج پایا جاتا ہے۔ غزل مندرجۂ ذیل ہے۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا ہے مطالع مطلع انوار کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت ہووےگا کیا معلوم نئیں دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں کام تھا تجھ چہرۂ گلنار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بےنظیر | حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی | بندہ مت ہو بسمہ و زنار کا
مسند گل منزلِ شبنم ہوئی | دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشم گوہر بار کا

اس غزل میں فارسی مرکبات قابلِ غور ہیں خصوصاً اس قبیل کی ترکیبیں مثلاً مطلعۂ انوار، آرزوئے چشمۂ کوثر، شربتِ دیدار، منزلِ شبنم، دیدۂ بیدار، چشم گوہر بار، ولی کی غزل کو اعتبار دلانے کے لئے کافی ہیں۔

بعض علماء نے ولی کے کلام میں فارسی زبان کی آمیزش اور انداز کو ولی کے سفرِ دہلی ۱۷۰۰ء اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات اور ان کے مشورے یعنی ''فارسی انداز اور مضامین کو اپنی شاعری میں اختیار کرو'' سے جوڑا ہے اور ولی کے اس انداز کو اختیار کرنے کا ضامن شاہ سعد اللہ گلشن کو ٹھہرایا ہے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ بات غیر معتبر اور بے بنیاد ہے، کیوں کہ یہ بیان کوئی ٹھوس تاریخی شہادت نہیں رکھتا اور نہ آج تک کسی محقق اور ادیب نے کوئی ایسی شہادت پیش کی ہے، جسے اس بیان کی بنیادوں کے ساتھ عام فہم طریقے سے قبول کیا جاسکے اور اس کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا کوئی تردّد نہ ہو۔ دراصل ولی کے کلام میں فارسی زبان کی آمیزش اور انداز اختیار کرنے نیز فارسی مضامین کو اپنی شاعری میں برتنے کے متعلق راقم الحروف نے اس کی بنیاد تین چیزوں پر قائم کی ہے۔

(۱) ولی کا مدرسۂ علویہ (گجرات۔احمد آباد) میں تعلیم حاصل کرنا
(۲) ولی کا دہلی کے سفر ۱۷۰۰ء کے بعد اور پہلے اورنگ آباد میں مستقل قیام پذیر ہونا
(۳) اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے ساتھ شمالی ہند کی زبان دکن میں رائج ہونا نیز عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال پذیر ہونا

مندرجۂ بالا تینوں نکات ایسے ہیں کہ جن سے ولی کا متاثر ہونا یقینی بات تھی۔ اوّل یہ کہ ولی نے اپنی اعلیٰ تعلیم ''مدرسۂ علویہ'' میں حاصل کی اور چونکہ اس زمانے میں ذریعۂ تعلیم عربی اور فارسی ہی ہوا کرتا تھا، لہذا تمام علوم اسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور یہ ممکن ہے کہ اپنی زندگی کے اس تعلیمی دور میں ولی نے بہت سے مشہور اور معروف فارسی شعراء کو پڑھا ہو اور ان کے کلام سے متاثر بھی ہوئے ہوں، لہذا یہ بھی ممکن ہے کہ

ان فارسی شعراء کے سینکڑوں اشعار ان کی زبان پر ہمہ وقت جاری بھی رہے ہوں۔ اس تعلیمی زندگی کے درمیان جہاں ذریعۂ تعلیم فارسی زبان ہو اور پند ونصائح، اخلاق اور تہذیب کے درس کے لئے فاسی زبان کے اعلیٰ مصنفوں اور شعراء کا کلام پڑھایا جاتا رہا ہو، اس تعلیمی ماحول سے ولؔی کا متاثر ہونا ایک ناگزیر عمل ہے۔ ولؔی بھی فارسی کے ان بلند پایہ شعراء سے زبردست متاثر نظر آتے ہیں۔ اور جب اپنی تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں اور وہ شاعرانہ طبیعت جو ولؔی کے وجود میں پہلے سے موجود تھی، جب شعراء گوئی کی طرف مائل ہوتی ہے تو وہ ان فارسی شعراء کو مدِ نظر رکھتے نظر رکھتے ہیں اور اپنے کلام میں ان شعراء کے نام کو اس خوبصورتی سے برتتے ہیں کہ یہ گمان نہیں ہوتا کہ ولؔی کا تعلق دکن یا گجرات سے ہے۔

دراصل فارسی زبان کی تعلیم اور فارسی شعراء کے کلام کو بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے والا ہی اس طرح اپنے محبوب کے حُسن و جمال، زیبائش آرائش اور اس کی قدو قامت اور دیگر جسمانی خوبصورتیوں کو اجاگر کرسکتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ولؔی نے اپنے تعلیمی سفر کے دوران کس سنجیدگی کے ساتھ فارسی زبان اور فارسی شعراء پڑھا ہوگا کہ وہ ان فارسی شعراء کی تخلیق کو اپنے محبوب کے سراپے میں اپنی غزل کے قافیہ میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ایسی مثال نہ تو اس سے قبل اور نہ ہی بعد میں کسی شعراء نے پیش کی ہے۔ دراصل یہ ولؔی کی اپنی طبیعت کا خاصہ تھی، جو اشعار کی شکل میں ڈھل کر حیاتِ جاوداں اختیار کر گئی۔ فارسی زبان اور شعراء سے اس قدر انسیت کی دیگر مثال ولؔی کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ ولؔی کو فارسی زبان سے دلچسپی اور لگاؤ اور اپنے محبوب فارسی گو شعراء جن کے کلام کو ولؔی نے اپنے دل کی گہرائیوں میں بسایا تھا اور ان فارسی کے مرغوب شعراء کے اثرات کس حد تک ولؔی کے دل ودماغ پر مرتسم تھے، اس کا اندازہ ولؔی کی مندرجۂ ذیل غزل سے ہوتا ہے۔

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے
نَین جامی، جبیں فردوسی وابرو ہلالی ہے
ریاضی فہم وگلشن طبع و دانا دل، علی فطرت
زباں تیری فصیحی وسخن تیرا زلالی ہے
نگہہ میں فیضی وقدسی سرشتِ طالب وشیدا
کمالِ بدر دل اہل وانکھیاں سوں غزالی ہے

تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب وشوکت

ترے ابرو پہ مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے

وؔلی تجھ قد وابرو کا ہوا ہے شوقی ومائل

تو ہراک بیت عالی ہور ہراک مصرع خیالی ہے

مندرجۂ بالا غزل کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ بغیر ان شعراء کے کلام کو پڑھے اور ان فارسی شعراء کے کلام کے ''نفسِ مضمون'' سے واقفیت کے اس طرح کا کلام کہنا دشوار یا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ تو بھلا ایسی صورت میں شاہ سعد اللہ گلشؔن کے مشورے کی بات کہ۔۔۔

''مضامینِ فارسی کیوں نہیں ریختہ میں استعمال کرتے''

کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے؟

اس طرح جن لوگوں نے بھی وؔلی کی شاعری کو ''شاہ سعد اللہ گلشؔن'' کے مشورے کی مرہونِ منت بتایا ہے وہ راقم الحروف کے نزدیک بالکل بے بنیاد ہے کیوں کہ وؔلی نے دو مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ عہدِ اورنگ زیب میں یعنی ۱۷۰۰ء / ۱۱۱۲ھ میں لیکن چونکہ وؔلی کی پیدائش ۱۶۶۸ء تسلیم کی جاچکی ہے۔ اس لئے عیسوی سن ۱۷۰۰ء تک بتّیس (۳۲) برسوں کا عرصہ ہے۔ اس لئے یہ بات کسی طرح بھی عقلِ سلیم میں نہیں اترتی کہ ''شاہ سعد اللہ گلشؔن'' کے مشورے کے بعد وؔلی نے یہ غزل کہی ہوگی بلکہ یہ بات ہی زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ غزل وؔلی کی فارسی دانی اور فارسی شعراء کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

وؔلی کے فارسی مضامین اور انداز اختیار کرنے میں دوم نِکات ''سفرِ دہلی'' ہے جسے ان کی شاعری کا **''دوسرا دور''** کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ سفرِ دہلی سے واپسی کے بعد وؔلی مستقل طور پر اورنگ آباد میں قیام پذیر ہو جاتے ہیں۔ اور سفرِ دہلی ۱۷۰۰ء سے قبل بھی وؔلی مستقل طور پر اورنگ آباد (دکن) میں قیام پذیر نظر آتے ہیں۔ اور یہ زمانہ عہدِ اورنگ زیب کے عروج کا زمانہ ہے، جہاں دہلی اور اورنگ آباد میں بڑے قریبی روابط پیدا ہوگئے تھے۔ اورنگ زیب نے اواخر سترہویں صدی میں ایک طویل عرصہ تک بلکہ اورنگ آباد میں اپنی وفات ۱۷۰۷ء تک دکن میں ہی سکونت اختیار کررکھی تھی۔ اس لئے حکومتی انتظام اور نظم ونسق کو بہتر طور پر چلانے کے لئے شاہی افسران، فوجی اور غیر فوجی اہلکاران اور ماتحت لوگوں کو دہلی اور دکن ان دونوں مقامات پر مسلسل آمد ورفت کرنی پڑتی تھی اور چونکہ یہ عمل طویل عرصے تک جاری رہا تھا، لہذا دہلی اور دکن کی زبانوں میں باہم

تبادلہ کا عمل بڑی سرگرمی اور استقلال کے ساتھ جاری تھا۔ اس لئے ان دونوں مقامات کی زبانوں میں ردّ و بدل قبول کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری تھا۔ چنانچہ ان دونوں مقامات کی زبانیں اس قدر مِل جُل گئیں تھیں کہ اس ملی جلی زبان کا نتیجہ مقامیت پر غالب آگیا اور ولؔی کے کلام میں اس کے اثرات واضح طور پر دکھائی پڑتے ہیں۔ دراصل اورنگ زیب کے قبضے کی وجہ سے جب شمالی ہند کی زبان دکن پہنچی اور وہاں رائج ہوئی تو اس کے اثرات مقامی زبان پر پڑنے لگے اس لئے اورنگ زیب کے دکن میں قابض ہونے کے بعد زبان میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ ولؔی کی شاعری میں منکس ہوئیں۔ ولؔی کی غزلیں انہی تبدیلیوں کی غمّاز ہیں۔

ولؔی کے کلام میں ٹھیٹھ دکنی الفاظ جو اورنگ زیب سے قبل پائے جاتے ہیں وہ عالمگیر کی فتح کے بعد آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے۔ فتح اورنگ زیب عالمگیر کے بعد جیسے جیسے زبان میں تبدیلیاں واقع ہوئیں، ویسے ویسے قدم بہ قدم ولؔی کی شاعری کا انداز زبان کے اعتبار سے بدلتا گیا اور دکنیت کی چھاپ کم ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ صفائی اور دلکشی نے لے لی۔ اس لئے جن تذکرہ نگاروں اور علماء نے ولؔی کی شاعری کو ''شاہ گلشن'' کے مشورے سے جوڑا ہے اسے درست قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس کی اصل وجہ ولؔی کا اورنگ آباد میں قیام پذیر ہونا ہے اور زبان کے تغیر کا نتیجہ ہے۔ جو اس وقت عوام میں مقبول ہو رہی تھی۔ اس لئے ابتدائی دور کی کچھ غزلوں کے بعد ولؔی کی شاعری دکنی الفاظ سے مبرّا نظر آتی ہے اور بھلا کوئی شاعر اورنگ آباد میں بیٹھ کر شمالی ہند کی زبان سے متاثر کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے ولؔی کی شاعری میں زبان کے اعتبار سے جو تغیّر پیدا ہوا دراصل وہ شاہ گلشن کے مشورے سے نہیں بلکہ اس ماحول کی دین ہے، جس کے پروردہ ولؔی تھے۔ جس کے زیر اثر وہ خود پروان چڑھے اور اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔ اس امتزاجی حسن کی مثال یہ ہے۔۔۔

؎ پھر میری خبر لینے وہ صیّاد نہ آیا
شاید کہ میرا حال اُسے یاد نہ آیا

؎ اے زباں کر مدد کہ آج صنم
منتظر ہے بیانِ روشن کا

؎ پڑا ہے حیرت میں دل اُس حُسنِ عالمگیر کے دیکھے
مصوّر دنگ ہے جس جلوۂ تصویر کے دیکھے

جب سوں وو نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب
دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

صبح تیرا درس پایا تھا صنم
شوقِ دل محتاج ہے تکرار کا

مندرجۂ بالا اشعار سے وؔلی کے کلام میں زبان کے اعتبار سے جو تغیّر پیدا اس کا نجومی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ وؔلی سے قبل کے شعراء کی غزلیں غزل کی روایت سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ کیوں کہ اس کا رنگ وآہنگ صنفِ غزل کے مخصوص رنگ وآہنگ سے ذرا مختلف تھا اور ان شعراء نے کبھی کبھی غزلیں کہہ لی ہیں۔لیکن ان میں سے کسی نے بھی باقاعدگی کے ساتھ غزل گوئی کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لئے غزل کی اس روایت کو پروان چڑھانے اور خالص غزل کی طرف توجہ مبذول کرنے میں وؔلی کو اوّلیت حاصل ہے۔ یوں تو وؔلی نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنا زورِ کمال دکھایا ہے۔ مثلاً : قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترجیع بند، مستزاد وغیرہ۔ ایسی اصناف کا وجود ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہی تو ہے۔لیکن وہ صنفِ خاص جو وؔلی کے کلام کی جان ہے اور جس کی طرف اُن کے پیش رووں نے بہت کم توجہ کی ہے وہ یہی فنّ غزل گوئی ہے۔ جس میں وؔلی نے اپنی حُسن کاری اور فنی چابکدستی اور ہنروری کا بدرجۂ اتم ثبوت دیا ہے اور ہوا بھی ایسا ہی کہ وؔلی کے ظہور کے بعد عالمِ شعر وشاعری میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوگیا۔ وؔلی کے ابتدائی کلام کو زبان کی حیثیت سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہے لیکن وسطی دور سے انھوں نے ایک ایسی شاعری کی بنیاد رکھی جو میؔر وسوؔدا سے ہوتی ہوئی غالبؔ وذوقؔ کے زمانے میں سربلند ہوگئی اور جس کی مقبولیت وہر دل عزیزی اب بھی ہندوستان میں بولی جانے والی ہر زبان سے کہیں بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے وؔلی کی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ وہ کیا ماحول اور حالات تھے جس میں اُن کی شاعری پروان چڑھی اور جس کا عکس اُن کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔

وؔلی کی شاعری کا **"تیسرا دور"** غالباً ۱۷۰۰ء اور اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کیوں کہ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق وؔلی نے دہلی کا پہلا سفر ۱۷۰۰ء میں کیا اور شاہ سعد اللہ گلشنؔ کے مشورے کی بات اسی سن میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ۱۷۰۰ء تک وؔلی ایک غیر معروف شاعر تھے اور اپنی شاعری جسے

لے کر وہ دہلی پہنچے تھے وہاں ناکام ثابت ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں ریختہ وجود میں آچکی تھی اور فارسی زبان زوال آمادہ تھی، عوام میں کچھ نئے پن کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے ولؔی کا ان حالات سے دو چار ہونا فطری تھا۔ لہٰذا یہ بات ان کے ذہن نشین ہوگئی کہ اپنی شاعری کا قدیم دکنی انداز بدل کر اس نئی زبان کے سہارے اپنی شناخت قائم کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس نئی زبان کے اس وقت کے مروّجہ اور نئے وجود میں آنے والے نئے نئے لفظوں کو اپنی شاعری میں سمونا شروع کیا۔ ولؔی کے اس نئی زبان میں زیادہ سے زیادہ نئے لفظوں کا استعمال کر کے شاعری کرنے کی ایک اور بنیادی وجہ ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ ولؔی کے ۱۷۰۰ء میں دہلی سے واپسی کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے فارسی زبان کی قدر و قیمت میں بڑی کمی واقع ہو رہی تھی اور مستقبل شناس نظریں اس کی بربادی کا تماشہ حال میں دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے ولؔی کو یہ احساس یقینی طور پر ہو چلا تھا کہ نئی مولد زبان قدم بہ قدم ترقی کر رہی ہے اور اس زبان کا ایک روشن مستقبل ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس ماحول کے دوسرے رُخ پر یعنی ولؔی کی شاعری کے ابتدائی زمانے میں عالمگیر کے دبدبہ اور شان وشوکت کے ساتھ دہلی کی زبان کی دکن میں آمد اور اس کے اثرات کے سرزمین دکن میں زبردست پھیلنے سے دکنیت کا وہ غلبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس طرح زبان اور سیاست دونوں اعتبار سے تمام دکن ولؔی کی شاعری کے ابتدائی زمانے میں مغلوب نظر آتا ہے۔ جس کا اثر واضح طور پر ولؔی کی شاعری میں بتدریج دیکھا جاسکتا ہے جس کا کچھ اشارہ اشعار کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔

یوں ولؔی کے پیش نظر ایک طرف ماضی کے وہ حالات و واقعات تھے جس میں انھوں نے شاعری کی (۱۷۰۰ء تک) اور دوسری طرف موجودہ حالات اور ان سے رونما ہونے والا مستقبل تھا۔ ولؔی ان دوطرفہ حالات کی منجھدار میں کھڑے تھے۔ جہاں سے ماضی وحال کے حالات بہت تابناک تو نظر نہیں آرہے تھے البتہ مستقبل کی تابناکی ان کی دوربین نگاہوں کو مفور ضرور کر رہی تھی۔ لہٰذا انھیں جلد یہ احساس ہوگیا کہ اردو زبان کا مستقبل زیادہ روشن اور تابناک ہے۔ اسی لئے عیسوی سن ۱۷۰۰ء کے بعد جب وہ دہلی سے واپس لوٹے تو اس نئی زبان میں شاعری شروع کی جو ان کے نزدیک زیادہ معتبر تھی۔ اور اس نئی زبان میں شاعری کرنے کا فیصلہ ولؔی کا اپنا تھا جو مذکورہ حالات سے اثر پذیر تھا اور اس زبان میں شعر وسخن کے اپنے فیصلے پر ولؔی عمل پیرا ہوئے۔ غرض ولؔی کی اس کامیابی میں کسی طرح بھی ''شاہ سعد اللہ گلشنؔ'' کے مشورے کا عمل دخل نہیں ہے۔ اس لئے ولؔی کے متعلق جن عالموں کا یہ خیال ہے کہ ولؔی نے اپنی شاعری کا رُخ شاہ سعد اللہ گلشنؔ کے مشورے سے موڑا ہے

وہ خارج از بحث اور بے بنیاد ہے۔ دراصل یہ ولی کی اپنی ذہنی اپج اور اختراع تھی اور شاعری میں لسانی اعتبار سے نیا تجربہ تھا، اور اپنے تجربے میں ولی بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ جس کی مثالیں ۱۷۰۰ء کے بعد کی ان کی غزلوں سے فراہم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ولی کی ۱۷۰۰ء کے بعد کی شاعری نہایت صاف ستھری اور سلیس ہے اور بعض غزلیں موجودہ زمانے کی اردو زبان معلوم ہوتی ہے۔ یا کچھ لفظوں میں مختصر سی ترمیم کے بعد موجودہ اردو زبان بن سکتی ہے۔ حالانکہ ولی کے ذریعے یہ کوشش آج سے تقریباً تین سو سال (۳۰۰) پہلے کی گئی ہے۔ چند نمونے یہاں اس زبان کے پیش کیے جاتے ہیں جو ولی کی غزلوں کو لسانی اعتبار سے موجودہ زمانے سے وابستہ کرتے ہیں

؎ مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

؎ اے ولی اس بے وفا کی مہربانی پر نہ بھول
دل کا دشمن ہے مگر کرتا ہے باتیں پیار کی

؎ گلی میں اُس ستم گر کی نہ جا اے دل، نہ جا اے دل
کہ جاں بازی میں آفت ہے، قیامت ہے، خرابی ہے

؎ ترے مکھ کے صفحے پر خط لکھا قدرت کے کاتب نے
تعجب میں ہیں سب خطاط اس تحریر کے دیکھے

؎ تری تعریف کرتے ہیں ملائک
ثناء تیری کہاں حدِ بشر ہے

؎ عشق میں صبر ورضا درکار ہے
فکر اسبابِ وفا درکار ہے

مذکورہ اشعار کی روشنی میں بھلا کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار ولی نے تین سو سال قبل کہے ہونگے۔ اس لئے ولی کی شاعری کو سمجھنے کے لئے یہ ادوار قائم کئے گئے ہیں تا کہ ولی کی شاعری کا جائزہ لینے سے قبل یہ بات

ذہن نشین ہو جائے کہ وہ کس ماحول اور حالات کے پروردہ ہیں اور ان حالات اور ماحول کے کیا اثرات ان کی شاعری پر مرتسم ہوئے، اس نقطۂ نظر سے ان کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدائی اپنی دینی تعلیم ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) میں حاصل کی، جو ایک صوفی حضرت علّامہ شاہ وجیہ الدین علویؒ (۹۱۰ھ تا ۹۹۸ھ) کا قائم کردہ تھا۔ اسی مدرسہ میں ولؔی نے ایک صوفی اور اپنے مرشد حضرت مولانا شیخ نور الدین صدیقی سہروردیؒ کے ہاتھوں پر بیعت بھی کی تھی۔ یوں ولؔی کی ذہنی نشو ونما اسی ''مدرسۂ علویہ'' اور اسی صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ گویا تصوّف اور صوفی مشرب حضرات کے درمیان تعلیم کا ایک طویل عرصہ گزارنا اور اس ماحول سے متاثر ہونا ایک ناگزیر عمل تھا۔ ولؔی بھی اس متصوّفانہ ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ ولؔی جب سنِ شعور کو پہنچے تو انھوں نے اپنے گرد صوفیوں کو ہی پایا تھا اور ان کے کان اہل اللہ کے نعروں سے بچپن ہی سے آشنا ہو چکے تھے۔ اس لئے جب ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کی شاعری میں تصوّف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ولؔی نے اس ماحول سے حسبِ منشا فائدہ اٹھایا اور احمد آباد کے چشمہ ہائے فیض سے اپنی علمی ادبی تشنگی بھی مٹائی۔ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''جب ہم ولؔی کے کلام کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں تو ہمیں بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ ''ہر ورقے دفتریست معروفت کردگار'' مگر ایسا کہنا ولؔی سے انصاف نہ ہوگا۔ ولؔی کے کلام کے بیشتر حصّہ تو یقینی اسی دنیا کے عشق وہوس سے تعلق رکھتا ہے۔ کلام میں کچھ حصّہ صوفیانہ رنگ میں پایا جاتا ہے چوں کہ فلسفہ وا خلاق تصوّف سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس نوع کے بھی اشعار ملتے ہیں۔
>
> غرض ولؔی صوفیوں کے ماحول میں پرورش پایا تھا اور خود صوفی منش تھا۔ اس لئے اُس نے اِس رنگ میں جو کچھ کہا ہے وہ بے جان اور رسمی نہیں ہے۔ اس کے جذبات مستعار نہیں معلوم ہوتے ان میں عارفانہ سرمستی اور آزاد منشی جلوہ گر ہے۔ [۶]

ولؔی نے جس زمانے میں احمد آباد میں تعلیم حاصل کی یہ وہ زمانہ تھا، جب احمد آباد میں مشائخ کا سکّہ چلتا تھا اور تمام سلسلوں کے خدا رسیدہ شیوخ موجود تھے۔ لیکن اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد ولؔی جب اس مدرسہ اور اس کی چہار دیواری سے باہر آئے، نیز اس صوفیانہ ماحول سے الگ ہوئے، تو ولؔی کے دل پر بھی دنیا کی بے ثباتی اور جاہ وحشمت کی بے وقعتی نے ضرور اثر کیا ہوگا۔ اس لئے ولؔی جب پہلے پہل اِس مدرسہ کی صوفیانہ دنیا

سے باہر آئے تو ان کی نظریں احمد آباد، سورت اور دیگر مقامات کی آمد ورفت کے دوران نظر آنے والے نسوانی حسن کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ کیوں کہ وؔلی ایک زمانے سے ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) میں مقیّد تھے اور اقامتی مدارس کی زندگی میں کسی خوب رو چہرہ کا دیدار تو درکنار بلکہ اس قسم کے مواقع یا حُسن کی ایک جھلک بھی دور تک ممکن نہیں ہوتی، اب اُسے تقاضۂ فطرت کہیئے یا عالمِ شباب میں وؔلی کی اپنی طبیعت، کہ ان کے پیشِ نظر دینی ماحول اور آدابِ مدارس اور اساتذۂ کرام کا لحاظ تھا۔ جب تک تحصیل علم میں مشغول رہے وہ دانستہ یا لاشعوری طور پر ہی سہی اس حُسنِ نسوانی کے اثرات کی چنگاری اپنے دل میں دبائے رکّھے۔ لیکن جیسے ہی اس مدرسہ کی قید وبند کی زندگی سے آزاد ہوئے انھیں ہر طرف حُسن ہی حُسن نظر آنے لگا اور اس سے متاثر ہونا بھی ایک ناگزیر عمل تھا۔

جیسا کہ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے لکھا ہے کہ وؔلی کے کلام کا بیشتر حصّہ تو یقینی طور پر اسی دنیا کے عشق وہوس سے تعلق رکھتا ہے اور اُن کے کلام کو پڑھ کر بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ تر شاعری اسی حُسن کے بیان پر بنی ہے اور اس حُسن کے بیان میں جس صنّاعی اور مہارت کا پتہ ملتا ہے اس سے ایک اور بات یہ بھی اخذ ہوتی ہے کہ وؔلی نے کیسے کیسے حُسن کے آفتاب اور ماہتاب چہروں کو دیکھا ہوگا اور ان کے ناز وانداز، چال ڈھال، سوز وگداز نے اُنھیں متاثر کیا ہوگا۔ جس کی بنا پر اس قسم کے اشعار کی بہتاب وؔلی کے کلام میں نظر آتی ہے۔

؎ مجھے روز قیامت کا رہا نئیں خوف اے واعظ
خیالِ قیامتِ رعنا مرے حق میں قیامت ہے

؎ مکتب میں جس کے ہاتھ ادا کی کتاب ہے
خوبی میں آج ہم سبق آفتاب ہے

؎ ہے مدرسے میں چرخ کی تجھ آفتاب سوں
جب سوں لیا ہے درس تری مکھ کتاب کا

اور بہت ممکن ہے کہ کہیں آمد ورفت کے دوران بھی کوئی حسین چہرہ، پری پیکر، ماہ رُخ، حُور صفت دوشیزہ سے ان کی آنکھیں چار ہوگئیں ہوں اور اس نظری تصادم سے پیدا ہونے والے جذباتی ہیجان کو وہ اپنے اندر دبائے رکھے ہوں۔ لیکن جب عالمِ تنہائی میں وہی خوبصورت چہرہ پھر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ان

کے ذہن کے پردے پر رونما ہوتا ہو اور خیالوں میں ان سے ہم کلام ہوتا ہو، تو ظاہری بات ہے کہ جب وہ تخیلی جذبات شعر کا پیرہن پہن کر اُن کی نوکِ قلم سے نکلے گا تو بھلا اُن کی شاعری میں حُسن اور عشق کے چرچوں کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس لئے ولیؔ کی شاعری میں جو حُسن وعشق کے چرچے پائے جاتے ہیں اس کی بنیادی وجہ ولیؔ کی یہی عاشقانہ طبیعت ہوسکتی ہے۔

ولیؔ کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ لیکن غالباً تحصیل علم کے دوران اساتذہ کا احترام، مدرسہ کے وقار کا احترام اور سب سے بڑھ کر اپنی رسوائی اور بدنامی کے خدشے نے ان کے قدموں میں زنجیر ڈال دی ہو۔ کیوں کہ اقامتی مدارس کا نظامِ تعلیم ہی اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اس طرح کے لہولعب گنجائش ہی ممکن نہیں ہوتی، اس لئے غالباً ولیؔ نے تحصیلِ علم کے درمیان اس نسوانی حُسن کی جانب نظریں نہیں اُٹھائیں۔ لیکن موقع بہ موقع کنایوں میں وہ ضرور اس کی جھلک دیکھتے رہے ہوں۔ کیوں کہ دورانِ راہ اگر کہیں کسی حسینہ سے نظروں کا تصادم ہو بھی گیا تو ولیؔ کی نگاہیں اُس حُسنِ خداداد کا بغور جائزہ نہ لے سکی ہوں اور اپنی ولیؔ نے اپنی تعلیمی زندگی کے دوران احمد آباد اور سورت وغیرہ نیز دکن اور گجرات کی آمد ورفت کے درمیان جو کچھ بھی حُسن دیکھا اس کا ذکر ان کی تعلیمی زندگی کے دوران ممکن نہیں تھا۔ اس لئے ولیؔ جب اس مقیّد دینی تعلیمی ماحول سے باہر آئے تو زمانے میں موجود حسین اور دلکش چہروں نے ان کے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیا۔ کیوں کہ احمد آباد اور سورت کا حُسن مشہورِ زمانہ ہیں اور اس حُسن کے متعلق ایک بہت مشہور مقولہ بھی ہے کہ۔۔۔

''گجرات کا حُسن اور سورت کی مورت''

یوں گجرات کے اس مشہور حُسن سے پورا عالم متاثر رہا تھا اور شاہی زمانے میں بہت سے شعراء نے یہاں کے فطری اور نسوانی حُسن کی تعریف میں غزلیں کہی ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر نظیریؔ نیشاپوری کی غزل کے دو بند پیش کئے جاتے ہیں جو اُس نے احمد آباد کے نہایت ہی حسین وجمیل چہروں سے متاثر ہوکر کہی تھی اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے گجرات کی اور بطورِ خاص ''احمد آباد'' اور ''سورت'' کی گود میں کتنا بے پناہ حُسن بھر دیا تھا، کہ جس کی ایک جھلک پانے کے بعد انسان بے قرار ہو اُٹھتا تھا اور اس حُسن کا نشہ کچھ ایسا ہوتا تھا کہ طبیعت پر وارفتگی چھا جاتی ہے۔ نظیریؔ نیشاپوری بھی گجرات اور احمد آباد کے اس خداداد حُسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اپنے اشعار کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔۔۔

ے منم کہ کشتۂ گجراتیانِ بیدادم
خرابِ عشوۂ خوبانِ احمدآبادم

ے چو رشکِ گلشنِ فردوس احمدآباد است
از ومباد برونم کشند چو آدم

اسی طرح اکبرِ اعظم کے عہد کے ایک کشمیری شاعر صرفی بھی گجرات آئے تھے، اُنھوں نے احمد آباد (گجرات) کے حسن و جمال سے متاثر ہوکر مندرجۂ ذیل اشعار کہے ہیں ۔۔۔

ے اگر گجرات منزلہاست می بینی نمی خواہی
کنار آبِ رکن آباد گلگشت مصلیٰ را

ے برو در احمدآباد بہر جانب تماشا کن
اگر خواہی کہ بینی دلبرانِ ماہ سیمارا

یوں ولی بھی یہاں گجرات میں اپنے قیام کے دوران کے نسوانی حُسن کی تاب نہ لا سکے اور یہاں اپنی تعلیمی زندگی کے طویل عرصے کے درمیان جو حُسن انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا، اُس حُسن کے بیان کی چنگاری ان کی تعلیمی فراغت کے بعد شعر کے سانچے میں ڈھل کر شعلہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس لئے ولی کی غزلوں کا بیشتر حصّہ اسی نسوانی حُسن کی ثناء خوانی پر مبنی ہے۔ کیوں کہ ولی اس حُسن کے مدّاح اور متلاشی تھے۔ لیکن چونکہ انھوں نے اپنی ان خواہشات اور محسوسات کو شدّت کے ساتھ دبائے رکّھا تھا، اس لئے جب ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی تو انھوں نے اس طویل عرصہ میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا اور حُسن کا جس جس طرح سے مشاہدہ کیا تھا اور اس کے اِک اِک انداز کا جس طرح سے جائزہ لیا تھا، حُسن کو اُسی انداز میں اپنی شاعری کا موزو بنایا ہے۔

غرض یہ کہ ولی کی شاعری کا بیشتر حصّہ اسی حُسن کے مشاہدات اور محسوسات پر مشتمل ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے احساسات اور جذبات کی ترجمانی نہایت ہی حسین انداز میں کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلاؔم کا بیشتر حصّہ اُس حُسن کے بیان اور اُن کی دلی کیفیات پر مبنی ہے اور انھوں نے اسی نسوانی حُسن کو مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے پیش کیا اور حُسن کے ان بیانات ہی نے انھیں ایک جمال پرست شاعر بنادیا ہے۔ کیوں کہ ولی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جو کچھ اس سے اخذ کیا نیز جو تہذیبی ورثہ اُنھیں ملا یہ سب

مزاجاً جمال پرستی کے رجحان کی ایک واحد واضح صورت تھی۔

دراصل وؔلی کی شاعری جو بنیادی طور پر حُسن وعشق کے معاملات پر مشتمل ہے اس کی بنیادی وجہ حُسن اور اس کے جلووں کی وہ تشنگی ہے، جس سے وؔلی ایک زمانے تک محروم رہے تھے۔ یہ شاعری اسی محرومی کا پرتو ہے کہ جو چیز جتنی شدّت سے وؔلی کے وجود میں دبی ہوئی تھی، اُسے جب موقع میسّر ہوا تو اس سے دُگنی قوّت سے ظہور پذیر ہوئی۔ گویا وؔلی کی شاعری اسی نسوانی حُسن کی لذّت، اس کی نازواداِ، اس حسن کی لطف انگیزیوں اور حُسن کے معاملاتؔ کے بیان تک محدود ہوگئی گویا وؔلی نے صنفِ نازک کی مختلف تصویریں جو مختلف زاویوں سے دیکھی تھی اور حسن کا وہ مجسّمہ جو ان کے دل ودماغ میں گردش کر رہا تھا، ان کی شاعری کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ یوں وؔلی نے حُسن کی تصویر کشی میں اپنے فن کا جوہر دکھایا ہے۔

وؔلی کی عشقیہ شاعری کے بنیادی محرکات میں احمد آباد اور سورت کی حسیناؤں کا بڑا عمل دخل ہے۔ کیوں کہ اپنے تحصیل علم کے اس طویل قیام کے درمیان یہاں کے شب وروز میں بہت سے سیمی بدن اور نازک اندام، کافر حسیناؤں نے وؔلی کو اپنے حُسن وجمال سے متاثر کیا ہوگا اور اُن حسین چہروں کی دلکش اداؤں سے وؔلی کا دل گھائل اور بیقرار ہوا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وؔلی نے گجرات سے رخصتی کے بعد بھی یہاں کے قدرتی مناظر اور حسین چہروں کا نقشہ اپنے دل ودماغ سے محو کرنے سے قاصر رہے۔ احمد آباد اور سورت کے خوب رو اور ان کی قاتل ادائیں وؔلی کا قرار تھیں۔ لہٰذا جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے اور گجرات کو الوداع کہا تو جدائی کا یہ کرب ''قطع درفراقِ گجرات'' کی شکل میں ظاہر ہوا تو دوسری طرف سورت کا نسوانی حُسن وؔلی کے تصوّر میں جمود اختیار کئے رہے اور جن کے ہجر میں وؔلی تڑپتے رہے اور بے قرار ہوکر کہہ اُٹھے۔۔۔

؎ گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب سینے منیں آتش بہار دل

ہجرت سے دوستان کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل

افسوس ہے تمام کہ آخر کوں دوستاں
اس میکدے سوں اُٹھ کے چلا سُدھ بسار دل

ے دل چھوڑ کے، یار کویں کے جاوے
زخمی ہے شکار کیوں کے جاوے

ے یارو سلام میرا اس یار بس کہو جا
مجھ ہجر کے یو دکھ کوں دلدار میں کہوجا

مذکورہ اشعار سے وؔلی کا گجرات کے شہر احمد آباد اور سورت سے والہانہ لگاؤ کا احساس ہوتا ہے اور اس کی گہرائیوں میں وؔلی کے ترکِ وطن کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ کیوں کہ عشق انسانی فطرت کا لازمی جزو ہے اور وؔلی جیسے حُسن پرست انسان کے لئے اورنگ آباد اور بالخصوص عالمگیر جیسے سخت پسند شہنشاہ کے عہدِ حکومت میں اپنے آبائی وطن میں دلچسپی کا کیا سامان ہوسکتا تھا؟ اور چونکہ یہ زمانہ وؔلی کے شباب اور اس کے ظہور وبلوغ کا زامانہ تھا اور اس زمانے میں اورنگ آباد اور گجرات کے درمیان آمد ورفت کا مرکز ''سورت شہر'' تھا اور ''باب المکّہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ لہذا وؔلی کو''سورت'' ہر حال میں آنا ہوتا تھا اور یہاں ایک بڑی بندرگاہ تھی، جہاں بیرونِ ممالک اور خلیج کے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ دنیا کی ہر شے یہاں ملتی تھی۔ میلے ٹھیلوں وغیرہ کا اہتمام بھی ہوا کرتا تھا اور ہندو مذہب کی بعض مذہبی رسوم میں عورتوں اور مردوں کے غسل کے لئے یہاں تالاب بھی تھے۔ جہاں مذہبی تقاریب کے موقع پر عورتیں بے پردہ ہوکر غسل کیا کرتی تھیں اور طرح طرح کے کیا کیا تماشے تھے جو یہاں نہیں تھے؟ یہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا اور اس شہر سورت کی خوبصورت عورتیں بناؤ سنگھار کر کے ان تماشوں میں شریک ہوتیں تھیں۔ تالابوں پر غسل کرتیں تھیں۔ آپ ذرا سوچئے ایسے خوشگوار ماحول میں نوجواں چہروں کے قہقہے، غسل کے درمیان ہنسی مذاق، نیم برہنہ خوبصورت جسم اور کیا کیا خوبصورت نظارے ہوں گے کہ وؔلی مدمست ہوکر ان حُسن کے قصیدہ خواں بن گئے اور شہر سورت اور اس کے حُسن وجمال میں ایک طویل مثنوی تخلیق کی اس مثنوی کے چند اشعار دیکھئے۔۔۔

ے بھری ہے سیرت وصورت سے سورت
ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت

ے نظر بھر دکھو ہر گل بدن کوں
کہ ہے پردے سوں بے پروا اُنن کوں

ے ختم ہے امرواں اوپر صفائی
ولے ہے بیشتر حُسن نسائی

ے زُلف اور مکھ کے طالب سوں پچھو بات
جسے ہر دن ہے عید اور رات شبرات

ولّی شہرِ سورت سے محظوظ ہوتے ہیں اور اپنی آمد ورفت کے درمیان زندگی میں کبھی نہ فراموش ہونے والے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لئے گجرات سے الوداع ہونے کے بعد یہاں کے وہ حسین مناظر جو اس کی زندگی کا بیش قیمت سرمایۂ حیات تھے، طرح طرح سے اُنھیں یاد آتا ہیں۔ وہ ہجر کی آگ میں جلتے ہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ بیان کیا گیا ولّی مزاجاً عاشق واقع ہوئے تھے اور حُسن کے پرستار تھے اس لئے ولّی جیسے آزادمشرب کے لئے ان کا دل تو حُسن کی اس ہنگامہ جا فضاء کے لئے بیتاب رہتا تھا۔ کیوں کہ یہ اُمنگیں اس سے قبل بھی غیر شعوری طور پر انسان میں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے اُن کی آنکھیں عہدِ جوانی کی ابتداء سے ہی حُسن کی متلاشی رہتی ہیں۔ کیوں کہ دنیا کا ہر شخص خیالی طور پر عاشق مزاج ہوتا ہے۔ اس لئے ولّی احمد آباد (گجرات) اور سورت کی سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ دیکھئے یہاں کے نسوانی حُسن کی صداقت شعارانہ موکشی ولّی سے پہلے یا بعد میں اس تفصیل کے ساتھ کہیں اور نہیں ملتی جیسا کہ اس گجراتی حسینہ کے حُسن کے بیان میں کہی گئی ہے۔

ے مجھ دل کے کبوتر کوں باندھا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

ے تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری ٹک اس کو پُجاتی جا

ولّی نے یہاں کے گجراتی لباس، یہاں کی ٹھسّے دار گجراتی ساڑھی، گھیر دار بڑا گھونگھٹ جس میں ولّی نے سینکڑوں خوبصورت چہروں کا معائنہ کیا ہوگا اور حسین وجمیل دلکش سورتی اداؤں نے کس کس طرح سے ولّی کو زخمِ جگر دیا ہوگا اور ان اداؤں کی چبھن کتنی گہری ہوگی کہ ولّی کے اشعار پڑھ کر ہمیں اُن سے ہمدردی کا احساس ہوتا ہے اور ان جذبات کی ترجمانی ولّی نے اس والہانہ انداز میں کی ہے جس سے کلام کی روانی، لفظوں کی چستی اور

برجستگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ولی یہاں کے حُسن پیکروں سے کس قدر متاثر تھے اور ان کے عاشقانہ جذبات کیا تھے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ولی اپنے جذبات کی ترجمانی میں کہتے ہیں ---

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا
سحر ہے سروِ گل جبیں کی ادا
ہوش میرا نہیں رہا مجھ میں
جب سوں دیکھا ہے نازنیں کی ادا

مجھ گھٹ میں اے نگھر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا
دیکھے سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا

کر یاد تجھ کپٹ کوں پڑتے ہیں اشک ٹپ ٹپ
مکھ بات بولتا ہوں شکوہ تری کپٹ کا

تجھ نین کے دیکھن کا دل ٹھاٹ کر چلا تھا
غمزے کے دیکھ ٹھٹ کوں نا چار ہوکے ٹھٹکا

ولی احمد آباد اور سورت (گجرات) کے خوب روؤں کے عشق میں نہایت مخلص اور ثابت قدم ہے اور اُن کا والہانہ پن اُن کو جنون کی حد تک لے جاتا ہے اور وہ یہاں کے حُسن کے ثناء خواں معلوم ہوتے ہیں اور اس حُسن کی گرفت میں جکڑے نظر آتے ہیں۔

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا
نہیں دیکھتا سُرج کی جھلکار کا تماشا

اے رشک باغِ جنت جب سوں جدا ہوا توں
دوزخ ہے مجھ کوں تب سوں گلزار کا تماشا

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا	ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا	ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

اس طرح حُسن کی عبادت میں محو، ولی کے سینکڑوں اشعار ہیں۔ جس میں ولی نسوانی حُسن کی قصیدہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن حُسن کے بیان کی وسعت اور گہرائی کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ خیال ابھرتا ہے کہ ولی حُسن کے شیدائی ہیں اس۔لئے اُن کی توجہ کا مرکز صرف ایک فردِ واحد نہیں بلکہ گجرات کا تمام حُسن اور وہ مقامات بھی جہاں ان کی رسائی رہی ہو، اس میں اورنگ آباد اور دہلی بھی شامل ہے۔ ان مقامات پر بھی جس کسی نے اپنے جمال کا جلوہ دکھایا ولی کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس لئے وہ تمام حُسن اور اس کی دلکش ادائیں جس کا بیان ولی کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ انھیں مختلف النوع چہرے اور ان کے ناز وانداز پر مبنی ہیں۔

اس لئے جب ہم ولی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو عشق اور حُسن کے بیان اور ان سے دل لگی، چھیڑ چھاڑ اور لگاوٹ کی باتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ یہ تمام شاعری ولی کے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے اور جو کچھ انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا، اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہر کر اپنی دلی کیفیات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے گئے ہیں۔ اس لئے ولی کی شاعری میں عشقیہ مضامین کا زبردست غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، جس حسّاس دل کے سامنے ہزاروں لاکھوں خوبصورت چہرے اپنا جلوہ دکھاتے رہے ہوں بھلا ایسے شاعر کی شاعری میں اس کے سوا دیگر مضامین کی بات بھی کیسے ہوسکی تھی؟ میر کی اَلم پسندی اور غم دوستی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لیکن ولی کی شاعری اس کے برعکس ہے۔ جہاں عیش ونشاط کا سمندر موجزن نظر آتا ہے بلکہ یوں کہیئے کہ ولی کے کلام میں اَلم (غم واندوہ) کا نام ونشان نہیں ملتا اور اگر کہیں اس کا شائبہ نظر بھی آتا ہے تو اس کی حقیقت صفر کی سی ہے۔

اس لئے جب ہم ولی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں اور طبیعت میں شگفتگی طاری ہوجاتی ہے اور تصوّر میں ایک حسین چہرے کا عکس اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ابھرنے لگتا ہے اور اشعار کے بیان کے مطابق اس کی متحرک تصویر ذہن کے پردے پر رقص کرنے لگتی ہے۔ اور سرور مستی کی کیفیات طاری ہونے لگتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبد اللہ۔۔۔

''ولی نے زندگی کے جمال پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ان پہلوؤں کو دیکھا ہی نہیں جن سے نظر میں تلخی اور نظریے میں پژمُردگی پیدا ہوتی ہے۔ [۷]

گویا ولی کے کلام میں جمالِ زندگی اور اس کی رینائیوں کی جلوہ گری ہے اُن کے دیوان کا تمام کلام اور شاعری کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ جمالِ زندگی کے وصّاف اور قصیدہ خواں تھے اور جس کی

زندگی میں دنیا کے تلخ حقائق نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ نیز حُسن اور عشق کے نغمے جس طرح ولی نے گائے ہیں، اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ ولی عشق کے حقیقی عمل سے بے حد دور تھے۔ اگر ان کی زندگی میں حقیقی یعنی زندہ تجربۂ عشق ہوتا تو کہیں نہ کہیں اُن کی شاعری میں ہجر وفراق کی وہ سچائی ضرور معلوم ہوتی جو ہمیں ان کی شاعری میں مفقود نظر آتی ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ولی حقیقی عشق میں کبھی گرفتار ہی نہیں ہوئے، بلکہ ہر حسین پیکر کو اپنا معشوق تصوّر کرتے رہے اور ہر خوبصورت چہرے سے دل لگا کر اس کے عشق میں محبت کے نغمے گنگناتے رہے ہیں۔

بعض عالموں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ولی کا کوئی نہ کوئی معشوق تو ضرور ہی رہا ہوگا، ورنہ عشقیہ واردات کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ برتنا ولی کے لئے محال ہوتا۔ کیوں کہ عشق کی حقیقی لذّت کے بغیر اس طرح کے مضامین میں حقیقی روح پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے ولی کے متعلق یہ الزام عائد کیا گیا کہ ان کا بھی کوئی معشوق ہے اور یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے بقول ڈاکٹر سیّد عبد اللہ۔۔۔

"ولی کا ایک ساجن ہے جس کی وہ پیار سے صدہا ناموں سے پکارتا ہے"۔ ۸

آگے لکھتے ہیں کہ۔۔۔

"ولی کے تخیل میں کسی خاص حبیب کا نقشہ تھا جس کا سراپا ایک عجیب دلکش انداز میں نمایاں ہے۔ ۹

غرض یہ کہ ولی نے اپنی غزلوں کو محبت اور داستانِ محبت کے لئے مخصوص کر دی تھی۔ لیکن جیسا کہ ولی کے معشوق ہونے کا ذکر کیا گیا اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس بات سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ بغیر کسی خاص شخص سے عشق کے بغیر اپنے محبوب کے حُسن وجمال کے پُر شوق ترانے گانا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ ولی کے کلام میں بعض جگہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جس سے ان کی خط وکتابت، قاصِد کی شکایت، انتظار، درد واَلَم، کیف وسرور اور باہم گفتگو کا اندازہ ہوتا ہے۔

؎ بات رہ جائے گی قاصد وقت رہنے کا نہیں
دل تڑپتا ہے شتابی لا خبر دلدار کی

بات کہنے کا بھی جو وقت پاتا ہے غریب
بھول جاتا ہے وو سب کچھ دیکھ صورت یار کی

ے آتا نہیں ہے تجھ بن اک آن خوابِ راحت
تکیہ مرے سرہانے ہر چند مخملی ہے

ے اے ولی طرزِ عشق آسان نئیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

ے اے یہ تیرے نین ہیں وہ چنچل
دیکھنے جن کوں خلق آوے چل

مذکورہ اشعار کے مطالعے سے یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہوتا کہ ولی کا معشوق فرضی تھا اور حسن کے اُس پیکر کے لئے اُن کی نگاہیں ہمیشہ تلاش اور جستجو میں لگی ہوئی تھیں اور جس کے لئے اُن کی روح بے قرار رہتی تھی۔ بلکہ یہ ماننا پڑتا ہے ولی کا معشوق بے نام اور موہوم نہیں بلکہ حُسن وجمال کا جیتا جاگتا مجسّمہ ہے۔ جس کی تحسین وآفرین سے بے نیاز ہوکر ولی شوق سے عشق کے ترانے گاتے رہتے ہیں۔ لیکن بعض جگہ عشق کا بیان، اس کی لذّت اور مسرّت میں مبالغہ کی حد معلوم ہوتی ہے اور حُسن کے بیان میں یا اپنے معشوق کی جن صفات کو ولی نے پیش کیا ہے وہ کسی ایک انسان کی نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے شک پیدا ہوتا ہے کہ ہر حسین چہرہ ولی کا ساجن ہے، جس سے وہ باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ جس حیرت انگیز طریقے سے ولی اپنے محبوب کے سراپے کا ذکر کرتے ہیں وہ تمام جسمانی خصوصیات کسی ایک شخص کی نہیں ہوسکتیں، بلکہ حُسن کا ہر پیکر ان کا محبوب اور ساجن ہے اور جس حسین شئے نے ان کے دل پر جو کیفیت طاری کی اس کا ذکر اشعار میں کردیا ہے۔

ے ہر دل رُبا کوں ہرگز دیتا نہیں ہوں دل میں
دل بستگی کو میری وہ بے مثال بس ہے

ے جو عشق کے نگر کا ہے صوبہ دار جگ میں
مجنونِ لیلیٰ حسن اس کا خطاب بس ہے

ے تیغ ابرو کی جب وہ جھاڑا ہے
کئی ہزاروں کو جی سے مارا ہے

غرض یہ کہ ولی کی غزلوں میں اپنے محبوب کی سراپا کشی کو خاص دخل ہے۔ ولی نے اپنے محبوب کے خدوخال کو ظاہر کرنے اور اس کے سراپے سے خود کو لطف اندوز ہونے تک محدود رکھا ہے۔ اس میں ہوس کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا اور اُن کے کلام کی ساری خوبی ان کی سادگی اور بے تکلفی میں پنہاں ہے۔ ولی نے نہایت ہی خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے معشوق کے سراپا کا جائزہ لیا ہے۔ اس لئے ولی کے کلام میں ایک عاشق کا کردار پایا جاتا ہے، جو اپنی مشرافتِ طبع اور متانت ووقار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جب کہ قدم قدم پر اُنھیں مایوسیوں، ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عشق میں نہایت مخلص اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی تغافل شعاری کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ اور کہیں اپنی خودسپردگی کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے محبوب کے درجے اور شان کو برقرار رکھتے ہیں تو دوسری طرف اپنی خود داری کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور امید و وصال کے یقین کے ساتھ عشق کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی طبیعت میں شکست اور نامرادی کا عنصر نہیں ہے۔ بلکہ پُر امید حوصلوں کے ساتھ رواں دواں نظر آتے ہیں۔ وہ عشق کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلوں کے ہر شعر میں درد، تڑپ، التجا، شکایت، آرزو پنہاں ہے اور جس سے سلیقۂ محبت کا ایک مہذّب انداز ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے ولی کے خلوصِ دل اور خلوصِ احساس کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ولی کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے ایک بات یہ بھی مترشح ہوتی ہے کہ ولی کی تمام زندگی حسین ترین لمحات اور اوقات میں گذاری ہے اور ایسے حالات، واقعات، معاملات پیدا ہی نہیں ہوئے جس سے غم والم، اداسی، اور ذہنی اضطراب کا سامنا ہو۔ ان لئے ان کی طبیعت میں ایک طرح کی مستی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں دکھ، درد اور اس طرح کی دیگر مشکلات اور پریشانیوں کا بیان مفقود نظر آتا ہے۔ ان کی پوری زندگی بڑے ہی خوشگوار ماحول میں گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہر خوشگوار اور خوبصورت شئے اُنھیں اپنی حقیقت سے زیادہ دلکش اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی توجہ حُسن کی جانب زیادہ مبذول نظر آتی ہے۔ اور وہ حُسن کے بیان اور اس کی تفصیل میں بلا کی بلند پروازی دکھلاتے ہیں جو ان سے قبل دکن کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اور یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ ولی اپنے محبوب اور معشوق کے سراپے کے بیان جتنا مست الست دکھائی دیتے ہیں اور اس کے حُسن کے نشے میں جو جنونی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے اور اس جنون کے عالم میں وہ جو اشعار کہتے ہیں اس کی مثال/نظیر آج تک نہیں ملتی۔

ولی کی شاعری داستانِ حسن کا دیوان ہے اور اس حُسن کے بیان میں جس سادگی سے ولی نے شیرنی پیدا کی ہے وہ لاجواب ہے۔ اس لئے وہ بلا شبہ حُسن کے مصوّر اور جمال پرست واقع ہوئے تھے اور ہر خوب رو کو پوری توجہ سے دیکھتے ہیں اور پھر اس کی ترجمانی اپنی غزلوں میں کرتے ہیں اور اس کے ایک ایک عضو کا بیان نہایت حسین پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری اس سراپے میں گم ہوجاتا ہے۔ وہ مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں کھینچتے ہیں اور ہر زاویے سے اس کے رنگ وروپ کو اجاگر کرتے ہیں اور حُسن کی اس مصوّری میں ولی نے ایسے ایسے خوبصورت دلآویز اشعار پیش کئے ہیں، جس سے ان کے تصوّرِ حسن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار دیکھئے۔

؎ دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا
نئیں دیکھتا سُرج کی جھلکار کا تماشا

؎ وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رُخاں سوں ممتاز ہے سراپا

؎ جب مٹک چال سجن مجھے یاد آتی ہے
دل مرا رقص میں آتا ہے مثالِ رقاص

؎ ہر ہر نگہ سوں اپنے، بے خود کرے ولی کوں
وہ چشم مست سرخوش جب نیم خواب ہووے

ولی کے کلام میں جب بھی وہ اپنے محبوب کے سراپا کی تصویر کشی کرتے ہیں تو وہ اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں، تابانیوں اور جگمگائیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے اور اس کی صورت وسیرت کی تفصیل وجزئیات ان کی غزلوں میں ہر طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ ولی کے یہاں ایسی بے شمار غزلیں پائی جاتی ہیں جن میں صرف محبوب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی مصوّری ملتی ہے اور وہ اس مصوّری میں گم نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کا محبوب چلتا، پھرتا، ہنستا بولتا، نازو انداز دکھاتا، بھاؤ بتاتا، شرماتا اور لجاتا نظر آتا ہے۔ اور بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ولی نے اپنے محبوب کے سراپے میں جان ڈال دی ہو۔ اور وہ متحرک ہو کر ہمارے سامنے موجود ہو۔ لیکن اس کے باوجود حُسن وجمال سے یہ والہانہ دلچسپی اُن کے یہاں

انبساط ونشاط کی حدود سے متجاوز ہوکر لذّت اور تعیش کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتی اور بہر حال اخلاقی دائرے میں اس کی صحت مندی قائم رہتی ہے۔

غزل جس میں محبت اور داستانِ محبت کے لئے بہت پھیلاو ہے۔ اس میں عاشق اور معشوق، حسن اور محبوب، ہجر ووصال لازم اور ملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کی غزل میں حسن کے ساتھ محبوب اور محبوب کے ساتھ حُسن کا خیال آتا ہے اور ولیؔ نے اسی محبوب کے ظاہری حُسن کی تعریف میں اپنے قلم کا زور دکھایا ہے۔ کیوں کہ ولیؔ مزاجی طور پر عاشق واقع ہوئے تھے اور عاشقانہ جذبات ان کی طبیعت میں بڑی گہرائی تک سرایت کئے ہوئے تھے۔ اس لئے ہر خوبصورت چہرہ اُنھیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی انفرادیّت اور اہمیت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں۔

ولیؔ نے اپنی غزل میں اپنے محبوب کی جو رنگا رنگ تصویر بنائی ہیں وہ خیالی معلوم نہیں ہوتیں۔ حالانکہ ویسے تو اس میں تخیّل کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ لیکن ان کی ہر وہ غزل جو کسی محبوب کے سراپے کا جائزہ لیتی ہے یا اپنے محبوب سے ہم کلام ہوتے ہیں وہ محض فرضی نہیں ہے یا تخیّل کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ ان کے تخیّل کے اسی انداز میں حقیقت کارفرماں ہے۔ کیوں کہ جب بھی وہ کسی حسین شخص کا معائنہ کرتے ہیں اُسے برابر داد وتحسین دیتے ہیں اور ان کی زبان پر شکوہ نہیں آتا۔ اس لئے ولیؔ کا محبوب جب بھی ان کے سامنے آتا ہے وہ دل کھول کر اس کے حُسن کی پذیرائی کرتے ہیں۔ وہ اس کو ظالم، سفّاک، بے رحم اور جفا کش نہیں کہتے بلکہ بڑے ہی معصوم انداز میں اُسے ہرروز اپنا جلوہ دکھانے کی التجا کرتے ہیں۔ اور وہ ہر روز اس کے دیدار کے تمنائی ہیں۔ دراصل یہ ان کے جذبات کا ردِّعمل ہوتا ہے اور ان جذبات کی تسکین کے لئے بڑے ہی معصوم انداز میں اپنے محبوب کے حضور ملتّیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ولیؔ کے یہ اشعار اسی صورتِ حال کے عکّاس اور ترجمان ہیں۔

؎ ترے جلوے سوں اے ماہِ جہاں تاب
ہوا دل سر بسر دریائے سیماب

؎ جب سوں وہ نازنین کی میں دیکھا ہوں چھب عجب
دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

؎ پڑا حیرت میں دل اُس حسن عالمگیر کے دیکھے
مصوّر دنگ ہے جس جلوۂ تصویر کے دیکھے

ولؔی کی غزلوں میں معشوق کے حُسن و جمال، شراب، فراق کے اَلم کا شکوہ، معشوق کی جفاؤں اور بُری عادتوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ لیکن ولؔی کا معشوق بھلا ہے کہاں؟ اور وہ کہاں کا ساکن ہے؟ اور اس کا نام اور اتا پتہ کیا ہے؟ یہ بحث ایک مدّت سے چھڑی ہوئی ہے اور آج تک اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہوسکا ہے۔ بعض علماء ولؔی کے معشوق کو خیالی تصوّر کرتے ہیں اور بعض کو اس کے یقینی طور پر ہونے کا گمان ہے۔ لیکن چونکہ ولؔی کی غزلوں اور اُن کی شاعری میں اُن کے معشوق کے متعلق کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملتی، اس لئے کسی فردِ خاص سے اُن کے عشق کے متعلق سوالیہ نشان آج تک بنا ہوا ہے اور یقینی طور پر اُن کے معشوق کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

ولؔی کی غزلوں میں مناظرِ قدرت، درختوں، جانوروں، پھلوں اور باغوں اور ایسی دوسری قدرتی اور نیچرل چیزوں کا ذکر بھی بہت کم پایا جاتا ہے کیوں کہ ولؔی کا تعلق ہمیشہ شہروں سے رہا ہے۔ خواہ وہ احمد آباد ہو، سورت ہو، اورنگ آباد ہو یا دہلی ہو وہ ہمیشہ شہروں سے ہی وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے ولؔی کے کلام میں مافوق الفطرت عناصِر کا فقدان نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ولؔی عہدِ طفولیت میں "مدرسۂ علویہ" احمد آباد (گجرات) میں طویل عرصہ تک دینی تعلیم کے ماحول میں قید وبند کی زندگی گزارتے رہے اور اگر کہیں پھولوں یا سبزہ کا ذکر ان کے کلام میں پایا جاتا ہے یا وہ اپنے محبوب کو چمن میں آنے کی دعوت دیتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان شہروں اور علاقوں میں جو تفریح گاہیں تھیں، وہاں ولؔی کا گزر رہا ہوگا اور وہ اپنے فرصت کے لمحات میں ان روح افزاء مقامات کی سیر کو جایا کرتے ہوں گے جو بطورِ خاص ان شہروں کو مزیّن کرنے کی غرض سے شاہانِ وقت کی جانب سے بنائے گئے تھے۔ لیکن ولؔی کو ان خوبصورت باغات اور پھولوں کے گلشن میں بھی قرار میسّر نہیں تھا۔ وہ تو حُسن کے متوالے، حُسن کے دیوانے اور حُسن کے عاشق تھے۔ اس لئے جب بھی وہ اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں ان کی طبیعت پر بیزاری اور بیقراری کا عالم طاری ہوتا ہے، تو ایسے ماحول میں وہ اپنے تسکینِ دل وقلب کے لئے کسی گلشن یا تفریح گاہ کی سیر کا متلاشی یا متمنی نہیں، بلکہ کسی خوبصورت یار کے دیدار کے خواہش مند ہے۔ تاکہ اس کے خوبصورت چہرے سے لطف اندوز ہوکر اپنی طبیعت کی اکتاہٹ دور کرسکے ولؔی کہتے ہیں کہ۔۔۔

ے ہماری سیر کوں گلشن سے کوئی یار بہتر تھا
نفیرِ بلبلاں سے نالہائے زار بہتر تھا

ے نہیں ہے شوق مجھ کوں باغ کی گل گشت کا ہرگز
ہوا ہے جلوہ گر داغاں سوں سینے کا چمن میرا

ولؔی کی شاعری بنیادی طور پر جمالیات پر ہی مبنی ہے وہ حُسن کے شیدائی ہیں اور یہ حُسن ہی ان کا قرار ہے۔ مذکورہ شعر سے بھلا کیا کوئی ولؔی کی جمال پرستی سے انکار کرسکتا ہے؟ ولؔی کی غزلوں میں جمال پرستی کا وافر تذکرہ ہے اور اپنے محبوب کے جمال اور حُسن کے بیان میں ولؔی نے ایک خاص کشش اور موزونیت پیدا کی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ مختصر سی عبارت میں کوئی لطیف بات کہہ جاتے ہیں اور بات کہنے میں اُنھیں لفظوں کے انتخاب کے ساتھ ردیف اور قافیہ کی پابندیوں میں اُنھیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے ولؔی کا ذہن بہت جلد ایسے خیالات کا انتخاب کر لیتا ہے جو ان تعینات کے ساتھ نظم کئے جاسکیں۔ بعض اوقات ولؔی کی غزلوں میں تمام اشعار میں مضمون کا ربط اور خیالات کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایسی غزلیں بھلے ہی عام خیالات یا حُسن وعشق کے عام بیان پر مبنی ہوں، لیکن اس کے باوجود لطفِ بیان کے باعث وہ بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

ولؔی کے زمانے میں جب اردو شاعری نشو ونما پا رہی تھی اُس زمانے میں معشوق اکثر پردہ نشین ہوتے تھے جیسا کہ ولؔی نے بیان کیا ہے۔۔۔

ے ترے مکھ پر اے نازنیں یوں نقاب
جھلکتا ہے جوں مطلع آفتاب

ولؔی کے زمانے میں رسم ورواج کی سختیوں کے باعث عاشق ومعشوق کی ملاقاتوں میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی تھیں۔ ان حالات میں ہجر کی آگ میں جلنے کے سوا ار کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا اور عاشقوں کو سوائے ہجر کی صبر آزما اور تکلیف دہ باتوں کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں ملتا ہے۔ چونکہ ولؔی تو فطری طور پر عاشق ثابت ہوئے ہیں۔ اور حُسن وجمال کو ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حُسن اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلفریبیوں سے اس کی نظروں میں نہیں سما رہا ہے اور وہ بالکل آزادانہ طور پر اور کُھل کر اُس کا دیدار کرنے سے قاصر ہیں۔ حُسن پردے اور حجاب کی آڑ میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور چونکہ ولؔی تو حسن کے تشنہ ہیں اس لئے پردے میں حُسن کی جو جھلک اُنھیں نظر آتی ہے وہ ان کی تشنگی کو مزید بڑھاتی ہے اور اُن کی تڑپ کو مزید بھڑکاتی ہے۔ اس لئے وہ حسین شئے اُنھیں اپنی حقیقت سے زیادہ حسین نظر آتی ہے۔ اس لئے پردے میں اپنے حُسن کا جلوہ دکھانے والے ولؔی کے محبوب اپنے حُسن کے تیرِ نیم کش سے ولؔی کو مجروح کرتے ہیں اور وہ

تڑپتے ہیں، مچلتے ہیں اور ان کے حُسن کی تشنگی کو زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اسی لئے وہ اُسے کھل کر اپنا جلوہ دکھانے کی درخواست کرتے ہیں۔

ے بیتاب آفتاب ہے تجھ مکھ کے تاب کا
پیاسا ہے جہاں میں تیرے لب کے آب کا

ے تجھ مکھ کی آب وزلف کی موجاں کو دیکھنے
سب تن نین ہوا ہے سو جل پر حباب کا

ے یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

ے زخمی ہے جلاّدِ فلک تجھ غمزۂ خوں ریز کا
ہے شور دریا میں سدا تجھ زلف عنبر بیز کا

ولؔی نے جب اردو غزل گوئی کو پروان چڑھایا، اُس وقت اُن کے پیشِ نظر فارسی شاعری اور اس کا اسلوب تھا۔ چونکہ ولؔی کا زمانہ فارسی کے شعراء کا زمانہ تھا۔ اس لئے فارسی شاعری کے اثرات ولؔی کی شاعری میں بھی بخوبی پائے جاتے ہیں۔ یوں ولؔی کے کلام میں ہندوی گھلاوٹ اور رس بھی موجود ہے اور فارسی زبان کی لطافت اور شیرینی بھی۔ کیوں کہ اس وقت اردو شاعری کی دنیا محدود تھی اور زیادہ تر ذخیرۂ الفاظ فارسی زبان ہی سے مستعار لئے گئے تھے۔ اس لئے ولؔی کی غزلوں میں بھی گل وبلبل، رقیب وہم نشین، شمع وپروانہ، قفس وصیّاد کی ایسی بیشتر علامتیں جن سے محبت یا ہجر وِصال کی کیفیات بیان کی جاتی ہیں، ولؔی کے یہاں موجود ہیں۔ اس طرح ولؔی نے اپنے دور کے تمام ادبی فکری معیاروں اور روایات کو اپنی شاعری میں سمو کر بیان کی لذّت اور زبان کی تعمیر کا اعجاز دکھایا ہے۔

ولؔی نے اپنی شاعری میں بڑی ہی خوش سلیقگی کے ساتھ فارسی لفظوں کا استعمال کیا ہے اور اگر ولؔی نے اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی میں کبھی شوخی اور شرارت بھی دکھائی ہے، تو ان کی زبان سے ایسی باتیں نہیں نکلی ہیں، جن کو ''ابتذال'' اور ''پست خیالی'' کے الفاظ سے یاد کیا جائے۔ ولؔی کا کلام کہیں کہیں انتہائی شوخ رنگ میں بھرا ہوا ہے۔ اور یہ شوخی ولؔی کی اپنی ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہے جو کسی غیر معمولی حسین وجمیل حُسن کے پیکر کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ خود تو اس کے حُسن کی تاب نہ لا سکے اور غشی طاری ہوگئی۔ لیکن ولؔی کا خیال ہے کہ

اگر اس کے محبوب کا جلوہ اگر موسیٰ بھی دیکھیں تو وہ بھی محوِ حیرت ہوجائیں اور رضواں کو بھی جنت کی حوریں بے معنی معلوم ہونے لگیں، اور وؔلی کے محبوب کے حُسن کے آگے ان کا حُسن بھی ماند پڑ جائے۔ یہ وؔلی کی حُسن پرستی اور جمال پرستی کا مبیّن ثبوت ہے۔ وؔلی اپنے محبوب کے جمال میں اس قدر غرق ہیں کہ اس کے حُسن کے بیان میں غلو کی حد تک پہنچ گئے ہیں مثلاً اس طرح کے اشعار دیکھئے ۔۔۔

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ حور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

اے رشکِ باغِ جنّت تجھ پر نظر کئے سوں
رضواں کو ہووے دوزخ پھر حور کا تماشا

اس قبیل کے تشبیہی پیکر جو ذہن ودل پر یک لخت اثر کر جائیں۔ وؔلی کی شاعری میں جا بہ جا بکھرے اور نکھرے ہیں۔ لیکن وؔلی کی اس فکری تموّج کو، شوخیٔ جذبات کو بد اخلاقی اور ابتذال کے نام سے یاد کرنا ناانصافی ہے۔ خصوصاً جب کہ ہماری ادبی تاریخ کی کم مائیگی کے باعث ان بزرگوں کے ذاتی حالات ہم تک بہت کم پہنچے ہیں، اس کے علاوہ اخلاقیات اور ادب کے تعلق کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اس میں پڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ کیوں کہ شاعری جذبات اور احساسات کی ایک وسیع دنیا ہے اور اس کے تاثرات اس کے دل کی آواز ہے۔ لہٰذا شعراء کی غزلیں ان کے انھی جذبات اور احساسات کا آئینہ ہیں۔ اس لئے شاعر خیالات کی کن بلندیوں پر پہنچ کر بات کررہا ہے بعض مرتبہ ہماری فہم سے بالاتر ہوتا ہے۔ نیز جن حالات میں وہ شعر یا کلام تخلیق پایا ہے، ہم اُس حالات سے بھی آشنا نہیں ہوتے، یا جس شئے اور حالات سے مغلوب ہوکر شعر کہا گیا ہے وہ شاعر کا اپنا ذاتی مشاہدہ تھا اور اس مشاہدے کی شدّت کیا تھی اس کا اندازہ سوائے شاعر کے بھلا اور کسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے بعض کلام میں جہاں وؔلی نے اپنے محبوب کے حُسن وجمال کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا ہے، اُسے بالکل بھی پست خیالی محمول نہیں کیا جانا چاہیے، یا اخلاقی حدوں کو متجاوز کرنے کا الزام بھی عائد نہیں کیا جانا چاہیئے۔

وؔلی کی غزلوں میں کبھی عشق ومحبت کی باتیں ہیں، کبھی ہجر ووصال کے افسانے، کبھی اپنے محبوب کے شکوہ، تو کبھی اپنی بدقسمتی پر رونا ہے، تو کبھی اپنی حماقتوں پر ملامت ہے اور بعض اوقات محض ''ایک عنایت کی نظر'' پر انتہائی خوشی وشادمانی کے نغمے ہیں۔ جو بلاشبہ اُن کے دل کی پکار اور آواز ہیں جو ہمارے دلوں پر اثر

کرتی ہے۔ ولی کی غزل کی شاعری حُسن وعشق کی انہی رنگینیوں اور انہی کیفیات سے وابستہ ہے۔ جس نے حُسن کی دل آویزی کو مزید بڑھا کر پیش کیا ہے۔ جس میں بجا طور پر ایک خاص کشش ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجّہ کرتی ہے ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی لکھتی ہیں ---

"آج جو چیز ولی کی غزلوں میں ذہنوں کو زیادہ متوجّہ کرتی ہے اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اعتراف کرواتی ہے وہ ان کے اشعار کی نکھری ہوئی خارجیت ہے جس میں داخلیت کا بھی میل ہے اور انہی دونوں کے امتزاج سے ان کے یہاں وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے حِسّیاتی شاعری یا "Sensous Poetry" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ۱۰"

ولی کی غزلیں جو یقیناً حُسن کے نُور سے منوّر اور جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست محسوسات اور مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے۔ ولی نے بجاطور پر روشنی سے عشق کیا ہے اور یہ روشنی جو جو بذاتِ خود مسرّت اور شادمانی کی ضامن ہوتی ہے۔ اس لئے ولی کو بھی خوبصورت اور چمکتے ہوئے چہرے اور مناظر زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ان مناظر میں خوبصورت سبزہ اور باغات، کھلے ہوئے شگفتہ اور روشن پھول اور خوبصورت جاذب نظر روشن چہرے ولی کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ لیکن ولی چونکہ حسّاس طبیعت کا مالک ہیں اس لئے اس روشنی (چہرے) کو متحرک دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور حُسن تو خود ایک جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر ہے۔ اس لئے ان کی نظریں حُسن کے اس محرّک نور کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہ طرح طرح سے ان کا دل لبھاتی ہیں۔ اس لئے ولی حُسن کے اس نور کی متحرک اور گویا اداؤں کی عکّاسی کرتے ہیں اور اس کی کیفیتوں کی ترجمانی ولی کا خالص میدان ہے۔ جو ان کے احساس کو چھوتی ہے اور جو کبھی اپنے بصری اور کبھی سمعی تلازموں سے ایک جادو جگاتی ہے اور ولی اس جادو کے سحر میں گررفتار ہوکر بے خود ہو جاتے ہیں۔ اور اس وارفتگی کے عالم میں وہ اس نور کا جو تماشا دیکھتے ہیں، اس کو جوں کا توں بیان کرتے ہیں اور یہ بیان ان کے دل کی عمیق گہرئیوں سے آتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اسی عالم میں اپنے محبوب کے حُسن، اس کے نکھار کی شوخی اور شگفتگی کی بھرپور اور مکمّل تصویر کھینچتے ہیں۔ جس سے اُن کے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور زندگی کی رنگینیوں سے ان کی دلچسپی اور ظاہری چمک دمک سے ان کا والہانہ لگاؤ جو ان کی حسّیات کو بیدار کرتا ہے اس کا بھی خیال آتا ہے اور سب سے بڑھ کر ان کی حُسن پرستی کی واضح دلیل بھی ملتی ہے۔

ولؔی کی شاعری میں ان کے پیشِ نظر ظاہری آرائش اور زیبائش کو خاص عمل دخل ہے۔ اور ہر منوّر اور خوبصورت چیز ان کی زندگی کا مشغلہ ہے، جیسے خوبصورت کھلے ہوئے گلاب اور لالہ کے پھول، چاند کا نور اور اس کی دلکشی، آفتاب کی شعلہ افشانی اور عورتوں کا حُسن وجمال یہ تمام چیزیں اس عالم کی ہیں۔ اور صبح تا شام انسان ان کا معائنہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا تعلق براہِ راست بصیرت سے ہے۔ اور یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، اور فطرت کا لازمی جزو بھی ہے، کہ وہ فوراً لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور ناچاہ بھی نظریں اس چمک کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ ولؔی بھی چونکہ اسی دنیا کے ایک انسان اور شدید احساس وجذبات کے مالک ہیں۔ ان کی نظریں بھی ماحول کے اتار چڑھاؤ میں بکھرے ہوئے ان چمکتے اور منوّر اشیاء پر پڑتی ہیں اور وہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ذہن میں حُسن کی متحرک چمک نظر آتی ہے۔ حالانکہ چاند، ستاروں اور آفتاب کا نور بھی متحرک ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں ولؔی کو اپنی طرف اس قدر متوجہ نہیں کر پاتیں جس قدر ولؔی کو حُسنِ نسوانی متاثر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ ان منوّر اشیاء کو نظر انداز کر کے صرف نسوانی حُسن کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور وہ ان کا مواز نہ کرتے ہیں۔ کیوں کہ ولؔی کے پیشِ نظر حُسن کا وہ جلوۂ عام ہے جو ہر پیکر مجاز میں موجود ہیں۔ یوں تو ستاروں اور پھولوں کا حُسن بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جن کی بے شمار تعداد اور قسمیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ولؔی کو اس میں وہ کشش نظر نہیں آتی جو کشش اُنھیں اپنے محبوب کے حُسن وجمال میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے چہرے کی چمک کو پھولوں کی دلکشی اور ستاروں کی چمک سے زیادہ برتر گردانتے ہیں۔ اور اس کو فوقیت دیتے ہیں۔

چاند کا نور اور آفتاب کی شعلہ افشانی سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے؟ جو تمام دنیا کو اپنی روشنی سے منوّر کرتا ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ولؔی کو اپنے محبوب کے حُسن وجمال کی تمازت زیادہ نظر آتی ہے اور وہ بلا جھجک چاند اور سورج پر حُسن کو فوقیت دیتے ہیں۔ حوروں کے حُسن وجمال کے قصّے تمام عالم میں مشہور ہیں۔ اور جیسا کہ اُن کے متعلق مذکور ہے کہ اگر ان کے حُسن وجمال کی ایک جھلک بھی اس عالم میں بڑجائے تو تمام عالم روشن ہوجائے۔ ان کا حسن ایسا ہے کہ رگوں میں خون دوڑتا ہوا نظر آئے اور اگر وہ پانی پیئے تو پانی ان کے گلے سے اترتا ہوا دکھائی دے۔ غرض یہ کہ دینی علماء نے حوروں کے حُسن وصفات میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ولؔی کو اُس حور کا حُسن وجمال، جس کے قصّے تمام عالم میں مشہور ہیں، کوئی پُر اثر بات نظر نہیں آتی اور اُنھیں حوروں کی صفاتِ حُسن سے زیادہ اپنے محبوب کے حُسن وجمال میں زیادہ صفات اور

کشش نظر آتی ہے۔ کہ بقول ولی اس کی ایک جھلک سے آفتاب شرمندہ اور ماہتاب بیتاب ہوجاتا ہے اور حوریں بھی حسد سے جل کر کالی ہوجاتی ہیں اور پھولوں کے شہنشاہ لالہ اور گلاب بھی ان کے محبوب کے حُسن وجمال پر رشک کرتے ہیں۔ مندجۂ ذیل اشعار دیکھئے۔

ے لگتا ہے مجھ کوں پنجۂ خورشید رعشہ دار
دیکھا ہے جب سوں پنجۂ زرّیں نگار آج

ے رشک سوں تجھ لباں کی سُرخی پر
جگر لالہ داغ داغ ہوا

ے گُل ہوئے غرق آبِ شبنم میں
دیکھ اس صاحبِ ادا کی ادا

ے ترے عکس پڑنے سوں اے گلبدن
عجب نئیں اگر آب ہوئے گلاب

ے پڑیا ہے لعل میں پرتو صنم تجھ لب کی لالی کا
بیاں ہے ہرسوں روشن تر تری صاحب کمالی کا

ے اطرافِ آسمان کے ہجوم شفق نہیں
تجھ رنگ نے ہوا کوں کیا لالہ زار آج

غرض یہ کہ ولی پر چمکنے اور دمکنے والی اشیاء پر اپنے یار کے جمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ گویا ولی اپنے محبوب کے حُسن کی صفات میں جن تاویلات کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن سے پہلے دکن اور شمالی ہند کے تمام شعراء کے یہاں اس قسم کا تصوّر اور خیال کی بلند پروازی مفقود نظر آتی ہے اور نہ ہی ان کے بعد کے کسی شعراء کے یہاں یہ چیز دیکھنے کو ملتی ہے۔ ولی نے اپنے محبوب کے چہرے کو دنیا کی خوبصورت سے خوبصورت شئے سے زیادہ حسین بتایا ہے۔ اور رخسار آنکھ، لب، تل وخال، زلفیں اور اس کا قد غرض سراپائے جسم کی تعریف وتوصیف اتنے عمدہ اور دلکش پیرائے میں کی ہے کہ ولی کو اردو شاعروں میں سب سے بڑا سراپا نگار کہہ دینے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ حُسن کے بیان میں ولی کے یہاں اُبال تو ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن اس کی آفاقیت برقرار رہتی ہے، کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی ایسے حسین کا پرستار معلوم ہوتا ہے جو ان کے ذہن کے

دریچوں میں مقیّد ہے۔ اور وہ اپنے ذہنی تصوّر کے اعتبار سے اس زمین پر بسنے والے حسین لوگوں میں وہ خوبیاں تلاش کرتے ہیں۔ اور ان کے مطلوبہ محبوب کی صفات مختلف حُسن کے پیکر لوگوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور وہ مطلوبہ مجموعہ صفات کا مالک جس کے وؔلی دیوانہ ہیں۔ اور جس کے حُسن کا خبط وؔلی کے ذہن پر سوار ہے۔ ایسے حُسن کی مجموعی خوبیاں رکھنے والے محبوب کی تلاش اور جستجو وؔلی کا مدّعا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اپنے مطلوبہ حُسن کے پیکر کے لئے ان کی تلاش کی شدت اتنی شدید ہے، کہ وہ کسی ایک محبوب کے لطفِ حُسن سے تسکین نہیں پاسکتے۔ اور اپنے مطلوبہ محبوب کی وہ تصویر جو ان کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی ہے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ جو شاید اس زمین پر گامزن ہی نہیں ہوتا اور جو ہے تو ضرور لیکن کبھی منظرِ عام پر آ کر اپنی جھلک نہیں دکھلاتا۔ وؔلی نے اپنے متمنی محبوب میں جن صفات کا تصوّر قائم رکّھا ہے اس کا اظہار مندرجہَ ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

؎ رخسارِ دل رُبا کا صفا کیا بیان کروں
مخمل نے اس صفا کوں نہ دیکھا ہے خواب میں

؎ چلنے میں اے چنچل ہاتھی کوں لجاوے تو
بے تاب کرے جگ کوں جب سامنے آوے توں

؎ کوئی فلک مکھ میں انگشت تحیّر لے
جب پاؤں نزاکت سے مجلس میں نچاوے تو

؎ تیری طرف انکھیاں کوں کہاں تاب کہ دیکھیں
سورج سوں زیادہ ترے جامے کی بھڑک ہے

وؔلی کی غزلوں میں حُسن کے بیان میں جو تنوع پایا جاتا ہے اور حُسن کے جس تصوّر کا وہ بیان کرتے ہیں، وہ محض تصوّری اور مثالی محبوب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت غزل کے طریقۂ کار سے مماثلت رکھتی ہے۔ یوں وؔلی نے حُسن کی ستائش میں ایک عجب سماں پیدا کیا ہے۔ گویا وؔلی نے اپنے پیکرِ خیال اور نقشِ تصوّر کو انتہائی طور پر محسوس بنا کر ہمارے سامنے جلوہ گر کردیا ہے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ۔۔۔

"وؔلی کی غزل اس لحاظ سے غزل کی فضاء سے قریب تر ہے کہ اس میں وؔلی نے

بُت پرستی کے عمل میں مبتلا ہونے کے باوجود کسی ''خاص بُت'' کی پوجا نہیں کی
دوسرے لفظوں میں وؔلی نے بُت پرستی کے مرحلے تک خود کو محدود تو رکھا ہے تاہم
اس کے ہاں بُت پرستی کا عمل کسی ایک بُت تک محدود نہیں رہا۔[۱۱]

ایک بات تو یقینی ہے کہ وؔلی کی شاعری میں حُسن ہی حُسن کا تذکرہ ہے، محبوب کی اداؤں کی عکاسی ہے، اس کے خدّ و خال کی دلکشی ہے، ان کے محبوب کی جامہ زیبی کی بھرپور تصویریں ہیں۔ اور بار بار اپنے محبوب سے اپنا جلوہ دکھانے کی فرمائشیں ہیں۔ ساتھ ہی دیگر خوبصورت اور منوّر چیزوں سے اپنے محبوب کے حُسن کا موازنہ ہے۔ یوں یہ تمام چیزیں بار بار ہوتی ہیں۔ بلکہ ہر غزل اور ہر شعر میں انہی مضامین کی تکرار ہوتی ہے، بحث ہوتی ہے۔ لیکن وؔلی کی عظمت اور بلندی کا رازَ اس میں مضمر ہے کہ ان کا قاری حُسن کی اس تکرار سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ مزید چٹخارے لے کر پڑھتا ہے۔ وؔلی کے بیان میں باتیں تو وہی حُسن وعشق کی ہوتی ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ اس کا پیرایۂ بیان مختلف ہوتا ہے اور ہمیں تکرار کے باوجود بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک طرح کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ کیوں کہ وؔلی اس مضمون کو دوبارہ ایسے معنی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اس شعر اور بیان کی خصوصیت برقرار رہتی ہے، نیز انداز بھی مختلف ہوجاتا ہے اور یہی وؔلی کے فن کا کرشمہ ہے۔

وؔلی کی غزلوں میں ستائشِ حُسن کی یلغار نظر آتی ہے۔ جو بجا طور پر اُن کی قلبی واردات کا حصّہ ہیں۔ لیکن جو امر تعجّب خیز ہے وہ یہ کہ وؔلی اپنی دل کی رنگینیوں کو زبان سے ادا کرتے ہیں اور اپنے ذوق نظر کی لطافتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے اپنے پاکیزہ شعروں کی صورت میں خوبصورت سانچہ بناتے ہیں۔ اور حُسن کی نقشِ اوّل تاثیروں کو بلا مبالغہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن حُسن سے اس قدر مرعوبیت کے باوجود اس کی غزلوں سے بے اعتدالی اور سطحیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ محض جمال پسند اور پاک نظر آدمی کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ وہ حُسن کے بیان میں ایسی پُر لذّت اور نشاطیہ کیفیت پیدا کرتے ہیں جو بیان سے باہر ہے۔ ان کے جذبات سمندر کی موجوں کی طرح ساحل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں الفاظ کی شیرینی ایسی ہوتی ہے جیسے بہتے ہوئے پانی میں ہلکا ہلکا ترنّم ہو، جو ہماری سماعت سے ٹکرا کر ہمیں مسرور کردیتا ہے۔ اس طرح بعض اوقات پوری غزل کتابِ حُسن کی فہرست معلوم ہوتی ہے۔ وؔلی کی لطافتِ ادا دیکھئے کہ کس طرح حُسن کا شیریں نغمہ اپنے محبوب کی تعریف میں گاتے ہیں۔

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے　　ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر　　مجھے تب نرگستاں یاد آوے

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے　　مجھے لیل زمستاں یاد آوے

ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے　　بہارِ سنبلستاں یاد آوے

ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے سوں　　مجھے فردوس رضواں یاد آوے

تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے　　اُسے شمع شبستاں یاد آوے

جو کُئی دیکھے مرے انکھیاں کو روتے　　اُسے ابر بہاراں یاد آوے

جو میرے حال کی گردش کوں دیکھے　　اُسے گرداب گرداں یاد آوے

ولی میرا جنوں جو کُئی کہ دیکھے
اُسے کوہ وبیاباں یاد آوے

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا کہ ولی کے یہاں حُسن کی تکرار ہے۔ لیکن یہ تکرار ولی کی شاعری میں الگ الگ دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس سے ولی کا انفرادی رنگ ظاہر ہوتا ہے اور ان کا یہ انفرادی ان کے پیرائے بیان کے متعلق ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے ولی نے اگر، مگر، جوں، اے، سوں، یوں، ایسا، یوں وغیرہ جیسے لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی ''اگر ایسا ہوگا تو یوں ہوویگا'' اگر ایسا نہ ہوا تو ایسا ہوگا'' اور اگر یوں ہوگا تو یوں ہوویگا'' وغیرہ لفظوں سے بڑا ہی حُسن پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اس حُسن کے ساتھ اس کے ذریعے اپنے کلام میں بڑی ہی غنائیت پیدا کی ہے۔ ان مذکورہ الفاظ کے استعمال سے ولی نے اپنے محبوب سے خطابیہ انداز اختیار کیا ہے، اور کبھی یہ خطابیہ انداز ندائیہ ہو جاتا ہے اور کبھی سوالیہ بھی۔

ولی نے اِن مذکورہ لفظوں کے استعمال سے اپنی ایک انفرادی شان قائم کی ہے۔ جو ولی ہی کی ذات کا حصہ ہیں۔ ولی ان مذکورہ لفظوں کے استعمال کے ساتھ اپنے محبوب سے ہمیشہ دست بستہ التجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی دلی خواہش ہے کہ ان کا محبوب کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو، اس لئے وہ اپنے محبوب کو ہردم اپنی نظروں کے سامنے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ہمیشہ دربار، حُسن پر اپنی مرادیں مانگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور دیوانہ وار اس کو مخاطب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دیوانگی میں خطابیہ انداز کے ساتھ محبوب کے جمال کا تذکرہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ---

ے مت دور ہو ہر اک آن ولی کے پاس سے ہرگز
اے باعثِ جمیعت ایامِ جوانی

ے تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشان سوں کہونگا
جادو ہیں ترے نین غزالہ سوں کہونگا

ے نہ کر سکوں ترے یک تارِ زلف کی تعریف
کروں ہزار کتب تجھ ثنا میں گر تصنیف

ے شرمندہ ہو تجھ مکھ کے دکھے بعد سکندر
بالفرض بناوے اگر آئینہ قمر سوں

غرض یہ کہ ولی کی غزلوں میں اسی طرح کے اشعار جابجا نظر آتے ہیں۔ گویا اس کی غزلیں حُسن کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ولی کی غزلوں میں حُسن کو اس قدر مبالغہ اور بہتات کے ساتھ بیان کرنے کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولی کی غزل کا معتدبہ حصّہ ارضی حُسن کے بیان پر مشتمل ہے اور ولی کو بجا طور پر ایک جمال پرست شاعر کا لقب دیا جاسکتا ہے کیوں کہ ولی نے اپنی قوّتِ باصِرہ کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے اور کسی حسین شئے یا پیکر کو سُننے یا چھونے کے بجائے ''دیکھنے'' کی کوشش زیادہ کی ہے۔[۱۲]

جیسا کہ داکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ ولی نے حُسن کو ''دیکھنے'' کی کوشش زیادہ کی ہے اور اپنے محبوب کو چھونے کی جنسی آلودگی سے خود کو محفوظ رکھا ہے۔ یہ ولی کی شریف النفسی اور تعلیم وتربیت کا اثر تھا، جہاں انھوں نے دینی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ہمیں ولی کے کلام میں عریانیت یا جنسی تلذذ کے اشعار نہیں ملتے اور نہ ہی کہیں ان کے قدموں کی کوئی ایسی لغزش دکھائی دیتی ہے کہ جس پر فحاشی کا الزام عائد کیا جاسکے۔ اس لئے ولی کی شاعری بھلے بنیادی طور پر جمال پرستی پر مبنی ہو، لیکن اس قسم کی گندگی سے پاک ہے۔ ولی نے اپنے محبوب کو خوب دیکھا ہے اور اوروں سے زیادہ دیکھا ہے۔ لیکن کبھی اُسے ہم آغوش کرنے کی تمنا نہیں کی۔ ویسے تو ولی کی شاعری جمالیات کا ایک حصّہ ہے، لیکن اس کے باوجود اُن کی شاعری میں ذہنی جنسی غلاظت کا کوئی

عکس نہیں ابھرتا۔ کیوں کہ وؔلی نے شعوری طور پر اپنے محبوب سے دوری بنائے رکھی ہے اور کبھی اس کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی، صرف دیکھنے تک ہی اکتفا کرلیا۔

اگر ہم وؔلی کے اس رجحان کی تہہ میں جانا چاہیں تو ہمیں فوراً خیال آتا ہے کہ وؔلی اپنی زندگی میں سیاح واقع ہوئے تھے۔ اگر ہم اُن کی زندگی کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے شہروں کا سفر کیا تھا اور مختلف سیر گاہوں تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جہاں گرد واقع ہوئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی اپنی طبیعت کا خاصہ کہی جاسکتی ہے کہ انھیں کسی ایک جگہ قرار میسّر نہیں تھا اور دوسری وجہ غالباً ذریعہ معاش کی تلاش تھی (جس کا تفصیلی ذکر ''باب پنجم'' میں کیا گیا ہے) اور تیسری وجہ بھی لائق یقین تصوّر کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ وؔلی کے زمانے میں عالمگیر کی فتوحات نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی دکنی سلطنتوں کو نیست ونابود کردیا تھا۔ جس کے سبب وہاں کا امن وسکون رخصت ہوچکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی سیاسی افراتفری اور انتشار نے انھیں ''بگولاصفت'' بنائے رکھا ہو۔ اس لئے یہ بات قابلِ یقین تصوّر کی جاسکتی ہے کہ وؔلی امن وامان کی تلاش میں کبھی احمد آباد، کبھی برہانپور، کبھی شاہجہاں آباد یعنی دہلی کی گلیوں اور خانقاہوں میں پناہ اختیار کی ہو۔ کیوں کہ ایک اعتبار سے دکن کی سرزمین اپنی سیاسی مصلحتوں کے سبب پُر امن نہیں رہ گئی تھی۔ لہٰذا دکن میں ذوقِ نغمہ کے شائق بہت کم تھے۔ خیر وجہ کچھ بھی رہی ہو وؔلی کی سیّاحی اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ انھیں کسی ایک جگہ قرار نہیں تھا اور چونکہ وہ بنیادی طور پر عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ اس بنا پر غالباً انھوں نے جو سیر وتفریح کی اور جہاں جہاں ان کا گزر ہوا وہاں وہاں انھوں نے مختلف مقامات کے حُسن کا بغور جائزہ لیا ہوگا۔ بلکہ جائزہ ہی نہیں ان کا بڑا گہرا مشاہدہ بھی کیا ہوگا اور اس صنفِ نازک کی خوبصورت اداؤں اور حُسن وجمال سے خوب محظوظ بھی ہوئے ہوں گے۔ اس لئے ان کی شاعری میں حُسن کی بہتات اور کثرت اسی سیّاحی کے تجربوں کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ حُسن کا مشائدہ ان کا مشغلۂ زندگی بن گیا تھا اور حُسن کا نظارہ ان کی روح کی پیاس تھی۔

اس لئے وؔلی کی غزلوں میں حُسن کی، عشق کی، عاشق کی، ہجر کی، وصال کی گونج سنائی دیتی ہے۔ گویا ہمیں ان کی شاعری میں عشقیہ مضامین کا ایک شور اور ایک طوفان اُڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس طوفان کے پس منظر میں وہ خاموشی پوشیدہ ہے اور انتظار کی وہ صبر آزما گھڑیاں ہیں جس کی آزاری نے وؔلی کو بے چین کر رکھا تھا۔ لیکنا خلاق کی بیڑیاں ان کے قدموں میں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایسی امنگیں اپنے شباب پر

ہوتی ہیں۔ کیوں کہ وؔلی اپنے تحصیل علم میں مصروف وہاں کے دینی ماحول میں ان تمناؤں کو دبائے خاموشی سے دن گزارتے رہے ہیں۔ لہٰذا جس سے گزر کر وؔلی اس مقام تک آئے ہیں، وہ مختلف مقامات اور شہروں میں اُسی حُسن کی تلاش وجستجو کرتے رہے ہیں۔ وؔلی نے اپنے مطلوبہ محبوب کی تلاش میں ہر حُسن کو بڑے ہی غور سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وؔلی کے حُسن کے بیان میں اتنی گہرائی پائی جاتی ہے۔ وؔلی نے مختلف النوع طریقوں سے اس حُسن کی شوخیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن حُسن کے اس قدر پرستار اور قریب سے دیکھنے کے باوجود حُسن کے بیان میں ان کی دلچسپی انبساط اور نشاط کی حدوں سے متجاوز ہرکر لذّت اور تعیش کی شکل اختیار نہیں کرتی اور اس کی نوعیت بہرصورت صحت مندانہ رہتی ہے۔

یوں وؔلی نے اپنے زندگی کے تجربات کو پیش کرنے میں غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اپنے داخلی جذبات واحساسات اور وارداتِ قلبی کو بیان کر کے ایک طرح کا روحانی سکون حاصل کیا ہے۔ وؔلی نے اپنے تجربات کو شعر کا پیرہن عطا کیا ہے اور حُسن وجمال کے بیان میں اتنی شدّت پیدا کی ہے کہ ہمیں بعض مرتبہ ان کے صحتِ دماغ پر شک گزرنے لگتا ہے کہ آیا وؔلی حُسن کے جلوؤں سے بے خود تو ضرور ہے لیکن کہیں خبطی تو نہیں ہوگئے؟ کہ نظارے حُسن کی تاب نہ لاکر اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکے ہوں۔ لیکن بہت جلد ہمیں یہ انکشاف ہوجاتا ہے کہ وؔلی حُسن کی شراب سے مسرور اور نشے میں چور تو ضرور ہیں، لیکن ابھی اُن کے حواس باختہ نہیں ہوئے۔ کیوں کہ انھوں نے حُسنِ محبوب کی مشابہتوں کو بار بار ابھارا ہے اور بار بار تکرار کی ہے۔ لیکن ان کے پیرایۂ بیان میں بڑی انفرادیت پائی جاتی ہے اور اس پیرایۂ بیان میں انفرادیت کے ساتھ ندرت اور انوکھو پن بھی قائم رہتا ہے۔ وؔلی نے اپنے محبوب کے ہونٹوں کی بہت تعریف کی ہے اور مختلف تشبیہات سے اس کی خوبصورتی کو واضح کیا ہے۔ جیسا کہ وؔلی نے اپنے محبوب کے ہونٹوں کے متعلق ایک شعر میں کہا ہے کہ۔۔۔

ع تجھ لب کی صِفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا

وؔلی کے دیگر اشعار ہونٹوں کے متعلق دیکھیے جہاں ان کی انفرادیت، ندرت اور انوکھا پن اپنا جلوہ دکھارہا ہے مندرجۂ ذیل اشعار دیکھیے۔

؎ تجھ لب کی اگر یاد میں تصنیف کروں شعر
ہر شعر میں لذّتِ شہد وشکر آوے

؎ دیکھ اے اہلِ نظر سبزۂ خط میں لبِ لعل
رنگِ یاقوت چھپا ہے خطِ ایحان میں آ

؎ اُس پھول سے چہرے کو جو کوی یاد کرے گا
ہر آن میں سَو سَو چمن آباد کرے گا

ولؔی کی غزلوں میں حُسن کے متعلق ان کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ اگر اُنھیں سراپائے محبوب کے بیان میں سب سے بڑا قصیدہ خواں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ارے جناب! سرتا پیر محبوب کے جسم کا کون سا عضو ایسا ہے جو ولؔی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا؟ یوں اپنے محبوب کے جسمانی اعضاء کی ایک ایک صفت ولؔی مختلف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ولؔی سے قبل کے دکنی غزل گویوں نے اپنے محبوبوں کے سراپے کو ضرور بیان کیا ہے لیکن ان کے بیان پر دکنیت کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ بعض دلکش اشعار بھی زبان کی وجہ سے بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان میں لذّیت کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے مہذب طبقہ اُسے فحش کلامی سے تعبیر کرتا ہے اور ایسی شاعری سے احتراز کرتا ہے۔ ولؔی کے زمانے میں بھی یہ بدعت قائم تھی۔ لیکن ولؔی نے اپنے انوکھے نرالے اندازِ بیان سے ایسی لذّت پیدا کی کہ محبوب کا وقار تو بلند ہوا ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اردو غزل کو قابلِ قدر صنف کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اُس زمانے میں غزل چونکہ نسوانی حُسن کی دل آویزی، جنس لطیف کی مدح سرائی اور حُسن وعشق کے معاملات کے بیان کے لئے مخصوص تھی۔ اس لئے ولؔی نے بھی غزل کے اسی رنگ کو قائم رکھتے ہوئے حُسن کی ستائش اور جمال کی توصیف کا ترانہ اتنے رنگین اور دل نشین انداز میں گایا کہ اُسے سن کر سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور لوگ دیوانہ وار ان کے اشعار گنگنانے لگے۔ اور ولؔی کے حُسن کے نغموں پر آفرین آفرین پکار اٹھے، جس سے ولؔی کی وسعتِ نظر کی گہرائی کا شدّت سے احساس ہوتا ہے۔ چونکہ ولؔی کا مشاہدۂ نظر بہت وسیع اور قوی تھا اس نقطۂ نظر سے ولؔی جب اپنے کسی محبوب کے جمال کا جائزہ لیتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی نظریں محبوب کے جسم کے اُس عضو کے ہم پلّہ یا اس جیسی صفات رکھنے والے اجزاء سے اس کا موازنہ کرتے ہیں۔

ولؔی کی شاعری میں موازنہ کا عنصر بھی خوب غالب ہے۔ وہ اپنے محبوب کے جسمانی اعضاء کے موازنہ میں جس شئے سے اس کا تقابلی مقابلہ کرتے ہیں وہ تمام کی تمام چیزیں ولؔی کے محبوب کے حُسن وجمال یا اس کے مخصوص جسمانی اعضاء کی صفات یا خصوصیات کے سامنے ہیچ وپوچ ہیں اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور

گویا اس شے کی تمام کی تمام خوبیاں وؔلی کے محبوب کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ یوں وؔلی ہمیشہ اپنے محبوب کے حُسن و جمال یا اس کے جسمانی اعضاء کو برتر بتاتے ہیں اور اُسے فوقیت دیتے ہیں۔ وؔلی کے موازنہ کا یہ طریقہ ان کی اپنی انفرادیت کا عمدہ نمونہ ہے۔ جہاں وہ کبھی اپنے محبوب سے اس کے حُسن کی صفات بیان کرتے ہیں تو کبھی اس شئے سے مخاطب ہو کر جس سے موازنہ کیا جارہا ہے۔ گویا اگر محبوب ان کے تصوّر میں ہے تو وہ پہلے محبوب کو مخاطب کرتے ہیں اور اگر محبوب کے جسمانی اعضاء جیسی صفات رکھنے والی کوئی دوسری شئے ان کی نظر کے سامنے ہے تو وہ اُس شئے سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ یہ شے بعض مرتبہ حقیقی طور پر ان کی نظروں کے سامنے معلوم ہوتی ہے اور بعض مرتبہ ان کے تصوّر کا محض ایک حصّہ نظر آتی ہے۔ اس خیال کے دو اشعار دیکھیے۔

ـ ہوا یاقوت رنگیں دیکھ تیرے لعل رنگیں کوں
ہوا سرسبز جو تجھ خط میں دیکھا رنگ ریحانی

ـ کیا ہوسکے جہاں میں تیرا ہمسر آفتاب
تجھ حُسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

اسی طرح وؔلی نے اپنے محبوب کے حُسن سے مشابہت کا پہلو بھی خوب نکالا ہے۔ جگہ جگہ وہ اپنے محبوب کی مختلف اداؤں، اور جسمانی اعضاء سے دیگر چیزوں کی مشابہت کرتے ہیں اور کبھی وارننگ بھی دیتے ہیں کہ میرے محبوب کا جمال تیرے تابِ نظارہ نہیں۔ غرض یہ کہ وؔلی نے کبھی موازنہ، کبھی مشابہت اور کبھی چیلنج کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار انہی خیالات کی ترجمانی میں ملاحظہ ہوں۔

ـ تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے
تیری نگاہِ گرم سوں گُل گل پگھل گئے

ـ یک نقطہ ترے صفحۂ رُخ پر نہیں بے جا
اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآن سوں کہوں گا

ـ تو سر سے قدم تلک جھلک میں
گویا ہے قصیدہ انورؔی کا

وؔلی اپنی غزلوں میں محبوب کو سیدھے مخاطب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے اشعار کا بیان ایسا ہوتا

ہے جیسے محبوب ان کی نظروں کے سامنے جلوہ گر ہے اور وہ اس سے بالواسطہ ہم کلام ہیں۔ اپنی اس ہم کلامی کے لئے ولیؔ ''تجھ مکھ''، ''تجھ سجن''، ''تجھ حُسن''، ''تجھ زلف''، ''تجھ ناز''، ''تجھ خال''، تجھ جبیں''، ''تجھ نین'' اور اسی طرح کے جملے بار بار دہراتے ہیں۔ جس میں لفظ ''تجھ'' سابقہ کے طور پر استعمال کر کے لاحقہ میں اپنے محبوب کے کسی جسمانی اعضاء کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنی اس ہم کلامی میں وہ اپنے ساجن کی سرتاپیر تصویر کشی کر کے ایک ایک عضو کی خوبصورتی کو نمایا کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان میں ان کی تخیل کی پرواز اپنی انتہا کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ولیؔ کی شاعری میں محبوب کے حُسن و جمال کی منظر کشی میں جو عوامل کارفرما ہیں اس کی وجہ غالباً دکن میں مثنوی نگاری کے اثرات ہیں۔ کیوں کہ منظر نگاری یا سراپائے حُسن کے لئے مثنویوں میں بڑی وسعت تھی۔ کیوں کہ مناظر قدرت یا سراپائے حُسن کا جائزہ ایک یا دو اشعار میں نہیں لیا جاسکتا اور اس کے بیان کے لئے مزید اشعار درکار ہوتے ہیں۔ جن میں ایک طرح کا ربط اور تسلسل قائم ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت سوائے مثنوی کے اور کسی صنف شاعری میں موجود نہیں تھی۔ چونکہ مثنوی پوری دکنی ادبیات میں شاہ صنف کا درجہ رکھتی تھی اس لئے اس صنف کے اثرات سے متاثر ہونا ایک لازمی جزو ہے۔ ولیؔ کے کلام بعض ایسی مسلسل غزلیں ملتی ہیں جن میں ولیؔ نے اپنے محبوب کی تمام تر رعنائیوں کی قصیدہ خوانی کی ہے۔ دراصل اس طرح کی یہ سلسلہ غزلیں اسی مثنوی نگاری کے اثرات سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ولیؔ کی شاعری میں بھی مثنوی نگاری کی خارجیت اور ساتھ ہی ہندی گیتوں کے جزئیات کے اثرات کا پَرتَو ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ ---

> ''ولیؔ نے گیت کی روایت کے تحت زیادہ تر محبوب کے جسمانی حُسن ہی کے گُن گائے ہیں۔ لیکن اسے اپنے عشق کی جولانیوں کے لئے ایک وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ مگر ان دو باتوں کے ساتھ ہمیں ولیؔ کے یہاں دو ایسے رجحانات بھی ملتے ہیں جن کے تحت اس نے گیت کی فضاء سے باہر نکل کر غزل کے مزاج سے قریب تر ہونے کی کوشش کی ہے۔ یہ دو رجحانات ہیں تشبیہ اور استعارے کا استعمال اور باصرہ کا تحرک۔[۱۳]

ولیؔ اپنے کلام میں تشبیہہ اور استعارے کے استعمال کے ساتھ اپنے ساجن کی ثناء خوانی میں ہمہ وقت مشغول نظر آتے ہیں۔ جہاں ان کے بیان میں کبھی کبھی نسوانی لب ولہجہ غالب نظر آتا ہے جو ہندی گیتوں کے

اثرات کا نتیجہ ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی کج اداؤں سے بسمل ہیں اور اپنے دل کی بیتابیوں کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ جو کہ اردو غزل کا روایتی حصہ ہیں۔ ولی محبوب کو اپنی زندگی کا چشم وچراغ اور کل کائنات مانتے ہیں اور ایک لطیف انداز میں وہ ہر وقت یہ صدا لگاتے نظر آتے ہیں، کہ اے محبوب! تم کسی حالت میں بھی اپنی تجلّیات سے محروم نہ کرو اور اپنے حُسن کی ضیاء پاشیوں سے ہمہ وقت میری زندگی کو منوّر کئے رہو، کیوں کہ تمہارے نور کے بغیر میری زندگی تاریک ہوجائے گی۔ ان خیالات اور احساسات کو ولی نے جس سادگی اور صفائی اور تراش وخراش سے استعمال کئے ہیں اس سے زبان میں نکھار اور وسعت پیدا ہوگئی ہے ولی کہتے ہیں کہ۔۔۔

اُس وقت مرے جیو کا مقصود بر آوے
جس وقت مرے بر منیں وہ سیم بر آوے

رگِ جاں سے ہوا ہے خون جاری
یاد تیری پلک کا نشتر ہے

ولی کی شاعری میں ایک جیتی جاگتی ہندوستانی عورت اپنے نسائی بانکپن کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس پس منظر میں ولی کا سب سے بڑا کارنامہ اور امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے دل کھول کر حُسن کو داد دی ہے، اور چونکہ ان کی شاعری کا بنیادی محور ہی عشق ہے لیکن اس کے باوجود ان کی غزلوں میں بوالہوسی نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے غزل کو جدید زبان اور پیرایۂ اظہار سے آشنا کر کے اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور غزل کو خارجیت اور نسوانیت کی بے لطفی سے نکال کر اس میں اعلیٰ ترین احساس وجذبات اور وارداتِ قلبیہ داخل کیے۔ ولی نے اپنے زورِ تخیّل کو اگرچہ تشریحِ حُسن اور نظارۂ حسن سے پیدا ہونے والے کیف واثر دونوں میں برتا ہے، اور جمالِ یار کے جزئیات واہم پہلوؤں کو اُبھارنے اور واضح کرنے میں اپنی صلاحیتوں سے کچھ زیادہ ہی کام لیا ہے۔ جس سے ان کی از حد حسّاس طبیعت اور قوت متخیّلہ اور مشاہدوں کے کرشموں پر روشنی پڑتی ہے۔ ولی کے یہاں عورت کے سراپے کے بیان میں اس درجہ کثرت ہے اور اس میں ولی کا انتہائی شغف اور دلچسپی ہونے کے باوجود ان کے بیان میں ذہنی تعیّش اور تلذّذ کا تصوّر اور خیال تک نہیں ابھرتا۔ ان کے یہاں نسوانیت کے بیان میں احساسِ نشاط ہے، لیکن ابتذالیت کا نام ونشان نہیں ملتا۔ وہ حُسن کا قصیدہ اتنے سرور سے گنگناتے ہیں اور اتنا بے نیاز ہوکر اس کی ثناء خوانی کرتے ہیں کہ اس میں شائستگی اور علویت نمایا ہوجاتی ہے۔

اور جو تاثرات ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ وانداز سے ظاہر کرتے ہیں کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔

ولی کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں دکن کی مقامیت اور ارضیت کو باقی رکھتے ہوئے فارسی روایاتِ سخنوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری میں دونوں روایتوں کے اختلاط وامتزاج سے کچھ ایسی خوبی پیدا ہوگئی ہے جو سولھویں اور سترہویں صدی میں کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ولی نے فارسی غزل سے وابستگی تو ضرور رکھی اور تقلید کے عمل میں مبتلا ہو کر بھی اپنی جدّت قائم کر رکھی۔ انھوں نے فارسی شاعری کے تمام اصولوں سے کام ہی نہیں لیا بلکہ فارسی زبان کو موضوعات، فارسی شاعری کے مخصوص الفاظ، محاورات اور ترکیبوں کی ایسی خوبصورت پیوند کاری کی جو خصوصیت رکھتی ہے۔ ولی نے دونوں تہذیبوں کے ملاپ سے ایک نئی شعری روایت قائم کی، جو ولی سے قبل اردو شاعری میں ناپید تھی۔ ولی نے فارسی موضوعات، افکار وخیالات اور تشبیہات اور استعارات کو نہایت ہی ہنرمندی کے ساتھ اردو میں برتا ہے۔ جس کے سبب اردو کی شعری روایت میں ایک زرخیزی پیدا ہوگئی اور باوجود اوّل ہونے کی ان کی شاعری میں قدامت پسندی کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ولی نے فارسی شاعری کے کیف اور اسلوب کو پہلی بار اس طرح اختیار کیا کہ عصری جذبات کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کی تابناکی، لطافت اور تعیم اردو شاعری میں آگئی۔ یوں تو ولی کا عام انداز فارسی غزل گو شعراء کی طرز پر ہے اور اسی لئے افکار واسلوب کے اعتبار سے ولی اردو شاعری کا لب ولہجہ بدلنے میں کامیاب ہوئے۔

ولی کی شاعری میں حُسن سے اُن کا از حد لگاؤ نظر آتا ہے، اور وہ بھی اس درجہ کہ عشق کے بجائے حُسن اور اس کی تجلّیات ہی ولی کی شاعری کا بنیادی موضوع بن گئی ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری میں سماجی اور مقامی زندگی کی تصویر کشی کا رجحان غالب ہے۔ عشق بھی گویا ان کے یہاں تہذیب نفس کا ذریعہ ہے یا سماجی ہم آہنگی کا وسیلہ، کیوں کہ اس کے ذریعے انسان اجتماعی زندگی میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ ولی اپنی شاعری میں ایک ایسی پُر لطف طرب آفریں مجلسی زندگی کی داغ بیل ڈال دیتے ہیں جو زندگی کو رنگ رلیوں اور لذّت کشی کے ہم معنی بنادیتی ہے۔

ولی پہلی بار اردو شاعری کے سامنے ایک دوسرا پہلو پیش کرتے ہیں اور وہ ہے انسان کی باطنی ہم آہنگی کا مسئلہ، ولی کی شاعری کی بنیادی آویزش رند اور لذّت کوش کی آویزش ہے اور وہ فارسی شاعری کے ان تصوّرات

کو اپناتے ہیں جو حافظ، خیام اور عراقی کی شاعری میں ڈھل کر ہم تک پہنچے تھے۔ یہ فارسی شاعری کے اثرات اور اس کی تقلید کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ولی نے فارسی شاعری کی بہت سی روایات کو اردو شاعری میں نبھایا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو شاعری میں معشوق ہمیشہ ہمیشہ عورت ہوتی ہے لیکن چونکہ ولی نے فارسی شاعری کی تقلید کی ہے اس لئے فارسی شاعری میں سراپا نگاری کے بعض رجحانات ولی کی اردو غزلوں میں بہت بے حجاب ہوگئے ہیں۔

دکنی شاعری میں، عام انداز میں، عورت معشوق اور مرد اس کا مطلوب ہوتا ہے نیز اردو شاعری میں محبوب کو عموماً فردِ مذکّر مان کر مخاطب کیا جاتا ہے، خواہ وہ ایک عورت ہی کیوں نہ ہو اور عاشق کو بھی ایک مرد تصوّر کیا جاتا ہے خواہ وہ ایک عورت ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ولی کے یہاں دکنی شعراء میں پہلی مرتبہ ''امرد پرستی'' کے مضامین نمایاں حیثیت سے مل جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ولی نے اپنی دو غزلوں میں اس روایت سے انحراف کیا ہے اور ہندی شاعری کے اتباع میں انھوں نے اپنی ایک غزل میں تو اپنی محبوبہ کو ایک عورت مان کر مخاطب کیا ہے۔ لیکن دوسری غزل میں انھوں نے ایک عورت کو ایک عاشق کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ان غزلوں کو پوری طرح یہاں لکھنا طوالت ہوگا اس لئے ان کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے جس میں ولی کا محبوب ایک عورت ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مت غصّہ کے شعلہ سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری ٹک اس کوں پجاتی جا
تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزاں ہے انکھیاں کوں لگاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر، آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

اسی طرح اب ولی کی دوسری غزل کے چند اشعار دیکھئے جس میں انھوں نے عورت کو عاشق کے روپ میں پیش کیا ہے۔

پرت کی کنتھا جن نے لی اُسے گھر بار کرناں کیا
ہوئی جوگن جو کُئی پی کی اُسے سنسار کرنا کیا
جو پیوے نیز نیناں کا اُسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن دکھ کا کرتی ہے اُسے آدھار کرناں کیا
محل دل کا تری خاطر بنایا ہوں میں دل جاسوں
جدائی سوں اُسے یکبارگی مسمار کرنا کیا
سہیلیاں جب تلک مجھ سوں نہ بولیں گے ولی آکر
مجھے تب تک کسی سوں بات ہور گفتار کرناں کیا

مذکورہ بالا اشعار میں ولی ہندی ادبیات کی روایت سے متاثر نظر آتے ہیں اور دکن کی روایتی شاعری سے انحراف بھی کرتے ہیں۔ دوسری طرف فارسی شاعری کے زیر اثر ان کے مضامین میں ''امرد پرستی'' کی بھی نشاندہی ملتی ہے، جو فارسی شاعروں کا عام چلن بن گئی تھی۔ کیوں کہ فارسی کے مایۂ ناز استادوں کے یہاں بھی کوئی نہ کوئی ایسا ''مرد کردار'' پایا جاتا ہے جسے وہ اپنا معشوق تصوّر کرتے ہیں اور اس کے عشق میں شوق سے اپنے دل کی لگن بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی بدعت تھی جو فارسی شاعری میں داخل ہوگئی تھی اور اس کے اثرات سے ولی کی شاعری بھی محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔ اور چونکہ دکن اور شمالی ہند کے شعراء، فارسی شعراء کے مضامین اور ان کے رنگ میں اپنی غزلوں کا رنگ ملانا اپنی شان خیال کرتے تھے اور اسے اپنی شاعری کی معراج تصوّر کرتے تھے۔ ولی کی شاعری بھی باوجود اپنی مقامیت کے فارسی شاعری کے غلبے میں رہی ہے۔ اس لئے ''امرد پرستی'' سے ولی کی شاعری بھی محفوظ نہیں رہ سکی، ولی جہاں کہیں اپنے آپ کو معشوق کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جیسا کہ اوپر کی غزل میں ذکر کیا گی وہیں کبھی کسی نوعمر لونڈے کو اپنا محبوب بھی بنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور صرف اس کے دستار ورخسار اور سبزۂ خط کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُسے اپنا معشوق بنا کر اس کے جسم کے ہر اعضاء کی خصوصیت بھی نمایا کرتے ہیں۔ اس روایت کا چلن جو کہ فارسی شاعری سے مستعار ہے۔ کیوں کہ ایران میں ''قہوہ خانوں'' اور ''شراب خانوں'' میں اس طرح کے نو عمر خوبصورت خدّ و خال رکھنے والے لڑکوں کو ''ساقی گری'' کے کام پر معمور کیا جاتا تھا اور چونکہ شاعر ''مئے نوش'' ہوا کرتے تھے، اس لئے ان ''مئے خانوں'' تک ان کی رسائی تھی۔ غالبًا وہیں سے کہیں یہ ''امرد پرستی'' کا سلسلہ شروع ہوا

ہے جس کی ابتداء کے بارے میں یقینی طور پر تو کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ ''ساقی گر'' نوعمر (لونڈے) ایرانی شاعری میں معشوق بن گئے، جو آگے چل کر ہر ایرانی شاعر کے یہاں جلوہ نما ہونے لگے اور وہیں سے یہ اردو شاعری میں منتقل ہوگئے۔

اردو شعراء ایرانی شعراء کی تقلید اور پیروی کو باعثِ فخر مانتے تھے اس لئے ان کی روش پر قائم رہتے ہوئے انھوں نے ''امرد پرستی'' کے مضامین کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اس طرح کے مضامین میں محض تفریح یا تفنن طبع والی بات معلوم نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح کی سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ولؔی کے یہاں اس طرح کے مضامین خال خال ہی سہی، لیکن آگے چل کر یہ روایت اردو شاعری میں میؔر کے ''عطّار کے لونڈے'' اور مصحفؔی کے ''طفلِ حجام'' تک پہنچتی ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں جہاں اردو غزل کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں وہاں یعنی امیؔر خسرو کے یہاں بھی اسی طرح ایک 'زرگر پسر'' کی شان میں یہ شعر لکھے تھے۔

زر گر پسرے جو ماہ پارا　　　کچھ گڑھ لے سنوار لے پکارا
نقد دل من گرفت وبکشت　　　پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

یوں اردو کی ابتدائی شاعری سے ہی اسی طرح کے بے شمار ''پسر'' یعنی ''لونڈے شعراء کے منظورِ نظر رہے ہیں۔ کچھ کے قصے زیادہ مقبول ہوکر منظرِ عام پر آگئے اور کچھ اپنی بدنامی اور رسوائی کے لحاظ سے اس طرح ''امرد پرستی'' کے مضامین کو شاعری میں برتنے سے احتراز کرتے رہے۔ لیکن ان کا بھی کوئی نہ کوئی منظورِ نظر ''مردمعشوق'' ضرور تھا۔ ولؔی بھی اس بدعت سے اپنا دامن نہیں بچا سکے کیوں کہ ولؔی کی شاعری فارسی شاعری کی تقلید تھی۔ لہذا جہاں دیگر تراکیب اور مضامین نیز خیالات ولؔی نے فارسی شاعری سے مستعار لئے وہیں ''امرد پرستی'' کے مضامین بھی ان کی شاعری میں لگے لپٹے چلے آئے ہیں۔ ولؔی کی شاعری میں امرد پرستی (مردمعشوق) کے جو نام ملتے ہیں ان میں امرت لال، گوبند لال، کھیم داس، موہن اور بیرلال نیز سیّد ابوالمعالی وغیرہ ہیں۔ لیکن اُن سے ولؔی کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا کھلا واضح ثبوت نہیں ملتا۔ صرف سید ابو المعالی سے ان کے دوستانہ تعلقات کا کچھ سراغ ملتا ہے کیوں کہ ۱۷۰۰ء میں ولؔی نے ان کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ولؔی نے جن دیگر ناموں کے افراد کے سراپے کا جائزہ اپنی شاعری میں لیا ہے اور جس طرح ان کے رخسار، گیسو، لب اور قد کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور اُن کے حُسن کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے اپنی مرعوبیت کو پوشیدہ نہیں رکھ سکے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ولؔی کے ''مردمعشوق'' ہونے سے قطعی انکار بھی نہیں کیا

جاسکتا ہے کیوں کہ ولؔی نے صرف ایک یا دو شعر میں ان کے حُسن و جمال پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ پوری پوری غزل کہہ ڈالی ہے۔ اس لئے ان ناموں کے افراد سے ولؔی کے تعلق دوستانہ نہ ہوکر عاشق اور معشوق کے ہو سکتے ہیں۔ جو ایرانی شاعری کے اثرات کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس ضمن میں مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جس میں ولؔی کھیم داس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

ہے بس کہ آب ورنگ حیا کھیم داس میں
آتا نہیں کسی کے خیال وقیاس میں

ولؔی نے ''بیرلال'' کا ذکر ایک جگہ اپنی شاعری میں اس طرح کیا ہے۔۔۔

دیکھا ہے بیرلال کو اکرم کے باغ میں
پہنچی اے بوئے عشق کی اس کے دماغ میں

اسی طرح سیّد ابوالمعالی کا ذکر ایک شعر میں یوں کیا ہے۔۔۔

پڑیا ہے رشک میں سورج رُخِ سیّد معالی سوں
رہا ہے زرد ہو ہو چندر اس کے لب کے لالی سوں

مندرجۂ ذیل اشعار اور دیکھئے جو سیّد ابوالمعالی کے لئے لکھے گئے ہیں۔۔۔

ترا قد دیکھ اے سیّد معالی — سخن فہما کی ہوئی ہے فکر عالی
ترے پانواں کی خوبی پر نظر کر — ہوئے ہیں گل رخاں جیو نقش قالی
ہوا تیرے خیالاں سوں سراپا — مرا دل مثل فانوس خیالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں سیہ مست — پیا گویا شرابِ پُرتگالی
گیا ہے خوف سوں اُڑ لعل کا رنگ — ترے یاقوتِ لب کی دیکھ لالی

ولؔی تب سوں ہو اہم کار فرہاد
سنا جب سوں تری شیریں مقالی

اسی طرح کی غزلیں ولؔی نے ''امرت لال'' اور ''گوبند لال'' پر بھی کہیں ہیں۔ جہاں ان کا انداز زیادہ بیباک نظر آتا ہے۔ ولؔی نے جس طرح ان دونوں کے سراپے اور حُسن و جمال پر قصیدہ خوانی کی ہے اس سے لگتا ہے کہ شاید دونوں کردار خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہوں گے اور ان میں وہ تمام خصوصیات اور کشش ولؔی کو

نظر آئی ہوں گی جو ایک صنفِ نازک میں ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو ولی نے ان کے سراپے میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ لہذا ولی کے ذہنی تصور کا اندازہ اس غزل کے مطالعہ اسے ہی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ''امرت لال'' اور ''گوبند لال'' کو کس زاویۂ نظر سے دیکھا ہے تو ولی کی مندرجۂ ذیل غزل ملاحظہ کیجئے۔

شمع بزم وفا ہے امرت لال　　سرو باغ ادا ہے امرت لال

ماہ نو کی نمن ہے سب کوں عزیز　　اس سبب کم نما ہے امرت لال

دل مرا کیوں نہ بند ہو اُس کا　　آج رنگین قبا ہے امرت لال

خوش لباسی کی کیا کہوں تعریف　　وضع میں میرزا ہے امرت لال

اس سوں بے گانگی کبھو نہ کرے　　جس ستی آشنا ہے امرت لال

لعل تیرے بھرے ہیں امرت سوں　　نام تیرا بجا ہے امرت لال

اے ولی کیا کہوں بیان اس کا

لطف میں دل رُبا ہے امرت لال

اب ولی کی مندرجۂ ذیل غزل ملاحظہ کیجئے جو اُنھوں نے ''گوبند لال'' کے متعلق لکھی ہے۔

ہے آج خوش قدی میں کمال گوبند لال　　استاد چال سرو ہے چال گوبند لال

بر جا ہے اس کے دل کوں کہوں گلشن بہار　　آتا ہے جس کے دل میں خیال گوبند لال

خوباں حیا سوں غرق غرق ہوں تو کیا عجب　　جس وقت جلوہ گر ہو جمال گوبند لال

ہے بس کہ بے مثال نہ دیکھا جو خواب میں　　آئینۂ خیال مثال گوبند لال

کر اس دعا کوں ورد زبان اے ولی مدام

لطف خدا ہو شامل حال گوبند لال

ولی کی غزلوں میں غالباً یہ ان کے ایسے معشوق ہیں جن کے متعلق واضح اشاروں میں ولی نے اپنے دلی جذبات اور ان سے محبت کی کیفیات بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا خیال بے حد اہم معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولی ایک طرف تو فارسی شاعری کے تتبع میں مرہٹہ لڑکے کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے تو دوسری جانب ولی کا معشوق اپنی تمام نسوانیت کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ نیل

وفرات کا ہمیں کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن گنگ وجمن اور تاپتی اور نربدا کے دھارے بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔" [۱۴]

ولیؔ کی غزلوں میں باوجود ایرانی اثرات کے کہ انھوں نے ایرانی شعراء کی طرز پر اپنے کلام میں اپنے محبوب لڑکوں (مردمعشوق) کے نام سے غزلیں کہیں ہیں۔ لیکن جذبات وبیان کی سادگی کے لحاظ سے قدیم شعراء کی حیثیت سے ان کی غزل گوئی کو حقیقی تغزّل میں شمار کرنا پڑے گا۔ گو وہ تنوع، مطالب واسلوب ادا کے لحاظ سے محدود ہی کیوں نہ رہی ہو۔ کیوں کہ ولیؔ حُسن کو قلب ونظر کی پاکیزگی کے لئے ایک ضروری عنصر خیال کرتے ہیں اور اُسے عیشِ ظاہری کا سبب جانتے ہیں۔ اس لئے اسی تصوّرِ حُسن کی وجہ سے مجازی پہلو میں اس کا حسین دوست کہیں مغل بچّہ ہے تو کہیں "مرہٹہ لڑکا" تو کسی جگہ "گوبند لال"، "امرت لال"، "کھیم داس" یا "سید ابو المعالی" ہے۔ اسی طرح دوسری طرف وہ صنفِ نازک ہے جو بناؤ سنگھار، حُسن و ادا کی شوخیوں، چال ڈھال اور نسوانیت کی تمام عشوہ وناز کی نمائندگی کرتی ہے۔ حسن کے بارے میں ولیؔ کا مجازی نقطۂ نظر ایسے موقعوں پر صاف ظاہر ہوتا ہے، جہاں ان کے دل میں بوس وکنار کی کیفیت تو ضرور پیدا ہوتی ہے مگر ان کی شریف النفسی ایسی خام تمناؤں کو عہدِ جوانی کی کمزوریوں پر محمول کرتی ہے اور وہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اثرِ بادۂ جوانی ہے   کر گیا ہوں سوال کچھ کا کچھ

ولیؔ کے یہاں متذکرہ بالا بدعت جو ایرانی شاعری کے راستہ راہ پاگئی تھی اور جس وجہ سے ان کی غزلوں میں ہوس پروری اور بوس وکنار کی شاعری کا الزام عائد ہوسکتا تھا، ولیؔ کے یہاں اس کی کچھ تلافی صوفیانہ مضامین، عارفانہ کلام اور معرفت نگاری سے ہوگئی۔ جس نے ولیؔ کی شاعری کو اس الزام سے بری رکھا اور ان کی شاعری کی آبرو برقرار رہی۔

ولیؔ کی شاعری اور غزلوں میں ایرانی اور فارسی اثرات کے باوجود مقامیت قائم رہی۔ اس ضمن میں اُنھوں نے بعض قدیم مقامی الفاظ اور روایات یعنی ہندی کے مُستعملہ عناصرِ ہندوستانی کو برقرار رکھا اور مذہبی، معاشرتی، تاریخی تلمیحوں، تشبیہوں اور استعاروں سے کام لے کر اپنی شاعرانہ اہمیت واضح کردی۔ ساتھ ہی اپنی حبّ الوطنی کا ثبوت بھی فراہم کردیا۔ یوں تو ولیؔ نے فارسی کے موضوعات کو برتنے میں بلاشبہ اپنے استادانہ کمال کا ثبوت دیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے ندرتِ خیال کے نقش ہائے رنگ رنگ سے اپنے زورِ طبیعت کی شہادت بھی

پیش کردی ہے۔ وؔلی کی غزلوں میں فارسی روایات کے ساتھ ہندوستانی رنگ وآہنگ کی شمولیت اپنے اثرات کے ساتھ غالب نظر آتی ہے۔ محمد علی آثر نے اپنی کتاب ''دکنی غزل'' میں وؔلی کے اس خاص رنگِ تغزّل کے تعلق سے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''اس کے کلام میں ہندوستانی تہذیب کی روح رچ بس گئی ہے اس کی تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں اور متخیلہ پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے۔ وؔلی نے اپنی غزلوں میں ہندوستانی پھولوں، پھلوں، شہروں باغوں، موسموں، بہاروں، پرندوں، جانوروں، دریاؤں، پہاڑوں کا ذکر کر کے نہ صرف یہ کہ دکنی شاعری کا اتباع کیا ہے بلکہ ہندوستانی ذوق کے تقاضوں کا احترام بھی ملحوظ رکھا ہے۔'' ۱۵

وؔلی فطری طور پر عاشق مزاج تو واقع ہوئے ہی تھے، اس لئے حُسنِ فطرت کی رعنائیوں سے بھی بڑی ہی واقفیت رکھتے تھے اور عیش ونشاط، رقص وسرور، بے فکری، اور خوش باشی کے عناصر سے ان کا خمیر اُٹھا تھا اور سب سے قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اپنے خیالات اور دلی جذبات کے اظہار کے لئے ان کے پاس ہر طرح کا ذخیرۂ الفاظ کی مقدار کافی تھی۔ اس لئے ان کی زبان میں لوچ اور لچک پیدا ہوگئی۔ زبان کی اس لچک سے وؔلی نے اچھوتی نئی تشبیہات، استعارات اور علامتیں پیدا کیں۔ اس اعتبار سے ان کا ذوقِ حُسن ان کی شاعری کے فنی پہلو میں نیا رُخ اختیار کرتا ہے اور اس کا احساسِ لطیف، مضمون آفرینی، نازک خیالی اور ندرتِ زبان ایسی مختلف شکلوں میں آشکار ہوتا ہے جو اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ وؔلی کے ہندوستانی انداز کے بارے میں ابوظفر عبد الواحد نے لکھا ہے کہ۔۔۔

> ''وؔلی کے مشربِ حُسن پرستی سے کہیں زیادہ اہم اس کا خالص ہندی تخّیل ہے جس نے اس کے مہماتِ شاعری میں ایک خاص دلکشی پیدا کردی ہے یہ خاص ہندی رنگ وؔلی کے بعد کے شعراء میں کہیں نہیں پایا جاتا۔'' ۱۶

وؔلی چونکہ فارسی اور عربی زبان کے پروردہ تھے اور ان کی بنیادی تعلیم انہی زبانوں میں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کے کلام میں پائے جانے والے اساتذۂ فارسی کے کلام کے اثرات اس بات کی غمّازی کرتے ہیں کہ ان فارسی شعراء کے کلام سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس حُسن وخوبی کے ساتھ وہ فارسی شعراء کا تخلص اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں اس سے پہلے کسی شاعر

نے نہیں کیا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان فارسی شعراء کی شاعری کے اثرات ان کے ذہن و دماغ میں کس قدر گہرے تھے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کی تشکیل نہ صرف عظیم فارسی گو شعراء جامی، انوری، عرفی، حافظ اور نظیری کے انداز پر کی ہے بلکہ ان کے کسی اشعار کے بہت متاثر ہوکر ان فارسی شعراء کے ایک دو اشعار کا ترجمہ بھی کردیا ہے۔ جس سے ان شعرائے فارسی سے ولی کی مرعوبیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس شدت کے ساتھ ان فارسی شعراء کے اثرات ان کے ذہن پر مرتسم تھے۔ جیسا کہ ولی کا بنیادی موضوع حُسن وعشق کا تذکرہ، جمال کا بیان اور اپنے محبوب کے خوبصورت جسم کی پیکر تراشی ہے، اس لئے بعض مقامات پر وہ حُسن کی اس خوبی کو ادا کرنے کے لئے اپنے محبوب کے سراپے کو فارسی کے کسی شاعر کے تخلّص سے جوڑتے ہیں اور ایک جگہ تو ولی کی پوری غزل ہی فارسی شاعروں کے ناموں سے مملو ہے، جس سے فارسی شعر وسخن سے ولی کی دل بستگی ظاہر ہے چنانچہ ایک پوری غزل انھوں نے فارسی زبان کے شعراء کے لئے وقف کردی ہے۔ ۱۷

ولی نے اپنی غزلوں میں زیادہ تر ان فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں مانے ہوئے استاد تھے اور جو غزل، قصیدے کے میدان میں شہہ سوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انوری اور خاقانی کی طرف انھوں نے بڑے ہی لطیف اشارے کئے ہیں۔ ولی کہتے ہیں کہ ان کا معشوق سر سے قدم تک اپنی جھلک میں گویا انوری کا روشن قصیدہ ہے۔ ولی اپنی ذات کو انوری کے مدِ مقابل خیال کرتے ہیں۔ اِس اعتبار سے انھیں اپنی عظمت کا بخوبی احساس ہے۔ اس لئے وہ عوام سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے لوگو! انوری کو کہہ دو کہ ولی سا صاحبِ سخن جہاں میں پیدا ہوا ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی ولی کو اپنی برتری کا احساس ہے اس لئے وہ بہ آوازِ بلند کہتے ہیں کہ ولی کا یہ ''ریختہ'' اُسے جاکر سناؤ جو انوری کے مانند فکرِ روشن رکھتا ہے۔ ولی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اے لوگو! خاقانی کی یاد دل سے بھلادو اور ولی کی طرف دیکھو کہ اب وہ رشکِ انوری ہے اور صرف انوری ہی پر کیا موقوف ہے خاقانی اور عُرفی بھی میرے سخن کے قائل ہیں اور اگر وہ بھی میرے یہ رنگین قصیدے سنیں گے تو ان پر بھی وجد کی کیفیت طاری ہو جاوے گی۔ ان اشعار کو دیکھئے جس میں ولی نے انوری کا ذکر کیا ہے یہاں نمونتاً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

تو سر سے قدم تلک جھلک میں
گو یا ہے قصیدہ انوری کا

ہر پلک تیری اے نگہ بدمست
نشہ بخشی میں شعر جامیؔ ہے

بسار دل سوں اپس کے تو یادِ خاقانیؔ
ولیؔ کو دیکھ کہ اب رشکِ انوریؔ یہ ہے

عُرفیؔ و انوریؔ و خاقانیؔ
مجھ کو سب دیتے ہیں حسابِ سخن

ولیؔ کے ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولیؔ انوریؔ اور خاقانیؔ کے قصائد کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں اور وہ ان کے قائل ہیں۔ اس طرح ولیؔ کے کلام میں جامیؔ اور عُرفیؔ کا بھی ذکر ملتا ہے گویا وہ فارسی شعراء جو اپنے کلام کی وجہ سے ہندوستان میں مقبول اور معروف تھے، ولیؔ نے ایسے تمام شعراء کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ اسی طرح ناصرؔ علی سرہندی ولیؔ کے ممتاز معاصرین میں سے ہیں جس نے ۱۱۰۸ھ کو دہلی سے داعی اجل کو لبیک کیا۔ ولیؔ کو اپنی شاعرانہ برتری کا اس درجہ احساس ہے کہ ایک جگہ وہ ناصرؔ علی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ناصرِؔ علی کو مصرع لکھ بھیجوں تو وہ اُسے سن کر برق کے تند مصرع کی طرح اچھل پڑے۔

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصرؔ علی کون

ٹک ریختہ ولیؔ کا جا کر اُسے سُناؤ
رکھتا ہے فکر روشن جو انوریؔ کے مانند

ولیؔ کے اس طرح کے درجنوں اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں جس میں انھوں نے فارسی کے ممتاز شاعروں کو مخاطب کیا ہے اور اپنی سربلندی بتانے کی کوشش کی ہے اور جس طرح ولیؔ نے حُسن کی وضاحت میں شاعر کا ''تخلص'' استعمال کیا ہے اسی طرح بعض فارسی شعراء کے کلام کا اردو ترجمہ بھی ولیؔ نے کیا ہے۔ جس سے ان کی علمی استعداد کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔ جن کا ذکر ''نورالحسن ہاشمی'' نے اپنی کتاب ''ولیؔ'' میں بھی کیا ہے۔ مندرجہٗ ذیل اشعار دیکھئے۔

نظیریؔ :-　تو چناں گرفتہ ای جاں بہ میانِ جان شیریں
نہ تواں تر اوجاں راز ہم امتیاز کردن

ولیؔ :-　ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں
مشکل ہے جیو سوں تجھ کوں اب امتیاز کرنا

حافظؔ:-　قیمت دُرِ گراں مایہ چہ دانند عوام
حافظاؔ گوہرِ یکدانہ مدہ جُز بہ خواص

ولیؔ :-　اے ولیؔ قدر تیرے شعر کی کیا بوجھے عوام
اپنے اشعار کوں ہرگز تو نہ دے جُز بہ خواص

خسروؔ :-　از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
دردِ مندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

ولیؔ :-　مجھ درد پر دوا نہ کرو تم حکیم کا
بن وصل نئیں علاج برہ کے سقیم کا

ولیؔ اپنے زمانے کے علوم میں کافی دست گاہ رکھتے تھے اور اکثر کتب متداولہ ان کے مطالعہ میں رہ چکی تھی۔ اسلام کے عظیم تاریخی واقعات بھی ان کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ نیز اسلام کی عظمت وبلندی اور برتری کا بھی اُنھیں گہرا احساس تھا۔ نیز قرآن، تفسیر، فقہ، فلسفہ، معانی اور تصوّف سے ان کی واقفیت اور لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ ولیؔ کے کلام میں قرآنی آیات کا استعمال ان کی عربی زبان سے مکمّل واقفیت کا پتہ دیتی ہے۔ ولیؔ جس خوش اسلوبی، صنّاعی اور فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ قرآنی آیاتوں کے ٹکڑوں کو اپنے شعروں میں سجاتے ہیں، اس کو دیکھ کر بھلا کون یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ ولیؔ عربی زبان یا قرآن کے معنی ومفہوم سے نابلد تھے؟

یہاں اس موقع پر جب کہ ولیؔ کی قرآن فہمی کا تذکرہ چل رہا ہے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہو رہا ہے کہ چاہے ولیؔ کے ذہن میں اللہ رب العزّت کی بزرگی کا احساس پیدا ہو رہا ہے یا وہ عبادت خداوندی میں سرِ تسلیم خم کر رہے ہوں، یا وہ آنکھوں کو نیم بند کر کے تلاوتِ قرآن کر رہے ہوں، تب بھی ولیؔ کے دل ودماغ میں ان

کے محبوب کا تصوّر ضرور مسلسل گردش کرتا رہتا ہے کہ وہ اس مطہر موقع پر بھی اپنے محبوب کو فراموش نہیں کرتے اور اس کا ذکر یا اس کے حُسن و جمال کے تذکرے جاری رہتے ہیں۔ یہ ولّی کی دیوانگی ہے اور حُسن سے ان کی وارفتگی ہے جو اس پاک موقع پر بھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ اس لئے ولّی محبوب کے سراپے کے ساتھ قرآنی آیات کا ایسا خوبصورت سنگم کرتے ہیں کہ ہماری طبیعت پر ذرا بھی ناگواری کے اثرات نمایاں نہیں ہوتے، بلکہ ان کی علمی لیاقت دیکھ کر ہماری عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار ولّی کی علمی لیاقت کے ضامن ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ قُوْلُوْا اَحبَابَنَا فَاِنَّ طَرِیْق
جانو اس راہ کوں سو کر تحقیق

؎ سجن کا مکھ منوّر، نورِ آیت فال مصحف ہے
کہ اہلِ نامراداں پر دُعائے هَلْ اَتٰی حافظ

؎ زُلف و رُخ ہے ترا جو لیل و نہار
مجھ کوں وَالّیل وَالضُّحٰی کی قسم

؎ مصحف رُخ ترا ہے سورتِ فجر
مجھ کوں وَالنَّجم اِذَا هَوٰی کی قسم

؎ رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیورِ لب ذکر سُبْحَانَ الَّذِی اَسْرٰی کروں

غرض یہ کہ ولّی کے کلام میں جابجا اس طرح کی عربی آیات کا استعمال ہوا ہے جس سے ولّی کی عربی دانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ولّی چونکہ ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) میں اعلیٰ دینی اور دنیوی تعلیم کے لئے ایک طویل مدّت تک قیام پذیر رہے تھے۔ یہ اُسی تعلیم کا اثر تھا جس کی بنا پر وہ اس طرح اپنی علمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی آیات کے ساتھ ان کے کلام میں مکتب و کتاب، درس وتکرار، مدرسہ ومعلّم، جزدان ورواق اور قیل وقال کے طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس بنا پر ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اُنھیں مکتب ومدرسہ سے بہ حیثیت معلّم بھی ضرور تعلق رہا ہوگا۔ شاید ولّی کی علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے ان کی تکمیلِ

تعلیم کے بعد نچلے درجے کے طالب علموں کی تعلیم پر بھی معمور کیا گیا ہو اور جسے ولی نے بہ حُسن وخوبی انجام دیا ہو۔ غالباً اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ولی صرف شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک جیّد عالم اور انشاء پرداز بھی تھے۔ البتہ ان کی غزلیں ان کی شہرت کا ضامن بنی اور جب اس ''خضرِ سخن'' نے آبِ حیات کو غزل کی صورت میں پیش کیا تو ہر طرف سے داد وتحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جو کہ شاہانِ دکن کے کلیّات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ولی سے قبل بھی صنفِ غزل موجود تھی اور صاحبِ ذوق وفن انھیں بھی دادِ سخن دے چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ولی نے اردو غزل کو جس نئے طرز سے لوگوں کے سامنے پیش کیا اس سے اردو غزل ایک ایسے بلند مقام پر پہنچی جو فارسی نظم ونثر کے اساتذہ کے لئے بھی قابلِ رشک ثابت ہوئی۔ غالباً اسی سبب سے ولی کو اردو غزل کا ''باوا آدم'' کہا گیا۔

اس کی دوسری اور بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ولی سے قبل کے ریختہ گو اپنی شاعری میں کسی قسم کی رومانیت اور تاثیر پیدا کرنے سے قاصر رہے تھے اور ان کی شاعری روایتی راہ پر گامزن تھی، جہاں ان کے خیالات محدود تھے اور شاعرانہ حُسن وخوبی پیدا کرنے والے خیالات کا فقدان تھا۔ جب کہ ولی نے اپنی غزلوں کو جس راہ پر گامزن کیا اس میں خیالات کی فراوانی، حُسن وعشق کی نیزنگیاں، اندازِ بیان اور نکھری ہوئی پاکیزہ زبان تھی۔ جس نے اردو غزل کے قالب میں نئی روح پھونک دی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جہاں روایتی انداز کی شاعری برسوں سے قائم رہی ہو، وہاں مضمون آفرینی، الفاظ کی تراش وخراش اور ترکیبوں کی ندرت کے ساتھ غزل اپنی نئی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش ہوئی ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ دکن میں جو معدودِ چند غزل گو شعراء تھے، ان میں ولی نے کامیابی کے ساتھ غزل کے ''پُل صراط'' کو پار کر کے حیاتِ جاوداں حاصل کی۔ غزل میں ولی کا یہ اجتہاد ان کی امتیازی شان ہے اور غزل گو کی حیثیت سے ان کی شاعرانہ عظمت کی ذمّہ دار بھی ہے۔

ولی نے اپنی غزلوں میں حُسن وعشق کا نقش ہائے رنگ رنگ پیش کیا ہے۔ حُسن وعشق کے اس جلوے میں ولی نے معاملاتِ عشق کی کیفیتوں کو اپنے مخصوص اندازِ بیان سے نئی جدّت عطا کی ہے۔ اور ان کا کلام اس بات کی وہ واضح دلیل ہے کہ وہ ''شعلۂ حُسن'' سے کس قدر متاثر ہیں، اس لئے ہمیں اُن کی شاعری میں حُسن ہی حُسن اور عشق ہی عشق نظر آتا ہے۔ اپنے ان عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لئے ولی نے اپنی عہد کی شعری روایات سے سے بغاوت کر کے مثنوی یا قصیدے کے بجائے غزل کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ گویا غزل میں بھی ولی نے روایتی اندازِ بیان اور موضوعات کی فسردگی سے انحراف کرتے ہوئے اپنی جودتِ طبع کے لئے صنفِ غزل کو

ہی مخصوص کرلیا۔ اگر چہ ولّی غزل گو شاعر تھے لیکن انھوں نے تمام مروّجہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جس سے ان کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال یقیناً اہمیت کا حامل ہیں وہ رقم طراز ہیں کہ۔۔۔

''جتنے مضامین اور غزل سے وابستہ ہیں وہ سب ولّی کے ہاں ملتے ہیں۔ غزل عاشقانہ شاعری کی ایک صنف ہے اور حُسن وعشق سے پیدا ہونے والے جذبات واحساسات کی رنگا رنگ کیفیات کا اظہار غزل میں ہوتا ہے اور ولّی کی شاعری میں حُسن وعشق کا یہی جلوہ نظر آتا ہے۔'' ۱۸؎

ظاہر ہے ولّی کی غزلیں حُسن وعشق کی آماجگاہ ہیں۔ لیکن اگر غور سے سوچا جائے تو ایک سوال ذہن میں ضرور ابھرتا ہے کہ صرف حُسن اور عشق کا تذکرہ کرنا اور اتنے تنوع اور انفرادیت کے ساتھ، کس بلا کی ذہنی بلند نظری، اور بلند خیالی کا نتیجہ ہے؟ ظاہر ہے ولّی نے اپنی وسعت نظر، وسعتِ ذہن، وسعتِ فکر، وسعتِ خیال اور وسعتِ قلب سے کام لیتے ہوئے غزل کے تمام موضوعات سے کام لیا ہے اور اس میں تمام دنیا بھر کی وسعتوں کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ جس کے سبب ہر ذوقِ نظر خاص وعام نے ان کے کلام کو سراہا ہے اور اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اور ان کے کلام کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ ولّی نے اپنی غزلوں میں ایسے بلند پایہ اشعار کہے ہیں جو لوگوں کے زبان زد ہوگئے ہیں۔ جو اپنی جدّت میں اوّلیت رکھنے کے باوجود اعلیٰ ترین معیار ومحک کے حامل تسلیم کئے گئے ہیں۔ جو آج بھی نہ صرف اُردو داں طبقے کو بلکہ غیر اردو داں حلقے کو بھی اپنی غزل کی سحر کاریوں کا شکار بنائے ہوئے ہیں۔

ولّی کا کلیات ایسے سحر آفرین اشعار سے بھرا ہوا ہے جن کو سن کر اُردو دانوں، اردو خوانوں اور اردو نویسوں کی بزم میں مرحبا اور سبحان اللہ کا نعرہ گونجنے لگتا ہے اور تحسین کے وہ غلغلے اور آفرین کی وہ آوازیں بلند ہوتی ہیں کہ محفل گونج جائے اور در ودیوار میں جنبش آجائے۔ گویا ولّی کی شاعری شاعری نہیں ''ساحری'' ہے اور اس ساحری کو پیدا کرنے میں ولّی کی زبان، خوبصورت ترکیبوں اور ولّی کی وجد آفرین صنعتوں کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ولّی کی قادر الکلامی بھی ان کی شاعری کی ایک خاص صفت ہے۔ ولّی نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے چھوٹی بحروں کو زیادہ مناسب خیال کیا ہے۔ یوں تو ان کے کلام میں بڑی اور مشکل سے مشکل بحریں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس میں بھی ولّی نے اپنا مضمون اتنی خوبی اور پاکیزگی سے ادا کیا ہے

کہ بندش میں کہیں کوئی الجھن یا ادائے خیالات میں کوئی تشنگی نہیں پائی جاتی، جو وؔلی کی زبان پر قدرت اور مسلّم استادی کی دلیل ہے۔ وؔلی کی اس مسلّم استادی کو قائم کرنے میں وؔلی کی صنعت گری کا اہم حصّہ رہا ہے۔ بعض مرتبہ وؔلی نے نہایت سادہ الفاظ میں ایسا دلکش حُسن اور رنگ پیدا کیا ہے کہ ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ ایسا رنگ پیدا کرنے کے لئے لفظوں کا انتخاب اور صنعتوں کی رنگ آمیزی بڑا ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وؔلی نے ان صنعتوں اور ترکیبوں کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے جیسے کوئی جوہری انگوٹھی میں نگینہ کو جڑ دیتا ہے۔ اسی طرح وؔلی نے بھی ان صنعتون کے استعمال میں بڑی مہارت دکھائی ہے۔

وؔلی کی تمام تر شاعری میں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا بڑا دخل ہے۔ اس لئے وؔلی کو بلا مبالغہ ''تشبیہات کا بادشاہ'' کہا جاسکتا ہے۔ ان کے ذریعے وؔلی نے بڑے ہی سلیقے سے حُسن اور عشق کے معاملات کو تشبیہات اور استعارات کے ذریعے پیش کر کے اس کا حُسن دوبالا کردیا ہے۔ انھوں نے ایسی اچھوتی اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں کہ قارئین ان کی ندرت اور لطافت سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں اور احساسِ لطافت اور شائستگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وؔلی کی یہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات عموماً انتہائی بلند، پاکیزہ اور شائستہ ہوتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اشعار میں سنجیدگی وبلندی کے ساتھ ایک تہہ داری آجاتی ہے۔ وؔلی کی ان تشبیہات، استعارات اور تلمیحات میں ان کی قوّتِ مشاہدہ کی جادوگری ہے اور جس کا سیدھا تعلق ان کی قوّتِ باصرہ سے ہے۔ جس وجہ سے حُسن کا یہ دیوانہ سادہ سے سادہ اور عام چیزوں میں بھی ایسی خوبیان دیکھ لیتا ہے جو ہمارے دیگر شعراء کو گمان تک نہیں ہوتی۔ دراصل وؔلی کا قوّتِ مشاہدہ اور قوّتِ بیان ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اس لئے انھوں نے ایک چیز کے لئے ہر موقع پر الگ الگ اور نئ نئ تشبیہیں استعمال کی ہیں اور وہ بھی ایسی نادر کہ گویا ہر بار آسمان سے تارے توڑ کر جڑ دیئے ہوں۔ اس لئے اس کی شاعری اس کی آنکھ کا نغمہ اور ان کے دل کی آواز بھی ہے۔ اسی لئے وؔلی کی شاعری کا سیدھا تعلق ان کی قوّتِ باصرہ سے ہے اور بیان کی چاشنی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے وؔلی نے اپنی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کی بنیادیں اسی مشاہدہ پر قائم کی ہیں۔ وؔلی کے کلام میں تشبیہات اور استعارات کی یہ فراوانی اس بات کی شہادت ہے کہ ان کے دماغ میں حسین اور خوبصورت الفاظ کا ایک بے پایاں ذخیرہ موجود تھا ان کیفیات کے متعلق محمد حسین آزؔاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ۔۔۔

''بھاشا زبان کی جس شئے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں ان خط وخال سے

سمجھاتی ہے جو خاص اس شئے کو دیکھنے، سونگھنے، چکھنے، یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش وخروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی، مگر سُننے والے کو جو اصل شئے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے وہ سُننے میں آجاتا ہے۔ بر خلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں صاف اس کی بُرائی بھلائی نہیں دکھائی دیتے، بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شئے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا بُرا سمجھا ہوا ہے، اس کے لوازمات کو شئے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے جب گرمی کی شدّت میں معشوق کے حسن کا اندازہ دکھاتا ہے تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔'' ۱۹

تشبیہات اور استعارات کے متعلق محمد حسین آزآد کے اس بیان سے فی الفور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عوام الناس کو اصل شئے کے دیکھنے سے جو لطف میسّر ہوتا ہے وہ لطف اصل شئے کے مماثل قرار دی ہوئی چیز کا تصوّر ذہن میں لانے سے بھی ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہنے کے بجائے کہ محبوب کا سراپا اِس طرح ہے اس کے بجائے اُس سراپے کے بیان میں اس کے مماثل شئے کے ذکر سے قاری کا ذہن اس بات پر مائل ہوتا ہے اور وہ اپنے تخیّل کی مدد سے تشبیہ یا استعارہ دی ہوئی شئے میں سے ان صفات کی تلاش کر لیتا ہے جو شاعر کہنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ کہ محبوب کے چہرے کو سورج سے، اس کے دست حنائی کو پنجۂ خورشید سے، اس کے چہرۂ رنگین کو پھولوں پر پڑی اوس سے، زلف کو پیاسی ناگن سے تشبیہ دینا ایسا ہی ہے جیسا ولؔی نے اپنی قوّتِ باصرہ اور قوّت مشاہدہ کی مدد سے ان کے مماثل شئے سے ان چیزوں کو تشبیہ دی ہے۔

ولؔی نے اپنے محبوب کی زلفوں کی دیگر مختلف النوع تشبیہات کا ذکر کیا ہے۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی زلفوں کو کتنے زاویوں سے دیکھتے ہوں گے اور محبوب کی یہ زلف کس کس طرح سے ان کا دل لبھاتی ہوگی۔ ولؔی کا یہ کمال دیکھیۓ کہ اُنھوں نے اپنے محبوب کی زلف کو ہر بار نئی تشبیہ دی اور وہ بھی ایسی اچھوتی اور نادر جو واقعی اور قطعی طور پر زلف کے پیچ وخم، اور اس کے اصلی مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ ولؔی نے محبوب کی زلفوں کو ''کالا ناگ''، ''کالے بجنگ''، ''سنبل سا بک (سانپوں کا بادشاہ)''، ''فتنہ''، ''شب کا سفر''، تو کہیں ''ظلمات'' کہا ہے اور ایک جگہ تو محبوب کے زلف کے دائرے کو اسلام کے ''ل'' پر فوقیت دی ہے اور ایک جگہ

لٹکتی ہوئی زلف کو ''رُغبتِ صیاّدُ'' کہہ دیا گیا ہے۔ تو کہیں تصوّر میں زلف کے خیال آنے کو ''رشکِ مشک'' کہا ہے۔ دراصل یہ تمام اور اس طرح کی دیگر اور تشبیہات صرف وؔلی کے کلام کا خاصہ ہیں۔ جو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وؔلی کی زلفوں کی تشبیہات کی کچھ مثالیں دیکھئے۔

ے دیکھا ہوں قدوزلف ودہن جب سے پیو کا
کرتا ہوں تب سے ورد الف لام میم کا

ے یہ سیاہ زلف تجھ زنخدان پر
ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

اسی طرح محبوب کے سراپے میں استعمال ہونے والی دیگر تشبیہ میں وؔلی کے یہاں ''تل'' وخال، کو خاص دخل ہے۔ وؔلی اپنے محبوب کے تل کو سپند، جیم کا نقطہ، بیت انتخابی کا نقطہ ''زنگی'' وغیرہ جیسے لفظوں سے تشبیہ دی ہے۔ وؔلی نے اپنی غزلیات میں ''خال'' یعنی ''تل'' کو جس دل پزیر اور سحر آمیز تشبیہات سے مزیّن کیا ہے وہ آج تک قابلِ رشک ہیں۔ اسی طرح وؔلی نے اپنے محبوب کے دیگر جسمانی اعضاء یعنی اس کے لب کو جہاں ایک ''تل'' تھا، وہاں محبوب کے لب کے تل کو ''حوض کوثر پر کھڑے بلال'' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تمام ایسی تشبیہیں ہیں جو ہر شاعر کے دل ودماغ میں نہیں آسکتی۔ دراصل اس طرح کی وجد آفرین تشبیہات صرف وؔلی کی شاعری کا حصّہ ہیں۔

وؔلی اپنے محبوب کے سراپے میں آگے بڑھتے ہوئے اس کے قدِ بالا کو ''طوبیٰ'' سے، ہونٹوں کو ''آبِ حیواں'' سے، خمیدہ بھوؤں کو ''محرابِ مسجد'' سے، کتابی چہرے کو ''مصحفِ قرآن'' سے، زلفِ پیچاں کو ''جمنا کی موجوں'' سے، یہ تمام تشبیہات اور استعارات ایسے ہیں جس کو پڑھ کر ہمیں وؔلی کے محبوب پر رشک آتا ہے اور دل میں اس کے دیدار کی تمنّا پیدا ہوجاتی ہے۔ ان صنعتوں کے استعمال میں لفظوں کا اتار چڑھاؤ، اُن کا آہنگ، طویل اور خفیف بحروں کا انتخاب اور ان میں پوشیدہ غنائیت اور ترنم وؔلی کی غزلوں کو شگفتگی عطا کرتی ہیں۔ وؔلی نے خود کہا ہے کہ ''میرے کلام میں ایسا نشۂ معنی پوشیدہ ہے، جیسے رنگ وبوئے مئے سے ایاغ، گل لبریز ہے۔

وؔلی نے اپنی تشبیہات اور استعارات نیز تلمیحات میں لفظوں کے ظاہری حُسن پر توجہ نہیں کی، بلکہ اُن کے مختلف مفاہم اور ان کی رمزیت پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے اور اس کے ذریعے اپنے کلام میں تاثیر پیدا کی ہے۔

ولی نے صنائع بدائع، صنعتِ ایہام اور حسنِ تعلیل کے استعمال میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے کلام کی ساری خوبی ان کی سادگی اور بے تکلفی ہے۔ جس میں اُنھوں نے تشابیہ اور استعارات کے ذریعے حُسن پیدا کیا ہے۔ لیکن اپنے منفرد لب ولہجے کی وجہ سے تصورِ حُسن کو عامیانہ اور پست ہونے نہیں دیا۔ وہ اپنے محبوب کی تعریف میں مختلف خوبصورت لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جن میں ''گلاب افشاں جبیں، عارض روشن، لب لعلین، رُخِ سیمین، سلکِ گُہر، ساق بلوریں، جیسے لفظوں کو ہیروں کی مانند اپنے شعروں میں جڑ دیتے ہیں۔ اُنھوں نے اس طرح کے بے شمار خوبصورت لفظوں سے ایسا سماں باندھ دیا ہے کہ قاری ان لفظوں کے سحر میں گم ہوجاتا ہے۔

ولی چونکہ جمال پرست شاعر ہیں اور وہ اپنے ہر دلبران کی ایک ایک ادا کے مَحرَم ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کلام میں ہر حسین اور خوبصورت چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اُسے کھکھیوں سے جھانکتے ہیں، کسی کو تاکتے ہیں، تو کسی کو جانچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ولی ایسی نظروں سے ان کا معائنہ اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ اس کے تمام سراپے کا بغور اور گہرا جائزہ لے لیتے ہیں اور اس کے سراپے کے اِسرار کی منادی کو شعروں میں سرِ بازار کرتے ہیں۔ حُسن کے اِسرار کی اِس منادی میں وہ جن تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرتے ہیں اس سے ان کے محبوب کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شخصیت مجروح نہیں ہوتی، بلکہ اس کے مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگ ان کے اشعار پڑھکر اپنا سر دھننے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں ولی کی تشبیہات اور استعارات اپنی مثال آپ ہیں۔ جس میں روانی اور سلامت کے ساتھ بے ساختگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میدان میں ولی کی یکتائی مسلّم ہے۔

ولی نے جن تشبیہات کا استعمال کیا ہے اُن میں وہ ''رقیبوں کو خاروخس کہتے ہیں، سرو قد کو دیکھنا وقتِ سرفرازی قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کو عیدِ عاشقاں سمجھتے ہیں اور اس کی یاد میں گھلنے کو ہلال کی طرح لاغر ہونا مانتے ہیں وہ عشق کو دل کی مچھلی اور محبوب کے حُسن کو کانٹا کہتے ہیں۔ ولی کے لئے محبوب کے قدم پر سرِ رکھنا ہم مشربِ رنگِ حنا ہونا ہے۔ اُن کے نزدیک رخسار پر کاکل کا چھٹنا حُسن کے دریا پر موج کا لہرانا ہے، محبوب کی گلی ان کے لئے ہند، کشمیر وکابُل ہے۔ اس طرح یہ تمام تشبیہات اور استعارات ولی کے کلام کے زیور ہیں۔ جس سے ان کے کلام میں تازگی، شگفتگی اور جدّت پیدا ہوگئی ہے۔ ولی فرماتے ہیں کہ۔۔۔

؎ عجب قلعہ ہے واں اک باقرینہ
انگوٹھی میں دُنا (دنیا) کی جیوں نگینہ

وؔلی شہر سورت کی خوبصورتی سے بہت متاثر تھے۔ اس پر انھوں نے ایک طویل مثنوی بھی کہی ہے۔ یہاں اس شعر میں بھی وہ ''سورت'' شہر کی تعریف کر رہے ہیں اور دنیا کو ایک عظیم الشان انگوٹھی فرض کیا ہے اور سورت کے قلع کو اس انگوٹھی کا نگینہ قرار دیا ہے۔ وؔلی نے اپنی خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے اپنے کلام کو مزیّن کیا ہے، جس سے ان کے کلام کا حُسن اور اس کی نزاکت کچھ اور نکھر آئی ہے یہ مندرجۂ ذیل اشعار دیکھئے۔

؎ ظاہر ہوا ہے مجھ پر ترے ناز سوں صنم
رنگین بہارِ حُسن بہارِ عتاب ہے

؎ شاخ گل ہے یا نہالِ راز ہے
سر وقد ہے یا سراپا ناز ہے

وؔلی کے کلام میں جابجا ایسے اشعار کی کثرت ہے جس میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال ہوا ہے۔ یہ وؔلی کی خوبی اور فنکاری ہے کہ اُنھوں نے ان تشبیہات اور استعارات کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ استعمال کیا ہے، کہ ان کی شاعری کا لطف دو بالا ہوگیا ہے۔ اسی پر وؔلی کی شاعری اور ہر دل عزیزی کا راز مضمر ہے۔ وؔلی کی ایک مشہور غزل میں یہ مندرجۂ ذیل اشعار دیکھئے۔

؎ وؔلی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی!
میرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

وؔلی اپنے محبوب کے آہستہ آہستہ لجاتے شرماتے گھر سے باہر نکلنے کو سورج کے مشرق سے طلوع ہونے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ مندرجۂ ذیل شعر دیکھئے۔۔۔

؎ اداؤں ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

شاعرانہ تعلّی :-

اب آیئے وؔلی کے کلام میں مستعمل دیگر صنعتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ وؔلی نے اپنی غزلوں میں

شاعری کے تمام لوازمات کا استعمال کیا ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری کا ہر ہر لفظ مسرّت بخش ہوگیا ہے۔ ''کلّیات ولؔی'' میں اس قسم کے سینکڑوں اشعار ملیں گے جو فصاحت کی جان اور انسان کے لئے مسرّت کا ایک وافر ذخیرہ اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔ جدّت اسلوب، سلاستِ بیان غرض بیرونی نقطۂ نظر سے بھی وہ تمام محاسن جو غزل کو غزل کہلانے کا مستحق کرتے ہیں، ولؔی کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام کا ترنم اور موسیقی سحر آمیز کیفیت پیدا کرتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک معمولی بساط کا شاعر ایسی لطیف تشبیہات، نادر استعارے اور بلیغ کنایے ذہن میں کھتا ہوگا ؟ کیا جذبات کی ایسی مؤثر نقاشی کوئی معمولی استعداد کا آدمی کرسکتا ہے ؟ ولؔی کو اپنی غیر معمولی صلاحیت کا بخوبی احساس تھا حالانکہ مندرجۂ ذیل اشعار سے ولؔی کا اظہارِ فخر ظاہر ہوتا ہے اور اس احساس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مخترع اور موجِد سمجھتے ہیں اور اپنی شاعرانہ بالادستی کا تصوّر رکھتے ہیں۔ ولؔی کے اس شاعرانہ فخر کا احساس دلانے والے اشعار مندرجۂ ذیل ملاحظہ کیجئے۔

ے امید مجھکو یوں ہے ولؔی کیا عجب اگر
اس ریختہ کو سن کے ہو معنی نگار بند

ے ولؔی اربابِ معنی میں ہے اُس کو عرش کا رتبہ
پری زادان معنی کو جو کُئی کرسی پہ بتلاوے

ے جو شعر لباسی تھے جیوں پھول ہوئے باسی
جب شعر ولؔی تیرا یہ تازہ ہوا تازہ

ے یوں شعر تیرے اے ولؔی مشہور ہیں آفاق میں
مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

مراعات النظیر :- وہ کلام جس میں ایک لفظ کی رعایت سے اس کی مناسب چیزیں جمع کردی جائیں، اُسے صنعت تناسب یا صنعتِ مراعات النظیر کہا جاتا ہے۔ ولؔی نے اپنے کلام میں بے شمار ایسے اشعار کہے ہیں، جس میں ایک لفظ کی مناسبت سے دیگر الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔

ے اے رشک ماہتاب تو دل کے صحن میں آ
فرصت نہیں ہے دل کو اگر تو این میں آ

اس شعر میں ماہتاب، صحن اور دن رات ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک دوسری مثال اور دیکھیے۔

محراب تجھ بھواں کی عجب ہے مقام خاص
ہر پنجگانہ اس میں دلوں کی نماز ہے

یہاں اس شعر میں محراب، بھواں، پنجگانہ اور نماز میں رعایت لفظی ہے۔

حُسن التعلیل :- (علّت کی عمدگی) کسی چیز کی صفت کو ظاہر کرنے کے لئے ایسی چیز کو علّت ٹھہرانا جو دراصل علّت نہ ہو۔ ولؔی نے اپنی غزلوں میں ان صنعتوں کے استعمال سے بڑا حُسن پیدا کیا ہے اور اپنے مطالب کو بیان کرنے کے لئے صنعتوں کے استعمال سے ایسی وضاحت کی ہے کہ حُسنِ کلام کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر ملاحظہ کیجئے۔

اس آبِ روح فزاں کے کمال لطف کو دیکھ
چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی

ماہ کے سینے اوپر اے ماہ رو
داغ ہے تجھ حُسن کی جھلکار کا

بالا شعر میں چاند کی چاندنی کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں چہرے کی چاندنی کو حقیقی چاندنی پر ایک داغ بتایا ہے جو کہ یہ صفت چہرے کی عادت نہیں لیکن شاعر نے اپنے بیان اور تخیّل سے کیسا غضب حُسن پیدا کیا ہے اور مبالغہ بھی ایسا حسین ہے کہ کچھ دیر کے لئے مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔

ردّ العجز علی الصدر :- جو لفظ ''صدر'' میں ہوا اسی کو ''عجز'' میں لانا دوسرے لفظوں میں اصطلاحِ شعراء میں مصرعۂ اوّل کے پہلے جز کو ''صدر'' اور آخری کو عروض کہتے ہیں اور مصرعۂ ثانی کے جزو اوّل کو ''ابتداء'' اور جزو آخر کو ''عجز'' یوں مختصر ترین تعریف یہ ہوگی کہ مصرعوں کے پہلے اور آخر کے ارکان کو الٹ دیا جاتا ہے۔ ولؔی کے یہ مندرجۂ ذیل شعر اس صنعت سے متعلق ہیں۔

کیمیا عاشق کے حق میں نگاہِ گُل رخاں
گُل رخاں سے جگ کے پایا ہوں ولؔی یہ کیمیا

ے تجھ سوں لگی ہے لگن اے گلِ باغِ حیا
اے گلِ باغِ حیا تجھ سوں لگی ہے لگن

وؔلی نے لفظوں کے الٹ پھیر سے شعر میں بڑا حُسن پیدا کیا ہے اور اس کے سبب کوئی بے معنی بات معلوم نہیں ہوتی۔ لفظوں کی اس الٹ پھیر سے ہلکی سی تکرار ضرور ابھرتی ہے، لیکن اس کے باوجود شعر کی نغمگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور اس تکرار کے باوجود وؔلی ایک خیال انگیز بات کہہ جاتے ہیں۔ جس میں بڑے ہی گہرے معنی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایک دو مثالیں اور دیکھئے۔

ے مدّعائے عاشقاں ہر آن ہے دیدارِ یار
یار کی دیدار بن دوجا عبث ہے مدّعا

ے بے وفا تجھ کو بولوں ہے بجا اے نازنین
نازنین عالم میں ہوتے ہیں اکثر بے وفا

حُسن طلب :- کسی چیز کے مانگنے میں خوبصورتی پیدا کرنا "حسن طلب" کہلاتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے۔

ے وؔلی کو اے سجن گا ہے عطا کر بھیک درشن کی
دیا ہے لطف سوں تجھ کو خدا نے حُسن کی دولت

ے لب تمہارے ہیں شفا بخش، وؔلی ہے بیمار
حیف صد حیف جو اس وقت مین درماں نہ کر

تجنیس :- (مراد ہم جنس ہونا) کلام میں ایسے دو یا زائد الفاظ لانا جو صورت میں مشابہ ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں یا معنی یا الفاظ کے اعتبار سے ملتا جلتا ہوا ہونا۔ تجنیس کی بہت سی مثالیں ہیں یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو وؔلی کے کلام میں جاذب نظر آتی ہیں۔

ے ترے بِن رات دن پھرتا ہوں بَن بَن کشن کی مانند
اَپس کی مکھ اُپر رکھ کر نگہ کی بانسلی انکھیاں

یہاں بن معنی بغیر اور بَن معنی جنگل ہے جو تجنیس محرّف کی مثال ہے یعنی حرکت کے سِوا جو ایک شعر میں زَبر ہے اور دوسرے میں زیر اسی طرح کا پورا شعر دیکھئے۔

؎ تجھ زلف نے جو دائرے باندھے صِفا رُخسار پر
دیکھے نہیں اس شاہ کے کوئی صاحبِ اسلام لام

ایہام :- کلام میں ذو معنی لفظ قصداً رکھا جاتا ہے اور اُس سے بجائے قریب الفہم بعید الفہم معنی متصور ہوتے ہوں، تو اُسے ایہامِ توریہ کہتے ہیں۔ قریبی معنی سے مراد وہ معنی ہے جس سے قاری یا سامع مُراد ہو اور بعیدی معنی یعنی وہ معنیٰ جو شاعر کی مراد ہو۔

؎ مذہبِ عشق میں تیری صورت
دیکھنا ہم کو فرض عین ہوا

؎ موسیٰ جو آکے دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

پہلے شعر میں عین کے معنی آنکھ اور واجب یا ضروری یہاں واجب اور ضروری مُراد ہے۔ دوسرے شعر میں پہاڑ سے مُراد کوہِ طور نہیں جہاں موسیٰ علیہ السلام نے جلوۂ خداوندی دیکھا بلکہ مشکل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

تجاہل عارفانہ :- جب شاعر اپنے کلام میں کسی بات کو جانتے ہوئے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرے تو اسے صنعتِ تجاہل عارفانہ کہتے ہیں۔

؎ شاخِ گُل ہے یا نہالِ راز ہے
سر وقد ہے یا سراپا ناز ہے

یہاں ولیؔ اپنے محبوب کے بارے میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس کے حُسن کی تعریف کر رہے ہیں۔

مندرجۂ بالا صنعتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا مقصود ہے کہ ولیؔ وسیع الذہن کے مالک تھے اور عروض وقوافی کے قوانین سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے کلام میں موجود صنائع بدائع کا استعمال ان کی عملی استعداد کی واضح دلیل ہے۔ ولیؔ کو علم ومعانی وبیان سے بھی بڑا شغف تھا اور ان کے استعمال سے انھوں نے اپنے کلام میں بڑی ہی دلکشی پیدا کی ہے۔ انھوں نے غالبًا اس دور کی ہر مرّوجہ صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی

ہے۔ ان کی کوئی غزل، کوئی شعر، کوئی رُباعی، کوئی مثنوی اور کوئی مستزاد متعارف ومقرّ رہ دوائر و بحور سے خارج نہیں ہے۔لیکن زمانی اعتبار سے جو دور تھا اور زبانوں کے ردّ قبول کے اعتبار سے عربی وفارسی کے الفاظ جابجا نظر آتے ہیں۔لیکن ولؔی نے اس معاملے میں ایسی موزوں طبیعت پائی تھی کہ فارسی تراکیب اور لفظوں کو اس کوبصورتی کے ساتھ اردو زبان میں شریک کر دیا کہ وہ انھیں کا حصّہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہ خصوصیت ولؔی کی طبیعت میں فطری طور پر ودیعت تھی کہ انھوں نے نہایت دلچسپ اور خاطر نشین طریقے سے اصطلاحاتِ علوم وفنون، شاعری اور مناسب اور موزوں تشبیہات وتلمیحات کو اپنے جدّت آمیز خیالات اور صحیح جذبات ومحاکات کو اس طرح بے تکلّف ادا کیا کہ وہ محض اُن کی قوّتِ متخیّلہ اور انھیں کے پرواز فکر کا نتیجہ قرار پائیں۔جس کی وجہ سے ولؔی کے فکر وخیالات کی بلوغت دانشوروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی۔ ولؔی کی غزل گوئی اردو کے تمام غزل گوشعراء پر فوقیت رکھتی ہے اور اپنی اوّلیت کے باوجود آج بھی اس میں اتنی کشش ہے کہ اردو کے دیگر بلند پایہ شاعروں کے کلام سے کسی قدر کمتر متصوّر نہیں کی جاسکتی۔محمد حسین آزاؔد نے اپنے تذکرہ میں سب سے پہلے اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ رقم طراز ہیں کہ۔۔۔

”ولؔی کی تعریف احاطۂ تحریر وتقریر سے باہر ہے۔ ریختہ کی بنیاد کو اس نے اس قدر مستحکم کر دیا کہ اس کی بلندی آسمان سے زیادہ ہوگئی۔[۲۰]

محمد حسین آزاؔد کا مندرجۂ بالا بیان کتنی صداقت پر مبنی ہے اور یہ بیان آج سے گذشتہ ایک سو پچیس (۱۲۵) برسوں پہلے دیا گیا ہے۔لیکن ولؔی کی شاعری کا یہ وصف نہ صرف یہ کہ ان کے عہد میں نیا اور منفرد تھا بلکہ آج تک اس کی تابندگی اور چمک ذہنوں کو منوّر کرتی ہے۔ ان کا ہر شعر ان کی فطرت اور شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ ولؔی کی شاعری داخلی ہونے کے باعث ان کی شخصیت کا نقشِ ثانی بن گئی ہے۔ اس لئے ولؔی کی شاعرانہ صداقت ان کی عظمت میں خاص طور پر معاون ہے۔ ولؔی نے جو حقائقِ زندگی بیان کئے ہیں، اُن کو مبالغہ آمیزی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ولؔی کی زبان، شعری اظہار اور تراکیب سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے دیگر غزل گوشعراء کی تیزی وتندی، شباب کی جن خاص وارداتِ عشقیہ کو موضوعِ شعر بناتے ہوئے جھجک محسوس کرتے تھے، وہ واردات اپنی تمام فنی تقاضوں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے ولؔی کی غزلوں کا سنگھار بنی ہوئی ہیں، اور غزل میں ان کی آواز سرزمینِ حافؔظ سعدؔی کے لالہ زاروں سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس آواز میں ولؔی کی اپنی منفرد شخصیت کی گھلاوٹ بھرپور انداز میں

موجود ہے۔ اس کے علاوہ وؔلی کی غزلوں میں خاص طور سے اُن مسائل کے فکری ردِ عمل بھی سمٹے ہوئے نظر آتے ہیں جو آج کے موجودہ دور کی معیشی اور مجلسی زندگی کے پس منظر میں پوری شدّت کے ساتھ برسرِ عمل ہے۔

ان تمام محاسن کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وؔلی اقلیم سخن میں ایک قابلِ فخر ہستی ہیں اور برّ صغیر میں پیدا ہونے والے تمام غزل گوشعراء میں آج بھی وؔلی کو اوّلیت حاصل ہے۔ ان کی شاعرانہ افکار اور بلند خیالی کو دیکھتے ہوئے اس کے رنگِ تغزل کی تقلید کو باعثِ فخر تصوّر کیا گیا۔ وؔلی کے بعد سے آج تک کئی صدیاں گزر گئیں، لیکن اب تک ادب کے کسی نقاد نے وؔلی کی شاعری پر حرف نہیں رکھا اس طرح وؔلی کی شاعری بالخصوص ان کی غزل گوئی اپنی اوّلیت کے باوجود تمام نقوش سے پاک نظر آتی ہے۔

آج تک منظرِ عام پر آنے والا کوئی شاعر یا محقق ایسا نہیں جس نے وؔلی کے کلام کو نہ سراہا ہو یا ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اِسے وؔلی کا اعزاز ہی کہا جائے گا جس نے اُسے ''شاعر الشعراء'' کے منصب پر جلوہ افروز کردیا۔ وؔلی نے اردو غزل کی اپنے خونِ جگر سے ایسی آبیاری کی اور اپنی جدّتِ طبع سے اُسے ایسا رنگ عطا کیا کہ غزل اردو شاعری کی آبرو بن گئی۔ لہٰذا ان کے بعد ہر آنے والے شاعر نے اسے ایک بنیادی اور شاہ صنف کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ غرض یہ کہ غزل کی وہ روایت جو آگے چل کر اپنے بام عروج کو پہنچی اس کا سرچشمہ وؔلی کی ہی غزل ہے اس لئے اردو شاعری میں وؔلی کو اردو غزل کا ابو الآباء کہا جانا غلط نہ ہوگا۔ سچ ہے وؔلی نے خود کہا ہے ---

ع   وؔلی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

باب چہارم (الف) :- ولیؔ کی شعری وسعتیں

۱۔ اردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا — ص : ۲۳۷

۲۔ ایضاً — ایضاً — ص : ۲۴۰

۳۔ الموسیٰ (یادگارِ ولیؔ نمبر) — مرتب : سیّد محمد ایم۔اے — ص : ۱۰۹

۴۔ شاعری اور شاعری کی تنقید — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ص : ۳۷

۵۔ غزل تنقید (جلد اوّل۔ ولیؔ کی دکنی سے اقبال اور مابعد اقبال تک) مرتب : اسلوب احمد انصاری — ص : ۳۳

۶۔ ولیؔ گجراتی (دیباچہ) — ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنیؔ — ص : ز

۷۔ ولیؔ انتخاب وتہذیب — مرتب : محمد خان اشرف — ص : ۳۶

۸۔ نذرِ ولیؔ — طالبات جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد۔ ۱۹۳۷ء — ص : ۱۲

۹۔ ایضاً — ایضاً — ص : ۱۲

۱۰۔ بحوالہ : اردو غزل — مرتب : کامل قریشی — ص : ۸۸

۱۱۔ اردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا — ص : ۲۳۹

۱۲۔ ایضاً — ایضاً — ص : ۲۳۸

۱۳۔ ایضاً — ایضاً — ص : ۲۳۸

۱۴۔ ولیؔ گجراتی — ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ — ص : ۱۴۹

۱۵۔ بحوالہ : اردو غزل — مرتب : کامل قریشی ۔ مضمون مشمولہ : محمد علی اثرؔ — ص : ۷۸

۱۶۔ ''ولیؔ کی شاعری'' — مضمونِ مشمولہ الموسیٰ (یادگارِ ولیؔ نمبر) مرتب : سیّد محمد ایم۔اے — ص : ۶۸

۱۷۔ ملاحظہ ہو ''کلیاتِ ولیؔ'' — مرتب : نور الحسن ہاشمی — ص : ۲۹۹

۱۸۔ تاریخِ ادب اردو (جلد اوّل) — ڈاکٹر جمیل جالبی — ص : ۵۴۱،۴۲

۱۹۔ آبِ حیات — محمد حسین آزادؔ — اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، چھٹا ایڈیشن ۲۰۰۳ء — ص : ۵۰

۲۰۔ ایضاً — " — " — " — ص : ۵۴

★★★★★★★

chapter- 4/ Part-2

باب چہارم (ب)

ولؔی کی صوفیانہ شاعری

باب چہارم (ب)

ولؔی کی صوفیانہ شاعری

ولؔی کی شہرت اور مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی غزل گوئی تھی، انھوں نے اردو غزل کے سارے امکانات کا روزِ روشن کی طرح نمایا کردیئے تھے اور دھیرے دھیرے یہ غزل ایک ایسی صنف شعر بن گئی جس میں زندگی کے ہمہ رنگ تجربات بیان ہونے لگے۔ اس طرح غزل فارسی کے سحر سے آزاد ہوکر اردو میں اپنا جادو جگانے لگی۔ ولؔی کی شہرت کی اس عمارت کی داغ بیل ان کی اپنی طرزِ خاص اور غزلوں کا وہ انوکھا انداز ہے جس میں عشقیہ مضامین کے ساتھ عشق کے متلاشی اور حُسن کے شیدائی جوان دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اس لئے ان کے نام کو عاشقوں نے اچھالا اور ان کی شہرت کو محبت کے ماروں نے چمکایا۔ گویا ناکام اور بامُراد دونوں طرح کے عاشقوں کے لئے ولؔی کا کلام اور ان کی غزل گوئی ان کے دل کی آواز ہیں۔ اس طرح عاشق مزاج اور شوخ طبیعت رکھنے والے ولؔی کے دیوان کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں اور اس شدّت کے ساتھ اس کا دیوان پڑھتے ہیں کہ پڑھنے والا متحیّر اور کلام سُننے والے ششدر رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے ہندوستان گیر پیمانے پر ان کا نام گھر گھر پھیلا ہوا ہے۔

ولؔی جب تک خود جوان رہے ان کی شوخ طبعی بھی جوان رہی، عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو عاشقی کا بدرِ کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا اور اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ ولؔی کے بالوں میں جب سفیدی آئی ہوگی اور صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے ہوں گے تو عاشق نے انگڑائی لی اور زندہ ولی کی شمع جھلملانے لگی۔ حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی اور جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنادیا۔ سوزشِ عشقِ حقیقی نے ان کے سینے کو گرما دیا اور ذوقِ عرفان نے ان کے دل کو تڑپا دیا۔ معرفت کی شعائیں ان کے مطلع قلب سے اس نورانیت کے ساتھ پھوٹیں کہ لوگوں کی آنکھیں چکاچوندھ ہوگئیں کہ ولؔی جیسا شوخ اور حُسن کے بیان میں فیاضی سے کام لینے والا شاعر صوفی کب ہوگیا؟

ولؔی تو بنیادی طور پر صوفی ہی تھے، کیوں کہ ان کی روحانی تربیت "مدرسہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ

(احمد آباد۔ گجرات) میں ہوئی تھی اور مولانا شیخ نور الدین صدیقی سہروردی کے علاوہ کئی ایک برگزیدہ شخصیتوں کی صحبتیں بھی اُنھیں میسّر ہوئیں تھیں۔ چونکہ ولؔی بسلسلۂ طالب علمی عرصے تک اس ''مدرسۂ علویہ'' (خانقاہ) میں مقیم رہے تھے وہ تمام ماحول صوفیانہ تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّدظہیر الدین مدنؔی رقم طراز ہیں۔۔۔

''ولؔی جب سنِ شعور کو پہنچا تو اپنے اردگرد صوفیوں ہی کو پایا اس کے کان اہل اللہ کے نعروں سے بچپن ہی سے آشنا ہوچکے تھے۔ یہ ولؔی کا وہ زمانہ ہے جب احمد آباد میں مشائخ کا سکّہ چلتا تھا اور تمام سلسلوں کے خدا رسیدہ شیوخ موجود تھے۔''[۱]

غرض یہ کہ ولؔی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد صوفیوں کو پایا تھا اور خود بھی حضرت علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ قدس سرہٗ سے دست بیعت ہونے کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب سے خاص اخلاص وعقیدت رکھتے تھے۔ ولؔی کے متصوفانہ میلان خاطر پر اس حقیقت سے کافی روشنی پڑتی ہے ڈاکٹر شارب ردولوی نے ولؔی کے صوفیانہ رجحان کے متعلق لکھا ہے۔

''ولؔی خود صوفی تھے انھوں نے احمد آباد میں شاہ نور الدینؒ سے درسِ سلوک لیا تھا۔ مشرباً سہروردی تھے۔ شاہ گلشن سرہندی متخلص بہ وجدت بن سید محمد سعید بن شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے (یعنی نقشبندیہ) علی رضا کے مرید تھے (جیسا کہ جمیل نے کہا شیخ شاہ علی رضا کو خرقۂ خلافت شیخ یحیٰی چشتی سے ملا تھا (چشتی ہوئے گویا تینوں سلاسل سے فیضیاب تھے) ولؔی نے صوفیانہ افکار کو یوں پیش کیا) عشق انسان کو کمال تک پہنچاتا ہے عشق محبوب حقیقی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس ذاتِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے اپنی ذات کو فنا کرنا ضروری ہے وغیرہ''۔[۲]

جیسا کہ ردولوی صاحب نے لکھا ہے تینوں سلسلوں کے بزرگوں سے ولؔی فیض پارہے تھے اس لئے اس صوفیانہ ماحول سے مستفیض ہونا یقینی بات تھی۔ چونکہ ولؔی اس صوفیانہ ماحول میں ہر وقت اور ہر گھڑی پرورش پارہے تھے۔ اس لئے صوفیانہ ماحول کے زیر اثر اس کے اثرات ولؔی کے دل ودماغ پر اس قدر گہرے مرتسم ہوئے تھے کہ اُنھیں خود اس بات کا شدّت سے احساس ہوگیا تھا کہ قربِ الٰہی کے لئے عشقِ حقیقی لازم ہے اور اس عشق کی پہلی منزل مجاز ہے اس لئے ولؔی کہتے ہیں۔

در وادیٔ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے

اوّل قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرنا

جیسا کہ حضرت وؔلی کا نام ہے اسی طرح ان کے نام کے اثرات مکمل اور بجا طور پر ان کی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں۔ وؔلی پر قلم اُٹھانے والے محققوں اور مورّخوں نے اپنی تمام قوتِ تحقیق اور تلاش وجستجو اُن کے نام اور وطنیت کے مسئلے کو سلجھانے میں صرف کردی۔ پھر اگر اس سے آگے بڑھے تو ان کے کلام کی تحسین اور ان کے محاسن بیان کرنے پر اکتفا کرلیا۔لیکن وؔلی کے ولی ہونے یا ان کی شاعری میں ایک صحیح روحانی تصور کی تجلّی ہے یا نہیں؟ یا وؔلی کی شاعری میں صوفیانہ عناصر کی تلاش وجستجو نے ان کے لبوں پر مُہر سکوت لگادی ہے۔ زیادہ تر محققوں نے ان کی شاعری میں عاشقانہ مضامین کو چٹخارے کے ساتھ پیش کیا اور اس کی عاشقانہ شاعری پر اپنی تمام توجہ مرکوز کردی اور ان کی غزلوں کو اتنا سراہا کہ وؔلی کی صوفیانہ شاعری پسِ پُشت پڑ گئی۔ اس لئے وؔلی کے کلام میں تصوّف کی ضوفشاں کرنیں کس قدر ہیں؟ وہ اکثر ناقدین ادب کو نظر نہیں آئیں۔ لہذا انھوں نے وؔلی کی زبان اور ان کی شاعری کو اتنی فوقیت دی کہ وؔلی کی شاعری میں صوفیانہ مضامین ہی نظر سے عُنقا (کمیاب) ہوگئے۔

اس طرح وؔلی صرف اپنے تخلص کے گنہگار نہیں بلکہ صحیح معنوں میں نہایت مہذّب سنجیدہ اور متین شخص تھے۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے زندگی کی بے ثباتی اور دیگر رموز کے بیان میں نہایت ہی واعظانہ انداز اختیار کیا ہے۔ جس سے ان کی انکساری، خوش اخلاقی اور خداپروری کی واضح شہادتیں ملتی ہیں۔ وؔلی کی دینداری، تقویٰ اور عشقِ الٰہی میں ان کی سرشاری اور خودسپردگی کا احساس ہوتا ہے۔ یوں وؔلی بادۂ تصوّف کے میخوار اور سرشار نظر آتے ہیں، جس کے سبب ان کے کلام میں شائستگی ولطافت کے ساتھ ایک نرم روی، بے نیازی اور درویشانہ قناعت کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل وؔلی کی ابتدائی تعلیم ہی اس طرز کی ہوئی تھی کہ ان کی طبیعت میں دینداری اور تصوّف کا غلبہ، حسن اور عشق کے مدّاح اور شیدائی ہونے کے باوجود ہرگز فنا نہیں ہونے پائی تھی، اور تصوّف کی یہ شمع وؔلی کے وجود میں ضرور جھلملاتی رہی تھی مگر کبھی بجھی نہیں تھی۔ لیکن جوں جوں عمر کا آفتاب ڈھلنے لگا اور ضعیفی کا ہلال بننے لگا اور جب زندگی کے چمن سے جوانی کی بہار رخصت ہونے کو تھی، تاہم خزاں کا سایہ ابھی پڑنے نہیں پایا تھا۔ عشقِ حقیقی کے وہ جذبات جو مدھم شور اور دھیمی دھیمی موجوں کے ساتھ ان کے وجود میں موجزن اور رواں تھے، آخری عمر میں اپنی پوری قوّت اور شدّت کے ساتھ ان کے وجود اور دل ودماغ

پر حاوی ہو گئے اور وہ کہہ اُٹھے۔۔۔

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

دراصل شباب کی بدمستیاں اور بے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم؟ کیوں کہ حُسن کے ترکش کے ایک ایک تیر کا نشانہ ان کے ذہن، دل و دماغ پر کس طرح لگتا ہے؟ اور اُن کا دماغ اِس حُسن سے کس قدر متاثر ہوتا ہے، اس کا احساس ان کے کلام کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ ولّی کی ابتدائی شاعری دراصل اسی نسوانی حُسن اور اس سے مرعوبیت کا ردِّ عمل ہے۔ ولّی نے حُسن کی شمشیر کو عریاں کرنے کے لئے شاندار لفظوں کے عقب میں حقیقتِ حُسن اس کی رعنائی اور دلکشی کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی وہ دیگر جسمانی خدّ وخال کے بیان میں بھی محو نظر آتے ہیں۔ اس لئے ولّی جب اپنی غزلوں میں اس حُسن کی ثناء خوانی کرتے ہیں تو ان کے بیان سے ایک لذّت کا احساس ہوتا ہے۔ جس کے عقب میں وہ خدا کی فنکاری کو سراہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یوں ولّی کے بیانِ حُسن سے اس کی رعنائی اور دل رُبائی کے نقش ثبت ہوجاتے ہیں۔

ولّی جیسا لفظ معنی کا یہ تاجدار حُسن کا بیان لفظوں میں جس جامعیت اور جس بلاغت کے ساتھ کرتا ہے یہ اُسی کا حصّہ تھا۔ دراصل ان کی اسی حُسن پرستی میں مجاز اور حقیقت دونوں کی سرحدیں ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ ''ولّی نے حُسن کو جسم کی جسمانیت سے بڑی حد تک آزاد رکھا ہے اور حُسن کی لطافت اور تابناکی کے تذکرے سے ان کا کلام بھرپور ہے۔'' ان کا خیال ہے کہ ''حُسن کو منزّہ اور مطہّر شکل میں پیش کر کے ولّی نے تصوّف کو حُسنِ مطلق کے تصوّر سے ہم آہنگ کردیا ہے۔'' اس طرح جذبۂ محبت کی یہ بوقلمونی وسیع تر ہوکر تصوّف کی روایت سے جاملی ہے اور بلاشبہ حُسن کا یہ ہمہ گیر احساس جو مجاز کی منزلوں سے ہوکر حقیقت کی بلندیوں تک چلا گیا ہے۔ ولّی کی تقریباً تمام اصطلاحات پر برنگِ تغزل ایک معنیٔ لطیف اور حُسن و جمال کو بزبانِ استعارہ وکنایہ ملفوظات کے ڈھنگ میں بیان کیا ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر احتشام حسین نے ان الفاظ میں کی ہے وہ لکھتے ہیں۔۔۔

''ولّی نے اپنی غزلوں میں زیادہ تر محبت کے جذبات کا بیان مختلف صورتوں میں کیا ہے یہ جذبۂ محبت وسعت اختیار کر کے مسلکِ تصوّف کا عشق بن گیا ہے۔''[۳]

چونکہ طریق تصوّف میں مجاز ہی پہلی منزل ہے اور عشق مجازی سے عشقِ حقیقی کا حصول صوفیائے اکرام کا

متبرک اصول تھا۔ اس لئے ولؔی نے بھی اپنے عشقِ حقیقی کے سفر کا آغاز اسی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اکثر مجاز کا پرتو حقیقت پر غالب نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جہاں اُنھوں نے تصوّف کو تغزّل کے رنگ میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ مجاز وحقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ولؔی کی شاعری بھی اسی قبیل کی ہے۔ انھوں نے کئی جگہ اعتراف کیا ہے کہ عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی کے بدولت حاصل ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا اور محبوب کا سراپا حرم اور روضۂ رسول میں بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ ولؔی کہتے ہیں۔

؎ زلیخا مجھے بولیاں کہ تو واقف نہیں عشقِ حقیقی سوں
تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشقِ مجازی کا

مجازی پہلو میں ولؔی کا محبوب کوئی فردِ واحد نہیں، بلکہ ہر وہ انسان ان کے لئے محبوب کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں ان کو حُسنِ ازل کا پرتو نظر آتا ہے۔ اس لئے حُسن کسی بھی صورت میں نظر آئے ولؔی اس کو بڑی شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی شدّتِ احساس ان کا عشق ہے جو ان کے قلب ونظر کی گہرائیوں کا حقیقی ترجمان ہے۔ لیکن بعض جگہ اپنے محبوبِ حقیقی کی ثناء خوانی میں ان کا مست الست ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے ولؔی کا عشق حقیقی تھا یا مجازی اس میں بھی ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ولؔی نے مجاز کو سامنے رکھ کر ہی حقیقت کی تلاش کی ہے۔ کیوں کہ عشق کی سب صورتیں مجازی ہی ہوتی ہیں۔ اس لئے مجاز کو سامنے رکھ کر ہی ولؔی نے اس کے سہارے حقیقت میں مقیّد ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اندازِ بیان کی یہ تصوّریت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی تعریف اور توصیف میں اس کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں یا تو وہ ان کا پیکر خیالی ہے، جس پیکر خیالی کے نقشِ تصوّر کو انتہائی طور پر محسوس کر کے انھوں نے ہمارے سامنے جلوہ گر کردیا ہے۔ یا وہ مجاز کے مختلف النوع دیگر پیکر ہیں، جن کو ولؔی حُسنِ ازل کا پرتو مانتے ہیں اور اس کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور جب کوئی پُرکشش ایسا پیکر نظر آتا ہے تو ولؔی اس کو حُسن ازل کا پرتو مان کر اس کی توصیف کے ترانے گانے لگتے ہیں۔ وہ جن لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں وہ محض اصطلاحی معنی میں ہوتا ہے علمی معنی میں نہیں۔ ڈاکٹر اعجاز مدنی نے تصوّف میں استعمال ہونے والی علمی اور شاعرانہ اصطلاحوں کے بارے میں لکھا ہے کہ۔۔۔

''صوفیائے اکرام کی اصطلاحات کو محققین نے دو اقسام پر منقسم کیا ہے ایک علمی اور

دوسری شاعرانہ

(۱) علمی اصطلاحات کی چند مثالیں یہ ہیں :- احدیت، وجدت، واحدیت، برزخ، عروج، نزول، وجود، شہود، تجدّد امثال، شکر وسحو، قبض وسبط، فناوبقا، احوال ومنازل، رنگ وکیفیات، صبر وشکر، تصوّر واستقامت، مداومت وغیرہ

(۲) شاعرانہ اصطلاحات کی چند مثالیں یہ ہیں :- قد، قامت، زلف، خط، خال، چشم، ابرو، رخسار، لب، دہن، میکدہ، پیرخرابات، ساقی، جام وسبو، دیروکعبہ، کفر وایماں، آئینہ، حیرت، محبوب، قرب ودوری، وصال وفراق وغیرہ''

وہ مزید لکھتے ہیں۔

''شاعرانہ اصطلاحات بھی نہایت بلیغ اور معنی خیز ہوتی ہیں اور عالمِ امکان میں ہر چیز عکس ہوتی ہے، ذات وصفات اور اسمائے الٰہی کا، یہاں ایک بھی شئے ایسی نظر نہ آئے گی جس کی اصل عالمِ بالا میں نہ ہو، ذات اور اسماء وصفات کا ظہور ہی صور ممکنات کے ذریعے ہوا ہے۔ صورتِ انسانی جامع ہے جمیع اسماء وصفات کی اور خلاصہ ہے جملہ صور واکنوان کا اور عالم امکان میں یہ تمام چیزیں (جن کا ظہور ہوا) مظہر ہیں واحدِ حقیقی کی'' [۴]

مذکورہ اصطلاحات جن کا تعلق شاعرانہ اصطلاحات سے ہے اردو شاعری کی ابتداء سے ہی عارفانہ خیالات کے لئے ان کا استعمال کیا جارہا ہے۔ اس طرح عارفانہ شاعری کے لئے فارسی کی طرح اردو میں بھی پہلے مثنوی کو شروع کیا گیا اور اردو میں بڑی اچھی مثنویاں عارفانہ خیال میں لکھی گئیں۔ ولیؔ سے پہلے مثنوی میں عاشقانہ مضامین نظم کئے جاتے تھے اس لئے یہ صنف بڑی بے وقعت تھی۔ فارسی میں احمد جامؔ پہلے شاعر تھے، جنھوں نے اپنے عارفانہ خیال کو غزل میں سمویا اور اردو میں ولیؔ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے عارفانہ خیال کو غزل میں پیش کیا۔ اس طرح غزل میں تصوّف کو جلا دینے کا اوّل سہرا ولیؔ ہی کے سر ہے۔ یوں ولیؔ نے اردو غزل ایک نیا پیراہن اور خلعت عطا کی اور صنفِ غزل کو اعتبار بخشا۔

اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ دکنی (اردو) زبان میں صوفیانہ خیالات ابتداء ہی سے پیوست تھے۔ اس ضمن میں دکن کی تاریخ میں بہت سارے صوفیائے اکرام جو دہلی اور گجرات سے آئے ان کے نام اور

نمایاں خدمات کا پتہ چلتا ہے۔ اسی لئے نظم ہو یا نثر دکنی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا غلبہ رہا۔ ممکن ہے کہ اس میں حکمرانوں کی فراخ دلی اور مذہب دوستی رہی ہو۔ ولی سے پہلے دکن میں بڑی تعداد میں صوفیائے اکرام کی موجودگی اور رہائش کی وجہ سے جگہ جگہ مدرسوں، خانقاہوں کی بنا پڑ چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی نثری اور شعری ذخیروں میں اور صوفیاء کے کلام کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس طرح ولی کے دور میں تصوّف کے حالات کے متعلق نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔۔۔

''ولی کے زمانے میں تصوّف کے خیالات عام ہو رہے تھے اور خود ولی نے صوفیانہ مسلک اختیار کرلیا تھا اس لئے اس کا کلام سراپا تصوّف ہے۔'' ۵

لیکن غزل ہی ایک ایسی صنف رہی ہے جو صوفیانہ خیالات سے عاری تھی اور اس میں صرف حُسن وعشق اور ہجر ووصال کے قصّے ہی نظم کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی سے پہلے دکن میں اردو غزل کو کوئی اہم مقام حاصل نہیں تھا۔ اردو غزل میں تصوّف کے متعلق نیاز فتحپوری رقم طراز ہیں۔

''اردو شاعری کی ابتداء دکن سے ہوئی جو نہایت قدیم زمانے سے فقر وتصوف کا مرکز رہا ہے۔ اس لئے ابتداء ہی سے اس میں صوفیانہ خیالات کی آمیزش ہوگئی اور رفتہ رفتہ صوفیانہ شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔ ۶

جیسا کہ ولی کا مولد ومسکن ابتداء سے صوفیاء کا مرکز رہا ہے وہیں ابتدائی تعلیم بھی صوفیوں کے گرد ''مدرسۂ علویہ'' (احمد آباد، گجرات) میں ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے ولی مذہبی آدمی تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں تصوّف کا در آنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے اشعار میں تصوّف کے باریک نکات قرآن حدیث اور دیگر تاریخی شواہد کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ قرآنی آیات ''سُبْحَانَ الَّذِیْ اِسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیلۃً مِنَ المَسجِدِ الْحرام اِلی المَسجِدِ الاَقْصٰی الَّذِی'' کو شاعرانہ قالب میں یوں ڈھالا ہے۔

؎ رات کوں آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیورِ لب سبحان الذی اسریٰ کرو

اسی طرح سورت الف، لام، میم کا ذکر اپنے شعر میں اس انداز میں کیا ہے۔

؎ دیکھا ہے قد وزلف ودہن جب سے یار کا
تب سے کیا ہے ورد الف، لام، میم کا

اس شعر میں غزل کی تمام تر خصوصیات پنہاں ہیں۔ اس طرح یہ شعر الف، لام، میم کے ذکر سے زیادہ محبوب کا ذکر بن جاتا ہے۔ مفسرینِ قرآن نے الف، لام، میم پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سے قطع نظر ولؔی نے اپنے محبوب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکامات سے سامع یا قاری کو اس طرف راغب کیا ہے۔

اسی طرح ولؔی نے ''معراج النبی'' پر اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔۔۔

گئے رات معراج عرش اُپر بلغ العلیٰ بکمالہ

کھلے پردے بھید کے سر بسر کشف الدُّجیٰ بجمالہ

ہوئی حق کی ان پہ سو جب نظر حسنت جمیع خصالہ

ہوا حکمِ حق محبّاں اُپر صلّوا علیہ وآلہ

ولؔی کے وطن اورنگ آباد میں ایک جگہ ''قدمِ رسول'' کے نام سے منسوب ہے یہ علاقہ موضع ''ساونگی'' اورنگ آباد سے متّصل ہے۔ مذکورہ ''قدمِ رسول'' سیّد فاضل شاہ قطبِ وقت سنِ ۲۴/۱۰۲۳ھ میں یہاں لے کر آئے تھے اسے محفوظ کرنے کے لئے سرکار کی طرف سے ایک قلع ارضی عطا کیا گیا تھا۔ جس کے اندر ایک چھوٹے سے چبوترے پر ''قدمِ رسول'' رکھا ہوا ہے۔ اس کے وسیع احاطے میں ایک بڑی خانقاہ بھی بنی ہوئی ہے جس میں دوطرفہ نو نو حجرے بنائے گئے ہیں۔ اس قدم رسول سے ولؔی اپنی عقیدت کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں

اُس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

اس طرح اس شعر کی اہمیت ایک تلمیح کی سی ہے ''قدمِ رسول'' سے جانکاری کے بغیر اس کے حقیقی مفہوم کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ صوفیانہ شاعری کا یہ وہ پہلو ہے جو قرآنی آیات، احکام خداوندی اور حضور صلعم سے عقیدت کا پتہ دیتا ہے۔ دوسرا نکتہ صوفیانہ غزل گوئی کا اس مخصوص پہلو سے ہے، جس میں شاعر دنیاوی حُسن سے متاثر ہوکر حُسنِ ازلی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس طرح صوفیانہ شاعری ٹھیٹھ عاشقانہ شاعری کا روپ اختیار کرلیتی ہے اور شاعر دنیاوی حُسن کو حُسنِ ازل کا پَرتَو سمجھ کر اس کے حُسن وجمال میں اپنے وجود کو کھو دیتا ہے۔ اس طرح تصوّف سے متعلق دو مکاتیب فکر ہیں۔

(۱) وحدت الوجود اور (۲) وحدت الشہود

وحدت الوجود سے مراد وجود کی یکتائی ہے یعنی تصوّف خدا کی بنیادی حقیقت ''یکتائی'' اور بندے کی جزویت کے فرق کو واضح کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔ انسان، جانور، چرند وپرند غرض کائنات کی تمام شئے خدائے عزّ وجل کی صفات کا مظہر ہے۔ اسے ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ پوری کائنات ہستی مطلق کی عین ذات ہے۔ ساحل احمد نے اپنی کتاب ''ولی۔فن شخصیت اور کلام'' میں خدا کی یکتائی اور بندے کی جزویت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔ بقول منصور کہ۔۔۔

''خدا اپنے انفراد کی حالت میں محبت کی روشنی سے منوّر تھا۔ اس روشنی سے اس کی صفات کا ایک سیلاب بہہ نکلا اور اس کا تنوع عالمِ وجود میں آگیا''۔ اس کے اس نظریے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا جو ایک ''کل'' تھا وہ مختلف اجزاء میں تقسیم ہوکر کائنات کی تخلیق کا موجب ہوا۔ یعنی کائنات کی ہر شئے خدا کے ''کُل'' سے جدا ہوئی شئے ہے جو اپنے ''کل'' یعنی خدا سے ملنے کے لئے مضطرب رہتی ہے۔ سورج کا نکلنا، پھولوں کا مہکنا، پانی کا بہنا، بیج کا اگنا، مٹی کا پھیلنا، دھوپ کا چمکنا، بادلوں کا ہمکنا، ہوا اور ستاروں کا چلنا وغیرہ اسی تحرک پسندی کی منسوبہ علامت ہیں۔'' [۷]

یعنی یہ کہ یہ تمام صفات حقیقی ہیں اور خدا اس کائنات سے الگ کوئی وجود نہیں ہے بلکہ وہ اس کے ذرّے ذرّے میں پنہاں ہے اس کا کوئی مقابل نہیں ہے اور وہ ہر صورت میں موجودِ واحد ہے۔ اس نظریۂ کے تحت انسانی زندگی کا مقصد انفرادی خودی کو ختم کر کے عابد کا معبود میں وصل ہوجانا ہے۔ اس نظریۂ کو ''ہمہ اواست'' (ہمہ اوست) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ عُلمائے ادب کے نزدیک اس فلسفے کی بنیاد وید اور قرآن کے شلوکوں پر رکھی گئی ہے اور اسلام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ علماء کے اس اختلاف سے قطع نظر اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے متصوّفانہ اشعار نہ کہے ہوں اور اس نظریئے کی ترجمانی نہ کی ہو۔ ابتداء سے ہی زیادہ تر صوفیا اسی نقطۂ نظر کے حامل رہے ہیں۔ چنانچہ اردو میں صوفیانہ شاعری کا بڑا حصّہ ''ہمہ اوست'' نظریئے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وحدت الوجود کے نظریہ کو ''محی الدین ابن العربیؒ'' (شیخ اکبر) نے اپنی کتاب ''فصو الحکم فتوحاتِ مکّہ'' میں اس نظریہ کو فنی حیثیت دی۔ انھوں نے اپنے اس نظریئے کو یونانی صوفیائے کرام کے افلاطونی نظریئے سے ملادیا۔ وحدت الوجود کو ماننے والوں کے مطابق ہر شئے خدا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی گویا اسی عقیدے کی تشریح ہے۔

دوسرا نظریہ ''وحدت الشہوذ'' کا ہے جسے ''شیخ احمد سرہندی'' مجد دالف ثانی نے پیش کیا ہے۔ انھوں نے ''ہمہ اوست'' کے نظریہ کو غیر اسلامی کہہ کر ردّ کردیا اور ''ہمہ اوست'' کو ''ہمہ از اوست'' میں بدل دیا ہے اور کائنات کو خدا کی تخلیق قرار دیتے ہوئے خدا کی ذات کو کائنات کے خالق کی حیثیت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔ خدا کائنات کے ذرّے ذرّے میں ہوتے ہوئے بھی اس سے ماورا ہے۔ وہ کائنات کو خدا کی تخلیق مانتے ہوئے اسے حقیقی اور ٹھوس قرار دیتے ہوئے جب کہ ''وحدت الوجود'' کا نظریہ اُسے محض ''واہمہ'' اور فریبِ حواس قرار دیتے ہوئے عابد کو معبود میں وصل ہوجانے کو اپنے نظریے کی انتہا مانتے ہیں۔ جب کہ شیخ احمد سرہندی جذب اور سرمستی اور بے خودی کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد ''قربِ الٰہی'' حاصل کرنا ہے۔ وہ قربِ الٰہی کے حصول کے لئے شرعی اصولوں کو لازمی گردانتے ہیں۔

اس نظریہ کی صد فی صد صداقت سے قطع نظر اردو یا فارسی کا کوئی بھی شاعر ''ہمہ از اوست'' کا ہم نوا نظر نہیں آتا۔ صوفی شاعر، خدا کی حمد وثنا، رسول کی عقیدت، کسی حدیث یا قرآنی آیات کی حد تک تو مجدّد الف ثانی کا ہم نوا نظر آتا ہے۔ پھر اس کے بعد صوفیانہ جذب اور سرمستی اور بے خودی میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ حال وؔلی کا بھی ہے، انھیں حسینانِ جہان میں حُسنِ ازل کا پَرتَو نظر آتا ہے وہ کہتے ہیں۔۔۔

درکار نئیں ہے مسجد مسجدے کوں عاشقاں کے
محراب تجھ بھواں کی اک قبلہ گاہ بس ہے

اور ایک شعر میں یوں فرماتے ہیں ۔۔۔

یوں مکھ ترا ہے مسجد بھواں ہے جیوں محراب
انکھیاں سوں جاکے میں عشق کی نماز کیا

یعنی وہ محبوب کے چہرے کو مسجد اور اس کے ابرو کو مسجد کی محراب کا استعارہ مانتے ہوئے اپنی نگاہوں کو ان کے چہرے پر گردش کرنے کو عشق کی نماز قرار دیتے ہیں اور اپنے اس والہانہ عشق کے اظہار میں واعظ کی مداخلت کو بے جا مانتے ہوئے فرماتے ہیں۔۔۔

وؔلی کوں ملامت مت کرا ے واعظ
ملامت عاشقوں پر کب روا ہے

وہ اپنی خشک مغزی کا علاج بھی معشوق کی آنکھوں میں پاتے ہیں وہ کہتے ہیں۔۔۔

؎ اے ولی کیوں خوش مغزی کا نہیں کرتا علاج
یاد ان کی انکھیاں کی تجھ کوں روغنِ بادام ہے

ولی ''ہمہ اوست'' نظریہ کے اس درجہ حامی ہیں کہ فرماتے ہیں کہ۔۔۔

؎ حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشقِ مزاجی ہے
وہ پائے شرح میں مطلب کوں جو بوجھے نہ متن ہرگز

ولی کی شاعری میں جمالیات کی حد درجہ فراوانی ان کے ''ہمہ اوست'' کے نظریئے پر حد درجہ قبولیت کی وجہ سے پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ناقدانِ ادب انھیں ''بت پرست'' کا خطاب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔

ولی کی شاعری کا بنظر غائر مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کے باطنی ہواش میں قوّتِ متخیّلہ پوری رعنائیوں کے ساتھ پیوست ہے جو ان کے ذہن میں موجود خیالات کو متحرک رکھتے ہوئے ذہن کو ایک لمحہ میں ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل کردیتی ہے اور وہ خیالات اس طرح گڈمڈ ہوجاتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بن جاتے ہیں۔ اور یہی تخّیلی قوّت صَور اور معنی کے خزانے میں موجود اشیاء میں تحلیل اور ترکیب ار تصرّف کے عمل سے نکل کر نئے خیالات اور معنی تخلیق کرتی ہے اور ایسے خیالات کو وجود میں لاتی ہے جنکا ہواشی تجربہ اور ادراک عملاً ممکن نہ وہ۔ولی کی تمام تر شاعری ایسے ہی خیالات اور تصوّرات کا آئینہ ہے جو ولی کو عظیم شاعر کی صفِ اوّل میں لاکر کھڑا کردیتی ہے۔ ولی کے مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ ہوا تجھ غم سوں جاری شوق کا طومار ہر جانب
ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب
تماشا دیکھ اے لیلیٰ کہ تیرے غم کی گردش میں
بگولے کی نمط پھرتا ہے مجنوں خوار ہر جانب

ان اشعار میں ولی نے اپنے مطالب کو روانی اور سلاست سے نہایت سادہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ولی کا عشق صوفیوں کی طرح گہرا ہوتا ہے اس لئے اپنے محبوب کی تلاش میں وہ خدا کو اپنا راہ بر سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ تلاشِ محبوب میں زندگی کے حُزن وملال اور کش مکش اور ناکامیوں کو سمجھاتے ہیں۔ اس لئے رنج ومصیبت میں

بھی اُنھیں ایک لطف آتا ہے۔ ولی صوفی المشرب، آزاد منش اور قانع ہونے کے باعث ان کی شخصیت سے نفس شعر میں بڑی ترقی ہوئی۔

ولی پہلے شاعر تھے جنھوں نے رنگین عاشقانہ مضامین اپنی شاعری میں باندھے لیکن اس پردے میں انھوں نے اصلی روحانی واردات کو قلم بند کیا ہے۔ اس لئے زندگی کے باریک حقائق اور رموز کی خوب تشریح کی ہے اور شعری اصطلاحات میں بظاہر زلف، لب، رخسار، جوبن، حُسن، رنگ، قامت سب ہی کچھ ہے، لیکن مخاطب بدل گیا ہے اور وہ اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے محبوب کے سراپے میں جلوۂ الٰہی دیکھتے ہیں۔ چونکہ اسلامی تصوف کی بنیادیں توحید، نبی سے عشق اور ان کی مکمل متابعت، خدمتِ انسانیت پر مبنی ہے اس لئے ایک مرتبہ عشقِ الٰہی سے انسیت پیدا ہوجانے پر دنیا کی حقیقت اس کے سامنے بے وقعت ہوجاتی ہے اس ولی فرماتے ہیں۔

ے جسے عشق کا تیر کاری لگے　　　اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　　کیا حقیقی کا و کیا مجازی کا

تصوّف کا سیدھا تعلق عشقِ الٰہی ہے اور ولی اس عشق کے مشغلے کو ضروری خیال کرتے ہیں چاہے اس کا تعلق مجاز ہی سے کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ مجاز بھی عشقِ حقیقی تک پہنچنے کی پہلی سیڑھی ہے اور اس کے منازلِ تصوّف چار ہیں: (۱) شریعت (۲) طریقت (۳) معرفت اور (۴) حقیقت

تصوّف کی پہلی منزل شعریعت ہے جس میں سالک خود کو عبادت اور ریاضت کے لئے وقف کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ طریقت کی منزل میں پہنچ جاتا ہے اور وہ عبادات جسمانی سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔ لیکن تصوّرِ حضرت باری تعالیٰ کا ہر وقت اور ہر گھڑی وہ اپنے دل میں رکھتا ہے۔ گویا اس طرح بھی وہ زندگی کا ہر لمحہ عبادت و ریاضت میں ہی بسر کرتا ہے (جیسا کہ ولی محبوب کے چہرے کو دیکھنے کو عشق کی نماز کہتے ہیں) اور اب اس کے دل پر ذاتِ الٰہی کی تجلیات منعکس ہونی شروع ہوتی ہیں۔ یہی منزل معرفت کی منزل ہے اس کے بعد حقیقت کی منزل آتی ہے جہاں پہنچ کر سالک ہمہ تن نظارۂ انوارِ خدا میں محو ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ولی کی صوفیانہ فطرت کا ثبوت ان کی شاعری میں اکثر جگہ ملتا ہے۔ بعض جگہ ولی کے کلام کی رنگینی سے سطحی نظر والوں کو عام عشق کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ایک صاحبِ نظر کو اس مجازی پردے میں حقائق و معرفت نظر آتے ہیں اور حُسن و عشق کا بیان دنیاوی رغبت کے باعث نہیں بلکہ

یہاں بھی مجازی الفاظ میں حقیقی معنی کا لطف مضمر ہوتا ہے، کیوں کہ شاعر اس حُسن کو خدا کے ''کُل'' سے جدا ہوئی جزوی شئے تصوّر کرتا ہے دوسرے لفظوں میں شاعر ''کُل'' سے علیحدہ ہوئے اس جزو میں بھی ''کُل'' کی صفات کا جلوہ دیکھتا ہے۔

ولؔی کے کلام کے عاشقانہ مضامین اپنی جو تڑپ دکھلاتے ہیں دراصل وہ اسی ''جزو'' سے متّصل ہو کر یا اس کے عشق میں خود کو فراموش کر کے اپنے معبود حقیقی (یعنی ''کل'') کی ذات میں متّصل ہوجانا متصوّر کرتے ہیں۔ یہ مقام تعجب نہیں کیوں کہ ولؔی قدرتی طور پر عاشق مزاج تھے اور ان کے کلام میں عاشقانہ مضامین خیالی نہیں بلکہ حقیقی اور اصل ہیں اور وہ اپنے محبوب میں دراصل محبوبِ حقیقی کی روشنی اور تجلّی دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہمہ وقت اس کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے ہیں اور کہتے ہیں۔۔۔

ہر ذرّہ عالم میں خورشید حقیقی کے
یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

میں اپنی آنکھوں کوں واللہ فرش خاک کروں
گزر جو میری طرف کوں وہ شہسوار کرے

دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں
جب بیخودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

ولؔی نے تصوّف کے رموز ونکات کو بڑی عمدگی کے ساتھ سمجھایا ہے۔ ان کی غزلوں میں تصوّف کا جو پَرَ تَو نظر آتا ہے وہ محض ذائقہ تبدیل کرنے کے رجحان کا حامل معلوم نہیں ہوتا بلکہ ان اشعار میں ایک صوفی کی تڑپ اور اس کے دل کا گداز نیز اس کی دردمندی اس کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں بہت سے ایسے اشعار نکل آتے ہیں جن میں ''ہمہ اوست'' کے نظریئے کی جھلک موجود ہے اور یہ اشعار روایتی طرز کے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جمیلؔ جالبی کی رائے ہے وہ فرماتے ہیں۔

''ولؔی کا عشق خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے اس نے عشقِ مجازی کے ان تمام پہلوؤں کا تجربہ حاصل کیا ہے جو ہند ایرانی روایت کے مطابق عشق کی پہلی منزل ہے''۔ [۸]

ولؔی کے اشعار کے باطن میں مجاز کا پردہ اُٹھا کر دیکھئے تو تمام اصطلاحات، تلمیحات، مضامین، واردات، جذبات وغیرہ عشقِ الٰہی میں کتنی شدّت اور تاثیر رکھتے ہیں۔ لیکن ہم سوچتے ہیں کہ حُسن پرست اور اپنے محبوب

کے جمال کے ترانے اور نغمے گانے والے کو بھلا تصوّف سے کیا کام؟ یہ سب صحیح ہے مگر زندگی صرف تعیش ہی کے سہارے نہیں گزرتی اور جب زندگی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے تو دنیا کی رونق اور حسیناؤں کے خوبصورت کے خوبصورت جسم اور ان کی کج ادائیں سب بے ہستی ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ زندگی کا ہر عیش وقتی اور نیستی ہے۔ اور عشقِ مولیٰ فکرِ عقبیٰ ہی مستی ہی مستی ہے۔ ولی کے تصوّف کے بارے میں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی رقم طراز ہیں۔۔۔

> ''ولی کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے غزل کے پیمانے میں حقیقت کی شراب کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے، اردو میں اس اعتبار سے ولی کا وہی درجہ ہے جو بلبل شیراز فارسی شاعر کا ہے۔ تصوّف ولی کی آگ وپے میں جاری وساری تھا اس کے جذبات اور کوچۂ عشق میں اس کے تجربے حقیقت پر مبنی ہیں۔ لہذا اس کا تصوّف رسمی و بے جان نہیں ہے۔'' 9

ولی نے اپنی شاعری میں اپنے ارضی محبوب (دراصل حقیقی) سے وصل کی بڑی شدید خواہش ظاہر کی ہے اور شاعرانہ سرمستی میں حُسن کی بادہ نوشی کر کے ان پر جو کیفیت طاری ہوئی اس میں محبوب کے رنگِ حِنائی میں تجلیِ الٰہی نظر آنے لگا۔ تو کہیں محبوب کی بھویں خانۂ خدا کی محرابیں نظر آنے لگیں۔ غرض ولی نے اپنے عارضی محبوب کو استعارہ بنا کر معرفت کے رموز، مشاہدۂ باطن کے اسرار اور قلبی واردات کا بیان بڑے ہی دلکش اور دل نشین انداز میں کیا ہے کہ بے ساختہ داد نکلتی ہے۔ انھوں نے عربی کے فقروں قرآنی آیات کے برمحل نظم میں بھی اپنا کمال دکھایا ہے۔

یوں ولی کا تصوّف عشق وجنون کا، خودسُپردگی اور وارفتگی کا اور ذاتِ الٰہی سے محبت اور وابستگی کا ایسا مرقع ہے جو اویس قرنیؓ اور حضرت بلالؓ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ولی کے عشقِ حقیقی کے جذبات وسرشاری میں بھی اس کی عشقیہ اور غنائی شاعری کی پوری گھلاوٹ موجود ہے۔ اس لئے ولی کے متصوّفانہ رنگ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ''یہ مشقِ سخن سے پہنائی ہوئی مضمون آفرینی اور صناعی نہیں، بلکہ بے ساختگی میں، اور خلوص وجذبہ میں جو بات پیدا ہوئی، وہ الہام کا، پاکیزگی وطہارت کا درجہ رکھتی ہے''۔ اس لئے کلامِ ولی میں ذاتِ حقیقی میں فنایت کا جو تصوّر ملتا ہے وہ کم ہی غزل گو شعراء کو نصیب ہوا ہے۔ کیوں کہ وہ صحیح معنوں میں عشقِ الٰہی میں سرشار ہوتے ہیں اور اپنی ذات کو خدا کے عشق پر قربان کرنے کو فوقیت دیتے ہیں جیسا کہ ولی فرماتے ہیں۔

؎ عشق میں لازم ہے اوّل ذات کو فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم ذات یزدانی کرے

ناقدینِ ادب نے جب بھی صوفیاء کے کلام کا تجزیہ کیا تب لب، رخسار، چتون، بوسہ، زلف، حسن۔ سراپا، انگڑائی، ابرو، جام، میخانہ، ساقی، منزل، ہجر ووصال کی اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات کو ہی دیکھتے ہیں، تو لامحالہ عشقِ مجازی اور عورت کے عشق کو تصوّر کر کے تنقید اور تہمت وبدنامی کے سوا کچھ نہیں کرتے اور اپنی ذات کو ایک اعلیٰ منصب صوفی کی جگہ تصوّر کر کے شاعر کو اس ضمن میں طفل مکتب ہی سمجھتے ہیں ۔ اور اس کے صادقانہ جذبات کو بھی بڑے ہی مشکوک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ ''اس کی شاعری میں عشقِ حقیقی کی تمنّائیت کا فقدان ہے اور اس کے خیال کے مرکز میں عشقِ مجازی ہی کارفرما ہے۔''
لیکن ولؔی کا کلام ناقدان کی اس تہمیت اور الزام تراشی سے محفوظ ہے اور ان کا تصور، تصوّف کے میعاروں پر پورا اترتا ہے۔ کیوں کہ کلامِ ولؔی عشقِ حقیقی ہے اور وہ نیکی کی زندگی بسر کرنے، جادۂ اعتدال سے قدم نہ ہٹانے اور دنیوی آلائشات سے دامن بچانے، دنیاوی جاہ ومنصب سے دوری، حصولِ راحت، جنت وحور سے پرہیز، اور عشق کی کل کائنات، متاع اور محبت صرف ذاتِ الٰہی ہی کو تصور کرتا ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے صوفی کے نزدیک وہ غیر اللہ ہے۔ ولؔی نے اپنے ان خیالات کو جو اُسے صوفی طرز کا ثابت کرتے ہیں انھوں نے اپنے مندرجۂ بالا خیالات کو اس طرح شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ نموتناً مندرجۂ ذیل اشعار پیش کئے جارہے ہیں۔

؎ ولؔی جنّت میں نئیں رہنا درکار عاشق کوں
جو مطالب لامکاں ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

؎ پایا ہوں ولؔی سلطنتِ ملک قناعت
اب تخت وچتر حق میں مرے ارض وسماں ہے

؎ یوں بات عارفاں کی سنو دل سوں سالکاں
دنیا کی زندگی ہے یوں وہم وخیال محض

؎ میں عشق سوں کیا ہوں تجھ دل کوں نرم آخر
ہر اک کا کام نہیں آہن گذار کرنا

ولؔی کے ان اشعار سے ان کی صوفیانہ شاعری کا نفس مضمون واضح ہوتا ہے اور یہ بات مترشح ہوتی ہے

کہ انھوں نے اپنے کلام میں عام انسانوں سے محبت، خلوص اور پیار اور دیگر پندونصائح کی جو باتیں کہیں ہیں وہ عجز وانکسار ایک بھلے اور مذہب شخص کے ہی ہوسکتے ہیں۔ چونکہ ولی نے اپنے گرد صوفیوں کا ہجوم دیکھا تھا اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ لہذا صوفیوں کے کردار، صفات اور اثرات اس کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں کہیں بھی ناراضگی یا خفگی کے اثرات نہیں ملتے۔ اس لئے ایک باعمل صوفی، عاشق صادق، اخلاق وکردار کے بے داغ، صورت وسیرت دونوں سے خدا نے آپ کو نوازا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے۔

ولی کی شاعری میں نہ تو کسی بادشاہ نہ امیر کی مدح ہے اور نہ ہی ذم اور نہ ہی آزار پہنچنے پر قفس کی خاطر بدلہ لینے کی خواہش، یہی فرق ہوتا ہے ایک دنیادار شاعر میں اور ایک عظیم صوفی میں۔ صوفی کی حیات بھی نفع پرور اور کلام بھی فیض رساں ہوتا ہے۔ ولی کا کلام عوام کو بہت سے پند ونصائح دیتا ہے، اپنی جامعیت کے لحاظ سے اردو کی متصوفانہ شاعری میں ولی کی شاعری سب سے زیادہ اہم ہے۔ ولی کے یہاں مجازی اور حقیقی کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں، دونوں ایک دوسرے میں شامل ہیں۔ کیوں کہ جو شاعر بھی اخلاق کو موضوع بنائے گا یا وجود کے مسئلے پر گفتگو کرے گا وہ چاروناچار تصوّف کے دائرے میں داخل ہو ہی جائے گا۔ ولی نے بڑی لطیف پیرایہ میں تصوّف کے تمام مضامین عالی کو نہایت واضح اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ولی چونکہ صوفیوں کے درمیان پروردہ ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی صوفیانہ شاعری اپنی وحدت میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اور رنگِ تصوف صرف اسی وقت بہار دکھاتا ہے جب دل عشقِ الٰہی سے زخمی اور خلقِ خدا (دنیاوی محبوب) کی بدسلوکی سے وجد حاصل کرے۔ وجود انسانی جب خستہ وگداز ہو جاتا ہے تو ترحم وایثار کا جذبہ از خودنفی ذات کر دیتا ہے۔ ولی کہتے ہیں۔۔۔

؎ اے آفتابِ طلعت دل پر مرے نظر کر
تا یک گھڑی میں آوے تجھ پاس مثل شبنم

غرض یہ کہ صوفی اپنے معبودِ حقیقی کے وصل کا تمنائی ہوتا ہے جیسا کہ ولی کے بالاشعر سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ اپنے ''کل'' سے وصل اختیار کر کے اپنے والہانہ عشق کا ثبوت دینا چاہتے ہیں اس طرح ولی کو صوفیانہ شاعری میں بے پناہ اثر ہے اور ایک ایسے عاشق کی آہ وبقا ہے جس کا روح وقلب مثل چتا کے جل رہا ہے۔ ان کے تمام اشعار عشق ونسبت کو، صبر وشکر کو، تسلیم ورضا کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کے اشعار عشقِ حقیقی کا پرتو ہیں۔

وؔلی نے آسان زبان میں صوفیانہ مسائل کو ایسے نظم کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تصوّف کا گہرا دریا ہے اور اشعار آبدار موتی ہیں۔ وؔلی نے دقیق سے دقیق مسائل کے لئے بھی وہی اپنی عام زبان اور سادہ انداز واسلوب استعمال کیا ہے۔ وؔلی کے ہاں لفظوں کی بہتات ہے جس میں انھوں نے اپنی قلبی کیفیات کا اظہار کیا ہے اور اس اظہار میں انھوں نے مجاز کے پہلو میں حقیقت کا رُخ تلاش کیا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وؔلی نے چاہے جتنی شاعری صوفیانہ رنگ میں کی ہو لیکن ایک صوفی ہونے کی وجہ سے تو وؔلی مر چکے ہیں، لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے عوام کے دلوں ودماغ میں آج تک زندہ ہیں۔

حواشی

باب چہارم (ب) :- ولی کی صوفیانہ شاعری

۱	ولی گجراتی (دیباچہ)	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	ص : و
۲	مطالعۂ ولی	ڈاکٹر شارب رودولوی	ص : ۳۱
۳	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر سیّد احتشام حسین	ص : ۴۳
۴	اردو غزل میں تصوّف ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر اعجاز مدنی	ص : ۷۸،۷۷
۵	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	ص : ۳۰۲
۶	اردو غزل میں تصوّف ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر اعجاز مدنی	ص : ۴۲۰
۷	ولی۔ فن شخصیت اور کلام	ساحل احمد	ص : ۵۶
۸	تاریخِ ادب اردو (جلد اوّل)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ص : ۵۴۵،۴۶
۹	ولی گجراتی ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۷۴ء	ص : ۲۳۰

☆☆☆☆☆☆☆

باب پنجم (الف)

ولؔی کا سفرِ دہلی

باب پنجم (الف)

وؔلی کا سفرِ دہلی

وؔلی کے متعلق یہ مفروضہ مشہور رہے کہ وہ اپنی زندگی میں ''جہاں گرد'' اور ''سیّاح'' واقع ہوئے تھے اور اسی سیّاحی کے شوق نے انھیں ''بگولہ صفت'' بنائے رکّھا تھا۔ وؔلی کی سیّاحی کے ضمن میں ان کا سفرِ دہلی اور گجرات بڑا ہی موضوعِ بحث بنا رہا ہے اور محققین حضرات نے مختلف زاویۂ نظر سے ان کے ان سفروں کا تجزیہ کر کے اپنی اپنی آرائیں دی ہیں۔ لیکن وؔلی کے مختلف مقامات کے سفروں میں سفرِ دہلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ وؔلی کے تمام سفر جن کو سیّاحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ دراصل شعر وسخن کے ذریعے ان کا ذریعۂ معاش کی تلاش تھی۔ اور اسی مرکزی نقطۂ نظر سے رزق کی تلاش کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وؔلی نے قصداً دہلی کا سفر کیا تھا۔ کیوں کہ وؔلی غالباً سنی العقیدہ تھے ایسا راقم الحروف کا قوی ماننا ہے۔ جب کہ وؔلی کے وطن دکن کی تمام ریاستوں کے تمام حکمران اور شاہان شیعہ تھے جس کی بدولت وؔلی کو یہاں مقامی ہونے کے باوجود کوئی داد وتحسین نہ مل سکی۔ اور شعوری طور پر ان سے تغافل برتا گیا۔

شاہانِ دکن کے اسی تغافل اور متعصّبانہ رویّہ کی وجہ سے وؔلی نے بسبب مجبوری اپنی اس کس مپرسی سے لامحالہ لاچار ہو کر اپنی نگاہیں دہلی اور شمالی ہند کی طرف مرکوز کیں۔ کیوں کہ وؔلی کے زمانے میں دہلی ہی دار السلطنت تھا۔ لہذا وؔلی نے بھی عیسوی سن ۱۷۰۰ء/ ۱۱۱۲ھ میں دہلی کا جو سفر کیا تھا وہ غالباً اسی ذریعۂ معاش کی بنیادی وجوہ پر مبنی تھا۔ اس سفر کی ابتداء سے پہلے وہ اورنگ آباد سے نکل کر پہلے احمد آباد (گجرات) آئے اور اپنے دیرینہ عزیز دوست سیّد ابو المعالی کو ھمراہ لیتے ہوئے دہلی کی طرف رجوع کیا۔ قاؔئم چاند پوری نے وؔلی کے اس سفرِ دہلی کے متعلق یوں لکھا ہے۔۔۔

''در سنہ چہل وچہار از جلوسِ عالمگیر بادشاہ ھمراہ میر ابو المعالی نام سید پسرے کی دلش فریضتۂ او بود، بہ شاہ جہاں آباد آمدہ'' ۔[1]

وؔلی کے اس سفرِ دہلی کے متعلق ساحل احمد لکھتے ہیں۔۔۔

''وؔلی نے دلّی کا پہلا سفر اپنے خوبصورت دوست ابو المعالی جس کے حُسن وقامت

کی جگہ جگہ تعریف کی ہے کے ساتھ ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں کیا تھا۔'' [۲]

ولی کے سفرِ دہلی کے موقع پر اپنے عزیز دوست سیّد ابو المعالی کو اپنے ساتھ لے جانے کی شاید یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ولی کے ہم عمر تھے۔ غالباً اسی وجہ سے اُن کے بڑے قریبی روابط ولی کے رہے ہوں گے تا کہ دہلی کا سفر پُر لطف اور خوشگوار حالات میں کٹ جائے، اور سفر کی کوفت کا احساس نہ ہو، اور ایک قریبی شناسا کے ساتھ ہونے سے ان کی اپنی ہمت بھی اپنے حصولِ مقصد کے لئے بلند اور بندھی ہوئی رہ سکتی تھی اس ضمن میں ڈاکٹر محی الدین زور صاحب رقم طراز ہیں۔

> ''ولی نے شعر و سخن کی وہ آباد محفلیں نہیں دیکھی تھیں لیکن ان کی نشانیوں کو اورنگ آباد کی گلی کوچوں میں منتشر ہوتے ضرور دیکھا تھا۔ دکنی شعر و ادب کے سر پرست امیروں، اور بادشاہوں کے دربار اُجڑ چکے تھے۔ ایسے دور میں ولی کی شاعری میں قلندرانہ خصوصیات کا پیدا ہونا فطری تھا۔ ولی طبعتاً بھی ایک قلندر تھا۔ دکن کی سیاسی افراتفری اور انتشار نے اس کو بھی آوارہ رکھا، وہ کبھی احمد آباد پہنچا، کبھی برہان پور اور کبھی شاہ جہاں آباد دہلی کی گلیوں، خانقاہوں اور بازاروں میں نظر آنے لگا۔'' [۳]

غرض یہ کہ ولی کا سفرِ دہلی جس کی بنیادی وجہ ذریعۂ معاش کی تلاش ہی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں شاعرانہ طبیعت رکھنے والے حضرات صرف شاعری ہی کیا کرتے تھے اور آمدنی کا دیگر اور کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے جب تک ایسا کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں مل جاتا جس کا براہِ راست تعلق کسی دربار، امراء یا رؤسا وغیرہ سے نہ ہو، اس وقت تک اس شاعر کی اپنی کوئی سماجی اور ادبی حیثیت مسلّم نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کیوں کہ یہ اس دور کا رجحان عام تھا کہ شاعرانہ طبیعت رکھنے والے شعراء کسی نہ کسی طرح شاہان کے درباروں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تگ ودو میں لگے رہتے تھے۔ حکمران یا دربار سے وابستگی اس شاعر کے لئے باعثِ فخر ہوتا تھا، اور سماجی اعتبار سے اُس شاعر کے وقار اور مراتب میں بھی اضافہ ہوجاتا تھا۔ نیز ضرورتِ زندگی کی تمام حاجتیں اسی اعلیٰ مقام سے پوری ہوجاتی تھیں۔ کیوں کہ شاہان کی طرف سے معیّنہ وضیفہ اتنا وافر اور کثیر ہوتا تھا کہ اُس شاعر کو ایک اچھی اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ نیز یہ کہ ضرورتِ زندگی کی ہر خواہش اس وضیفے سے پوری ہوجاتی تھی۔ اور فکرِ معاش کی پریشانیوں سے آزادی بھی۔

دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری ایک ملازمت یا پیشہ کا درجہ رکھتی تھی اور جو شاعر ہوا کرتے تھے وہ صرف

شاعری ہی کیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ کوئی اور کام کرنا یا کوئی دوسرا مشغلہ اختیار کرنا ان کے لئے باعث توہین اور تحقیر ہوتا تھا۔ اس لئے وہ بحیثیت شاعر ہونے کے اپنے مان اور مرتبہ سے اتر کر کسی دوسرے فعل یا امر کو اختیار کرے اور اُسے اپنا مقصدِ زندگی بنائے ایسا ممکن نہیں تھا۔ گویا یہ خیال اور تصوّر اس وقت بہت غالب تھا۔

جب کہ آج کے دور میں شاعری ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ملازمت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اوّلیت اس کام کو دی جاتی ہے جو ذریعۂ معاش کا سبب ہو۔ اس لئے ہمیں آج کے دور میں ایک مدرس بھی شاعری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح ایک وکیل، ایک مہندس اور ایک انجینئر بھی شاعر ہوسکتا ہے۔ غرض یہ کہ آج کے دور میں مختلف ملازمت پیشہ اختیار کرنے والے جن کا اردو ادب یا ادبی کام سے کوئی تعلق نہیں ہو وہاں، یا جو ادبی ملازمت نہ رکھتا ہو وہاں بھی شاعری کرنے اور اس کے ذریعے اپنے ادبی ذوق کو تسکین دینے والے شعراء حضرات ضرور مل جائیں گے جن کی فطرت میں خدا نے یہ فن اور صلاحیت ویعت کر رکھی ہے۔

اس لئے آج کے دَور میں شاعری کرنے والا شاعر دیگر ملازمت سے وابسطہ ہے اور وہی اس کا ذریعۂ معاش ہے اور وہ اُسے ہی اوّلیت دیتے ہیں۔ جب کہ شاعری اِن کے لئے دوسرے درجے پر ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے آج کے دَور میں ذرائع آمدنی سے شاعری کا کوئی سروکار نہیں۔ کیوں کہ موجودہ زمانے میں یہی تصوّر کارفرما ہے، جہاں شاعری فرصت اور فراغت کے اوقات کے لئے مخصوص ہوگئی ہے۔ لیکن ولؔی کے زمانے میں حالات اس کے برعکس تھے اور شاعری کو ایک ملازمت یا ذرائع آمدنی کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے اُس دَور میں شعراء حضرات اپنی اس سخن گوئی سے آمدنی یا ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے درباروں سے منسلک ہونا اپنی شان سمجھتے تھے اور اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر سفر بھی کیا کرتے تھے۔

ولؔی نے بھی غالبًا اپنی شاعری کے ذریعے ذریعۂ معاش کو مدِّ نظر رکھ کر دہلی کا سفر کیا تھا۔ ولؔی کے متعدد مقامات کے سفر کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔۔۔

”ولؔی ہوسِ سیر وسیاحت رکھتے تھے انھیں کسی ایک جگہ پر قرار نہیں تھا شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں اپنی حسِ سفر کو تسکین پہنچانے کے لئے گھومتے پھرتے تھے۔“ [۹]

راقم الحروف ولؔی کی سیر وسیاحت کے متعلق ڈاکٹر عبارت بریلوی صاحب کے اس بیان متفق نہیں، بلکہ ان کے اس سفرِ دہلی کے پیچھے غالبًا ان کے ذریعۂ معاش کا مدّعا ہی درکار ہے۔ اس لئے ولؔی ایک مقام سے

دیگر مقام کی خاک چھانتے رہے لیکن ان کو کسی دربار یا رؤسا یا امراء نے داد نہیں دی اور نہ ہی کسی سلطان کی قربت حاصل کرنے کا انھیں شرف حاصل ہوا۔ کیوں کہ ولی اپنی بے انتہا کوششوں کے باوجود بھی دہلی یا دکن کے درباروں تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ اسی لئے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام اس کوشش میں سرگرداں رہے۔ لہذا اپنی اس ناقدری کا انھیں بخوبی احساس بھی تھا جس کا اعتراف ان کے مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

ولی تیرے سخن یا قوت سے رنگیں ہوئے لیکن
خریداراں، جہاں بھیتر کہاں ہیں آج جوھر کے

رکھتا ہوں سینے میں ھزاروں گوھر معنی
دکھاؤں اپنے جوھر کو اگر کُئی جوھری آوے

سخن شناس کے نزدیک نہیں ہے کم ز یذید
کسی کے مطلبِ رنگیں کو جو کیا ہے شہید

گویا یہ کہ اگر ولی کی ''سیّاحی'' انھیں مجبور کر رہی تھی تو اس کا بنیادی مقصد معاش کی تلاش ہی تھی جو انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر مجبور کر رہی تھی اور اسی بنیادی وجہ سے ہمیں ولی کی ابتدائی زندگی کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی۔ کیوں کہ مستقل طور پر سفر میں رہنے کی وجہ سے ان کی رہائش اور آباء واجداد کے حالات، نام اور جائے پیدائش کے متعلق لوگوں کو کوئی علم نہ ہو یہ بات قابلِ یقین ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ اگر ولی کا تعلق اُس زمانے میں دکن کے کسی دربار سے وابسطہ ہوتا یا کسی اُمراء یا رؤسا تک قربت حاصل کرنے میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی ہوتی تو یقیناً ان کے متعلق ایسی معلومات ضرور ملتی جن کا تعلق ان کے نام ٹھام، جائے پیدائش یا جائے وفات سے ہوتا۔ لیکن چونکہ ولی اپنی زندگی میں ذریعۂ معاش کی پریشانیوں سے جہاں گردی اختیار کئے ہوئے تھے اسی وجہ سے ان کی زندگی متنازع فیہ بن گئی اور اسی سبب سے ایسی کوئی معلومات نہیں ملتی جنھیں قطعی اور یقینی کہا جاتا۔ اس لئے اٹکلوں اور سنی سنائی باتوں پر ہی اکتفا کرتے ہوئے بات کرنی پڑتی ہے۔

شاعری ذریعۂ معاش کا حصّہ اس زمانے تک رہی جب تک کہ بادشاہیت کا سلسلہ جاری رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں تمام حکمرانوں کے عہد میں دربار سے وابستگی رکھنے والے ''ملک الشعراء'' شاعر ہوا کرتے تھے اور شاہان خود اہلِ ذوق ہوا کرتے تھے اور شعراء، ادباء نیز دوسرے اہل فن کی قدر کرتے تھے۔

شاہان کی اسی سرپرستی اور قدردانی کی وجہ سے دکن میں خصوصاً اُردو شعر وشاعری کی تربیت وترقی شمالی ہند سے بہت پہلے ہوئی۔ غرض ایسے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جو ان سخن شناس اور علم پرور بادشاہوں کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ نیز یہ کہ شاہان بھی ان شعراء کی سرپرستی کو باعثِ فخر تصوّر کرتے تھے کیوں کہ اردو شاعری میں صنفِ قصیدہ نے اسی سبب عروج اور کمال حاصل کیا تھا۔ یہ شعراء حضرات ان شاہان کی مبالغہ آمیز مدح کر کے ان کی کرم فرمائیاں اور خوشنودی حاصل کیا کرتے تھے۔ لہٰذا شاہان کے لئے ایسے شعراء کی سرپرستی اپنی آن اور شان میں اضافے کا سبب بھی تھی۔ اس کے علاوہ شاعری چونکہ اس زمانے میں دل بہلانے کا بھی ذریعہ تھی گویا شعراء حضرات شاہان کی مدح اور تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے اور سامعین بھی شاعر کی اس شاعرانہ کوشش پر واہ واہ کر کے نعرے بلند کردیتے اور بڑھ چڑھکر داد بھی دیتے تھے۔

چوں کہ یہ اس دور کا رواج اور ایک عام چلن تھا اس لئے زمانے کے چلن کے مطابق یہ رواج یا شاعری ہر شاعر کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اسی سبب سے اس دور کے شعراء کے کلام میں قصائد کا وافر کلام ان کے شعری سرمایہ کے ذخیرے میں پایا جاتا ہے۔ ولؔی چوں کہ شاہان اور درباروں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہے اس لئے ان کے یہاں قصائد نہیں پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں یہ صنفِ قصیدہ نظر ہی نہیں آتا اور اس کا فقدان غالباً اسی وجہ سے ہے۔ جب کہ جن شاعروں کو دربار تک رسائی کی سعادت نصیب ہوئی ان کے یہاں قصیدہ کلام بڑی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ جب کہ ولؔی کی شاعری صنفِ قصیدہ (ایک دو مدحیہ قصائد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جو درمدح حضرت شاہ وجیہ الدین نور اللہ مرقدہٗ، درمدح حضرت میراں محی الدین قدس سرہٗ کی شان میں ہے جو اس ضمن میں نہیں آتے) سے محروم ہے۔ قصائد کا زمانہ تو ولؔی اور اس کے بعد کے زمانے تک، جب تک شاہان کی حکومت کا دور جاری رہا، قائم تھا۔ یہی سبب تھا کہ شعراء درباروں تک رسائی حاصل کرنے، مدحیہ قصائد لکھنے اور شاہان کی ثناء خوانی کرنے کے عمل میں محو رہتے اور اپنے اس عمل سے شاہان کی خوشنودی حاصل کر کے انعام واکرام کے طلب گار ہوتے تھے۔ اور یوں یہ سلسلہ اردو شاعری میں ذوؔق اور غالؔب تک پہنچتا ہے۔

ذوؔق جیسا کہ بہادر شاہ ظفؔر کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور جیسا کہ بیان کیا گیا کہ درباروں یا شاہان تک پہنچ یا رسائی حاصل کرنا شعراء کے نزدیک ان کی زندگی کا سب سے بڑا امر تھا اور یہ کامیابی گویا ان کی زندگی کے تمام مسائل کا حل تھی۔ غرض یہ کہ درباروں تک رسائی حاصل کرنے والے شعراء

حضرات پر دیگر شعراء بڑا رشک کیا کرتے تھے اور ان کی زندگی کو کامیاب شمار کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ غالبؔ جیسا بڑا شاعر بھی ذوقؔ کے دربار سے منسلک ہونے اور بہادر شاہ ظفرؔ کی استادی کا شرف حاصل کرنے پر رشک کر اُٹھے اور حسد سے یہ کہہ اُٹھے۔۔۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا تھی

غرض یہ کہ یہ تصوّر اس زمانے کا ایک دستور تھا اور شاعری ملازمت کا درجہ رکھتی تھی۔ شعراء وظائف پاتے تھے اور ان کی زندگی امن وامان سے گزرتی اور ذریعۂ معاش کی پریشانیوں سے آزادی بھی۔ جب کہ آج کے دور میں حالات اس کے بالکل برعکس ہو چلے ہیں۔ لیکن چوں کہ وقت اور حالات کے تحت ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح قصیدہ بھی دورِ حاضر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا اور یہ صنف تقریباً زوال پذیر ہو چکی ہے۔ اور اگر آج کوئی شاعر کسی اعلیٰ منصب دار یا اعلیٰ افسر کی مدح میں کلام کہتا ہے تو اُسے خوشامد یا چاپلوسی سے تعبیر کیا جائے گا، اور اس شاعر کی اس شاعرانہ جسارت کو فن کی حیثیت سے نہ دیکھتے ہوئے خوشامدانہ رویّے سے تعبیر کیا جائے گا، اور داد دینا تو درکنار جس شخصیت کے متعلق قصیدہ کہا جائے گا وہ بھی بے جا ان کے حسد اور نفرت کا شکار ہوگا، اور اگر کہیں کسی شاعر کا مدحیہ مجموعۂ کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے تو قاری فوراً قصیدے کی سُرخی دیکھ کر ورق دے گا اور شاعر کی اس کاوش کا مطالعہ تو دور اُس کے قصیدے کی سُرخی دیکھ کر ورق پلٹ دے گا، اور شاعر کی اس کاوش کا مطالعہ تو دور اُس کے قصیدے کلام پر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالنے کی دقّت گوارا نہیں کرے گا، جسے شاعر نے کتنی عرق ریزی سے تعمیر کیا ہوگا۔ یہ موجودہ دور کی صورتِ حال ہے جب کہ ولیؔ کے زمانے میں قصائد کا رواج عام تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ولیؔ نے بھی اس سلسلے میں قسمت آزمائی ضرور کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور وہ جس چیز کے متلاشی ہو کر دہلی کے سفر کو روانہ ہوئے تھے اور سفر کی شعوبتیں برداشت کی تھیں وہ رائیگاں ثابت ہوئیں۔

حالانکہ ولیؔ جیسا آزاد منش شخص اور شاعری کا مشغلہ رکھنے والا کسی ملازمت کا پابند بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ حالانکہ ولیؔ نے اس فنِ شاعری کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنانے کی کوشش غالباً ضرور کی تھی اور اسی کوشش کے نتیجے میں وہ سیّاحی کرنے پر مجبور تھے۔ ولیؔ کے بعض اشعار سے ان کی آزادانہ اور متوکلانہ زندگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس ضمن میں ولیؔ فرماتے ہیں۔۔۔

ے نین منصب وجاگیرنہیں روز وظیفہ
ہر روز ترا ذکر وظیفہ ہے ولی کوں

ے ولی کوں نہیں مسال کی آرزو
خدا دوست نہیں دیکھتے زر کی طرف

ان اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو انھیں کوئی منصب ملا تھا، نہ ہی جاگیر و وظیفہ، چنانچہ اس لئے ان کے کلام میں کسی رئیس یا امیر کی مدح نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ اگر ولی کو اس طرح کسی دربار، رؤسا یا اُمراء کی سرپرستی نصیب ہوئی ہوتی تو اُن کے کلام میں بھی یقیناً مدحیہ اشعار ضرور ملتے۔ البتہ یہ بات بھی یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ولی نے اپنی زندگی میں مستقل سیر وسیاحت جاری رکھی تھی چاہے ان کا ارادہ سیاحت کا رہا ہو یا نہ رہا ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ ولی کی آمدنی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ضرور ہی رہا ہوگا ورنہ اس طرح کے دور دراز ممالک تک سیاحت کا تصوّر ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ولی کی سیاحی کا بنیادی مقصد تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کسبِ معاش کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرتے رہے ہوں گے۔ برہان پور میں ان کے قیام کا ذکر حمید اورنگ آبادی نے کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔۔۔

''در بلدۂ دار السرور برہان پور نیز مدّتی سکونت داشت۔'' ۵

اسی طرح ولی کے ایک شعر سے بھی ان کی یہ سیاحی کا علم ہوتا ہے جو غالبًا ایک فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔ وہ فارسی شعر کچھ یوں ہے۔

ے بہارِ عمر ملاقات دوست داراں است
چہ خط برد خضر از عمر جاوداں تنہا

ولی نے غالبًا اسی فارسی شعر کو سامنے رکھ کر یہ مندرجۂ ذیل شعر کہا ہوگا۔

ے نہیں ہے سَر یک ساعت اگر باغِ جوانی میں
کہوں کیا خضر کو حاصل ہے عمر جاودانی میں

نفس مضمون یہ کہ ولی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی جب تک بادشاہیت کا سلسلہ جاری رہا، شعراء حضرات کی یہ نقل مقامی کسبِ معاش ہی کے نتیجوں میں ہوتی رہی ہے۔ کہیں شعراء اپنے کفیل کی تلاش میں سرگرداں رہے تو کہیں شاہان نے خود شعراء کو دربار میں آنے کی دعوت دی۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کیوں کہ

تقریباً ہر عہد میں شاہان نے شعراء کی سرپرستی اور ادب پروری کی مثالیں پیش کی ہیں۔ لہٰذا شاہان کی اسی ادب پروری کی ایک معمولی مثال وہ مشہور واقعہ ہے جو اکثر تاریخوں میں درج ہے کہ۔۔۔

— ''بہمن خاندان کے ایک بادشاہ سلطان محمد شاہ ثانی (۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۶ء) نے فارسی کے مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور وہ دکن کے ارادے سے نکلے اور جہاز میں سوار ہوئے لیکن بادِ مخالف سے گھبرا کر جہاز سے اُتر گئے اور معذرت میں ایک غزل لکھ بھیجی جو بہت مشہور ہے۔'' ۶؎

غرض راقم الحروف کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فنِ شاعری کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنانا اس وقت ایک عام چلن تھا۔ لہٰذا شاہانِ وقت نے بذاتِ خود اپنے دورِ حکومت میں اگر کوئی اچھا شاعر ہوتا تھا تو بادشاہ خود اُسے دربار میں طلب کرتے اور ''ملک الشعراءٗ'' کے خطاب سے نوازتے تھے۔ گویا یہ کہ شعراء کے لئے درباروں میں رسائی حاصل کرلینا اور شاہان سے ماہانہ یا سالانہ وظائف پانا یہ شعراء کے نزدیک گویا سب سے مہذب پیشہ یا ذریعۂ معاش تھا۔ یعنی یہ کہ اُس زمانے میں شاعری کا مشغلہ رکھنے والا کوئی بھی شخص فنِ شاعری کو ہی ذریعۂ معاش بنانا پسند کرتا تھا۔ جب کہ دوسری ملازمت سے وابستہ ہونا ان کے لئے باعثِ توہین ہوتا تھا اور وہ کسی دوسرے کام میں ملوّث ہونے کو پسند ہی نہیں کرتے تھے اور اگر خوش نصیبی سے کوئی موقع میسّر ہوجاتا تو ٹھیک ہے ورنہ ساری عمریوں ہی اسی کوشش میں گزار دیتے تھے۔ لیکن کسی دوسرے کام کو اپنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ غالبؔ کے ساتھ بھی یہی واقعہ رونما ہوا تھا کہ اِن کے زمانے میں انھیں معلّمی کی ملازمت تفویض کی گئی اور جائے ملازمت پر اس انگریز افسر جس کا نام ''مسٹر ٹامسن'' جو اُن دنوں حکومتِ ہند کے سکریٹری تھے۔ غالبؔ کی ان سے جو گفتگو ہوئی وہ اردو ادب میں ایک مشہور واقعہ ہے جو کچھ اس طرح ہے۔۔۔

''غالبؔ کی علمی استعداد اور فارسی دانی کا شہرہ سن کر ''دلّی کالج'' میں فارسی مدرس کی آسامی پر تقرر کی غرض سے انھیں طلب کیا۔ مرزا غالبؔ پالکی میں سوار ہوکر اُن کی جائے قیام پر پہنچے اور اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو ''مسٹر ٹامسن'' نے فوراً ہی بلوایا مگر یہ (غالبؔ) اس امید پر باہر ہی کھڑے رہے کہ صاحبِ موصوف خود ہی ان کے استقبال کے لئے آئیں گے۔ لیکن جب مسٹر ٹامسن کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ باہر آئے اور سمجھایا کہ اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں لٰہذا دربارِ گورنری والے سلوک کے مستحق نہیں، غالبؔ نے کہا میں تو یہ سمجھا تھا کہ گورنمنٹ کی ملازمت میرے اعزاز و توقیر میں اضافہ کا باعث ہوگی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس

ہے۔ صاحب نے کہا ''ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔'' غالبؔ نے معذرت کی، تو بندے کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔''

غالبؔ کے اسی مذکورہ واقعہ کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مزید وضاحت کے ساتھ رقم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ---

> ''۱۸۴۲ء میں غالبؔ کو دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی پیش کی گئی۔ مسٹر ٹامسن، جو ان دنوں حکومتِ ہند کے سیکریٹری تھے، انھوں نے یہ دیکھ کر کہ فارسی پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام کالج میں نہیں ہے، یہ حکم دیا کہ عربی کی طرح فارسی کا ایک مدرس بھی کالج میں ہونا چاہیے، مفتی صدر الدین آزردہؔ نے اس کام کے لئے غالبؔ، مومنؔ اور صہبائیؔ کے نام تجویز کیے۔ ٹامسن نے مرزا غالبؔ کو ملازمت کی دعوت دی غالبؔ ان کے پاس پہنچے لیکن چوں کہ وہ ملازمت کی غرض سے آئے تھے اس لئے ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی، غالبؔ کو یہ بات ناگوارا معلوم ہوئی، چنانچہ باوجود اس کے کہ اس وقت ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی انھوں نے ملازمت سے انکار کردیا۔ اس کے بعد یہ جگہ مومنؔ کو پیش کی گئی تو انھوں نے بھی اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا۔'' ے

الغرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنی شاعری کو ہی سب کچھ تصوّر کرتا ہے۔ گویا اس کے نزدیک فن شاعری ہی اس کے منصب اور مراتب کا اعلیٰ مقام ہے۔ اس لئے اگر وہ اسی بنیاد پر کسی رؤسا، اُمراء یا جاگیر دار سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان سے وظائف موصول کرتے ہیں تو یہ ان کی اپنی طبیعت کے پسند کا امر ہوتا ہے۔ جسے وہ اپنے لئے باعثِ فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ ورنہ دیگر کسی کام میں ملازمت اختیار کرنا ان کے حسبِ منصب گری ہوئی بات معلوم ہوگی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی معاشی بدحالی کو گوارا کر لیتے ہیں، لیکن فنِ شاعری کو ترک کر کے کسی دوسرے کام کو ذریعۂ معاش بنانا پسند نہیں کرتے۔ پھر چاہے فنِ شاعری کو کسبِ معاش بنانے کے لئے انھیں ملکوں ملکوں خاک ہی کیوں نہ چھاننی پڑے۔

اس لئے غالبؔ کے متعلق نقل مذکورہ بیان سے بھی اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ولیؔ کی سیاحی بھی کچھ انھیں نظریوں پر قائم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس معاملے میں بدنصیب ثابت ہوئے اور فنِ شاعری کو

کسبِ معاش بنانے کی خاطر اپنی کوششوں میں گجرات، برہان پور اور دہلی وغیرہ کی مسافت کرتے رہے۔

ولؔی سے قبل بھی شاعری کو ذریعۂ معاش بنانے کا غالب رجحان عام تھا اور شاہان باقاعدہ طور پر شعراء کو اس امر پر متعیّن بھی کرتے رہے ہیں۔ اپنے بیان کی دلائل میں راقم الحروف صرف دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس زمانے میں ایک شاعر کی علمی صلاحیتوں سے کام لینا بھی شاہان کی ایک طرح کی مجبوری تھی۔ کیوں کہ بعض سلاطین اپنے دور کی تاریخ لکھوانا چاہتے تھے۔ اس لئے شعراء حضرات کو ''تاریخ نویسی'' کے اس کام پر باقاعدہ معیّن کیا جاتا تھا، تاکہ اس کے عہد کی عمدہ تاریخ تحریروں میں محفوظ ہوجائے، تاکہ آیندہ آنے والی نسلوں اور زبانوں میں اس کا نام روشن اور باقی رہے، دیگر یہ کہ اپنے جنگی کارناموں کو رُزمیہ نظموں میں بھی شعراء کے ذریعے لکھوایا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی ہمت اور بہادری کا دبدبہ باقی رہے اور خود ان شعراء کے ذریعے شاہان کی بھی موقع بہ موقع پذیرائی اور ستائش ہوتی رہے۔ نیز دورانِ سال آنے والے تہواروں اور شاہی رسوم مثلاً : تاج پوشی، تولّدی، فتح وکامیابی، یومِ پیدائش اور شادی بیاہ نیز دیگر سماجی تہواروں پر بھی ان شعراء سے کام لیا جاتا تھا اور یہ شعراء حضرات ایسے خوشگوار مواقعوں پر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے درباری جشن اور دیگر تہواروں کی تقریبوں میں چار چاند لگادیتے تھے۔ جس سے ان شاہان کی زندگی سے وابسطہ رسوم میں ان کی خوشیاں دوبالا ہوجاتی تھی اور یہ کام تو صرف شعراء حضرات کے لئے ہی مختص تھا اور انھیں کا حصّہ بھی، اس لئے شاہان کو بھی شعراء کی سرپرستی کرنا ان کے لئے ایک لازمی جزو بن گیا تھا۔ لہٰذا شعراء کی غیر موجودگی ان سلاطینِ وقت کے لئے باعثِ تشویش بات تھی اس لئے بعض مرتبہ شاہان کے درباروں میں ہمیں ایک سے زائد شعراء بھی نظر آتے ہیں۔ اور جن میں ''ملک الشعراء'' کا درجہ سب سے افضل تھا۔ جس میں شاہانِ وقت کی طرف سے باقاعدہ طور پر یہ خطاب عطا کرکے دربار میں تقرر کیا جاتا اور بڑے بڑے وظائف مقرر کئے جاتے تھے۔ بعض مرتبہ کسی امرِ خاص کے لئے اجرت بھی طے کی جاتی جیسا کہ فارسی کے مشہور شاعر حکیم ابو القاسم فردوسؔی کو ''شاہ نامہ'' کی تصنیف کے لئے فی شعر ایک اشرفی مقرر ہوئی تھی اور انھوں نے تیس (۳۰) برس کے طویل عرصے تک اس امر میں دماغ سوزی کی اور ساٹھ ہزار (۶۰،۰۰۰) اشعار پر مشتمل ایک لازوال شاہکار ''شاہنامہ'' کی شکل میں پیش کیا۔

اسی طرح اردو کے مشہور ومعروف شاعر غالبؔ کو بھی تاریخ نویسی کے کام پر معمور کیا گیا تھا اور بہادر شاہ ظفؔر کے حکم سے خاندانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی کا کام ان کے سُپرد کیا گیا تھا۔ اور غالبؔ کو اس تاریخ نویسی کے لئے پچاس روپیہ ماہوار قلعۂ بہادر شاہ ظفؔر میں باقاعدہ ملازم رکھا گیا تھا اور انھوں نے اس خاندانِ تیموریہ کی

تاریخ ''مہر نیم روز'' اور ''ماہ نیم ماہ'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔

غالبؔ کے لئے بہادر شاہ ظفر کے دربار تک رسائی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس تاریخ نویسی کے کام پر معمور ہونے سے قبل وہ دربار تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مختلف لوگوں سے سفارش کرتے رہے تھے اور پھر بڑی مشکل سے وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے ---

''غالبؔ نے قلع سے تعلق پیدا کیا اور میاں کالے خاں صاحب اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ان کی رسائی بہادرشاہ تک ہوئی اور انھوں نے تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سُپرد کیا اس طرح وہ قلعے میں باقاعدہ ملازم ہوگئے۔'' [۸]

مذکورہ دلائل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ولیؔ سے قبل بھی فنِ شاعری کسبِ معاش کا ایک ذریعہ تھی اور ولیؔ کے بعد بھی جب تک ہندوستان میں بادشاہیت کا سلسلہ قائم رہا یہ دستور بھی قائم رہا اور بادشاہیت کے خاتمے کے ساتھ فنِ شاعری ملازمت کے لئے مختص نہ رہی اور اس کی حیثیت ثانوی ہوگئی جیسا کہ عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی ایک معلّم تھے اور اکبر الہ آبادی جج کے عہدے پر فائز تھے اور آگے چل کر علّامہ اقبال بھی درس وتدریس سے جُڑے رہے تھے۔

لیکن چوں کہ ولیؔ اور اس کے بعد کے زمانے تک جب تک بادشاہیت باقی رہی تھی، وہ شعراء جو فنِ شاعری کو ذریعۂ معاش کے لئے ضروری سمجھتے تھے وہ شعراء شاہان، امراء یا رؤسا سے ایسی توقعات رکھتے تھے کہ وہ ان کی پذیرائی کریں تاکہ غم روزگار کی پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے اور ولیؔ چوں کہ اس سے محروم رہے تھے اس لئے وہ اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی سیّاحی کو اسی فنِ شاعری سے معاش کی تلاش سے جوڑنا قطعی غلط نہیں ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد کیا جاسکتا ہے کہ ولیؔ کی زندگی خوشحال اور شاداب نہیں تھی اور وہ معاشی تنگ دستی کا شکار تھے اور اس تنگ دستی کو دور کرنے کی غرض سے وہ اپنی فنِ شاعری کو معاش کا ذریعہ بنانے کے لئے یہاں سے وہاں آتے جاتے رہے۔

اس لئے جن حضرات نے ولیؔ کی سیّاحی کو ان کے ذوق اور سیر وتفریح سے جوڑا ہے وہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ایسے شعراء جن کا تعلق کسی دربار، اُمراء یا رؤسا سے نہیں رہا ان سبھی کی مالی حالت نہایت خستہ تھی۔ صرف ولیؔ ہی اس تنگدستی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ایسے تمام شعراء جو ان کے بعد ہوئے مثلاً، حاتمؔ، آبروؔ، میرؔ اور غالبؔ وغیرہ بھی مفلوک الحالی کا شکار ہوئے اور دہلی کے اُجڑنے کے بعد فنِ شاعری سے

معاش کی تلاش میں لکھنؤ کی سرزمین پر وارد ہوئے۔ وہ ایک ایسا ہی زمانہ تھا جب لکھنؤ میں دوسرا دہلی آباد ہوگیا تھا۔ غرض یہ کہ شعراء کی یہ نقل مکانی کی وجہ رزق کی تلاش تھی اور جو ان کی شاعری پر منحصر تھی۔ اس لئے وؔلی بھی مستقل طور پر اسی رزق کی تلاش میں دہلی وارد ہوئے تھے اور ان کا دہلی جانا کسی طرح بھی ان کی سیاحی پر محمول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ وؔلی کی مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی سراغ اور ثبوت ملتا ہے کہ وؔلی اقتصادی اور معاشی اعتبار میں بہتر حالت میں تھے۔ وؔلی کو مالی استطاعت اور سیاحت کے متعلق قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی لکھتے ہیں۔

"وؔلی کی بافراغت زندگی اور ان دور دراز ملکوں کی سیاحت سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ ان کی مستقل آمدنی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور رہا ہوگا۔" ۹

قاضی صاحب کا یہ مذکورہ بالا بیان حالاں کہ قیاس پر مبنی ہے لیکن ایسا کوئی سُراغ آج تک میسّر نہیں ہوا کہ وؔلی فارغ البال زندگی گزار رہے تھے۔

یہاں اس موقع پر وؔلی کی سیاحت کو فارغ البالی سے تعبیر دینا درست معلوم نہیں ہوتا حالانکہ راقم الحروف نے اپنے مضبوط دلائل سے اس کی تردید کی ہے۔ کیوں کہ سیاحت یا مختلف مقامات کی آمد و رفت کی وجہ صرف فارغ البالی ہی نہیں ہوسکتی بلکہ ذریعۂ معاش کی تلاش بھی تو ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ یہ روایت وؔلی کے بعد تک جاری رہی۔ کیوں کہ مرزا غالبؔ کی تنگ دستی اور مفلوک الحالی بھی تو مشہورِ زمانہ ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط اور دباؤ سے غالبؔ کی پینشن بند ہوئی اور اپنی پینشن کو دوبارہ جاری کرانے کی غرض سے انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا تو دہلی اور کلکتہ کے درمیان موجود بہت سی ریاستوں جن میں کانپور، لکھنؤ، بنارس اور پٹنہ اور الہٰ آباد وغیرہ میں قیام کیا۔ غالبؔ چاہتے تو سیدھے بھی کلکتہ جاسکتے تھے لیکن غالبؔ کا ان ریاستوں میں قیام کا مقصد اپنی پذیرائی اور وظائف حاصل کرنا تو تھا ہی ساتھ ہی اس سفر کے درمیان آنے والے مقامات کے رؤسا، اُمراء اور جاگیرداران کے شایانِ شان قصائد پیش کر کے ان سے کچھ تحائف یا نقدی وظیفے کی شکل میں مِل جائے یہ بھی تھا۔ غرض یہ کہ ان مقامات پر رُکتے رُکاتے اور قصائد پیش کرتے جانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ کچھ وظائف ہاتھ لگ جائے، اس سفر کے دوران الہٰ آباد سے انھیں کوئی داد و تحسین نہیں ملی۔ اس لئے غالبؔ نے اس شہر کو بسبب جلن "بد اخلاق اور غیر مہذب شہر" کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں شعراء کی قدردانی کرنے والا کوئی نہیں یا اس شہر کی ادبی اہمیت ختم ہوگئی۔ یہ اور بات ہے

کہ یہاں کے باشندگان نے غالبؔ کو کوئی داد نہیں دی۔

اُس زمانے میں ولیؔ کی یہاں سے وہاں آمد ورفت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس زمانے میں ان کی حیثیت ایک عام شاعر کی تھی اور انھیں وہ مقبولیت نہیں ملی تھی جو ان کے انتقال کے بعد ان کے حصّے میں آئی۔ اگر ولیؔ اپنے زمانے میں بلند پایہ شاعر کے معروف ہوتے تو ان کی شاعری چرچے ضرور شمالی ہند تک ہوتے اور بہت ممکن تھا کہ ولیؔ کا کسبِ معاش کی تلاش میں دہلی میں پہنچنا ہوتا اس سے قبل ہی ان کی آمد کا وہاں انتظار ہوتا اور اس دور کے رؤسا یا امراء ان کی پذیرائی ضرور کرتے، لیکن ولیؔ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، غالباً اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک غیر معروف شاعر تھے اور ان کی کوئی ادبی حیثیت مسلم نہیں ہوئی تھی۔ یا شاید ان کے کلام میں اس وقت اتنی اثر آفرینی اور دلکشی پیدا نہیں ہوتھی کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر پاتی۔ اس ضمن میں ساحل احمد لکھتے ہیں ---

''ولیؔ کا یہ سفر دہلی نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی وفکری رویّہ کا بھی سفر تھا جس سے نئے انقلابی رویّہ کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی شاعری میں نئے موڑ کی تجدید ہوتی ہے۔'' ۱۰

جیسا کہ ساحل احمد کا خیال ہے کہ ولیؔ کا یہ سفرِ دہلی ان کی شاعری میں نئے موڑ کا سبب واقع ہوا ہے موصوف کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس سفرِ دہلی کو لے کر جو تلخ تجربات ہوئے ہوں گے اور انھوں نے جو بھی مشاہدہ کیا ہوگا، اس نے ولیؔ کے سوچنے کے انداز وافکار کو یکسر بدل دیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کا رُخ نئی منزلوں اور نئی راہوں کی طرف رواں کردیا۔ کیوں کہ یہاں سے واپسی کے بعد ہی ولیؔ کی شاعری میں انقلابی آہٹ کا شور سنائی دیتا ہے۔ محمد حسین آزادؔ لکھتے ہیں۔

''ان (ولیؔ) کے پاس سیاحی اور تجربے کا توشہ یہی معلوم ہوتا ہے۔'' ۱۱

غرض یہ کہ ولیؔ نے اپنی زندگی میں جو سیاحت کی اس کا مقصد شعر وسخن سے معاش کی تلاش ہی تھی اور مختلف مقامات کی سیاحت کے بعد انھیں جو تجربات حاصل ہوئے اس نے ولیؔ کی شاعری کو سماجی زندگی سے جوڑے رکھا اور شاید وہ ذریعۂ معاش کے تلخ تجربات ہی ہوں گے جس نے ولیؔ کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہوگا۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

باب پنجم :- ولی کا سفرِ دہلی

۱	مخزنِ نکات	قائم چاند پوری	ص : ۲۱،۲۲
۲	ولی ۔فن شخصیت اور کلام	ساحل احمد	ص : ۵۱
۳	ادبی تحریریں	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ص : ۶۳،۶۴
۴	ولی کی شاعری ڈاکٹر عبادت بریلوی	ولی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ: محمد خان اشرف	ص : ۹۶
۵	گلشنِ گفتار	حمید اورنگ آبادی	ص : ۹۲
۶	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ص : ۱۰
۷	غالب اور مطالعۂ غالب	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ص : ۱۴/۱۵
۸	ایضاً	,, ,, ,,	ص : ۱۶
۹	ولی گجراتی	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی	ص : ۱۳۷
۱۰	ولی ۔فن شخصیت اور کلام	ساحل احمد	ص : ۵۲/۵۳
۱۱	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	ص : ۸۴

☆☆☆☆☆☆☆

Chapter-5/ Part-2

باب پنجم (ب)

ولیؔ اور شاہ سعد اللہ گلشنؔ

باب پنجم (ب)

ولی اور شاہ سعد اللہ گلشن

اردو ادب میں ولی کی حیثیت غزل کے بنیاد گزار کی ہے۔ اس لئے جب بھی ولی کی غزل گوئی کا چرچا ہوتا ہے تو وہاں ولی کی شاعری کو نیا موڑ دینے میں ''شاہ سعد اللہ گلشن'' کے مشورے کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن اوردو کے شاعر نہیں ہیں بلکہ فارسی کے شاعر ہیں۔ لیکن اردو ادب میں ان کی اہمیت اس لئے بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے (جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے) کہ انھوں نے ''ولی'' کو اردو میں سخن گوئی کا مشورہ دیا جس کی بنا پر ولی کی شاعری کا رنگ، لہجہ اور طرزِ ادا تبدیل ہوا اور ان کے اسی مشورے پر چل کر ولی نے اردو غزل کی نئی روایت قائم کی۔ گویا یہ کہ ولی کی غزل گوئی کی بنیادوں میں شاہ گلشن کے مبینہ مشورے کا بڑا عمل دخل ہے جس کی بنا پر ولی نے اپنی شاعری کو جلا دی۔

غرض یہ کہ ولی اردو کے ایسے بدنصیب شاعر ہیں جن کی شاعری اور عظمت کو ''شاہ گلشن'' کے مشورے کی مرہونِ منت بتایا گیا ہے اور اس طرح ولی اور ان کی شاعری پر گفتگو کرنے والے ہر محققین نے ولی کی شاعرانہ عظمت کو ''شاہ گلشن'' کے مشورے کا گراں بار بتایا ہے۔ آج ہم اردو غزل کو جن بلندیوں پر دیکھ رہے ہیں اُسے اس معیار اور مرتبے تک پہنچانے میں ولی کا ناقابلِ فراموش حصّہ رہا ہے۔ ولی ایک ایسے شخص ہیں جو اردو شاعری اور اردو غزل دونوں کے بانی ہیں اور جن کے سر پر اردو غزل گوئی کی اوّلیت کا تاج رکّھا جاتا ہے۔ یوں وہ شاعرِ اعظم جس نے اردو غزل کی بنیادوں کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ہو بھلا اس کی شاعری میں کسی کے مشورے کا کیا عمل دخل ہوسکتا ہے؟ اسی طرح ولی اور شاہ گلشن کے متعلق یہ بیان بھی ملتا ہے کہ ''شاہ گلشن'' نے ولی کو جو مشورہ دیا اُسی کے ساتھ تبرک اور نمونے کے طور پر ولی کو اپنی ''ریختہ'' میں کہی ہوئی ایک غزل بھی دی تھی جو آج بھی ''دیوانِ ولی'' میں موجود ہے۔ اسی طرح ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کی یہ روایت اپنے دورِ آغاز سے آگے بڑھتے بڑھتے کسی تذکرہ نگار نے ولی کو ''شاہ گلشن'' کا شاگرد تک ٹھہرا دیا۔

اس باب میں آگے بڑھنے سے قبل ولی اور شاہ گلشن کے تعلقات کی نوعیت اور شاہ گلشن سے ولی کی پہلی

ملاقات کب، کہاں اور کن حالات میں ہوئی ؟ یہ جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ وؔلی دکن کے باشندے ہیں اور طویل عرصے تک ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) میں سکونت پذیر تھے۔ مطلب یہ کہ وؔلی کی زندگی کا بیشتر حصّہ انھیں دونوں مقامات میں گذرا ہے جب کہ شاہ گلشن سے ملاقات دہلی میں ہوئی تھی اور وہ بھی اس وقت جب وؔلی پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں اپنے دوست سیّد ابو المعالی کے ھمراہ دہلی گئے تھے۔ کہاں دکن کا خطّہ، کہاں گجرات اور کہاں دہلی۔ اگر ہم ہندوستان کے نقشے پر غور کریں تو تینوں مقامات الگ الگ جگہوں پر آئے ہوئے ہیں۔ اور ایک شخص (وؔلی) جس نے کبھی شاہ گلشن کو دیکھا نہیں اپنی پہلی ہی ملاقات میں وہ شاہ گلشن کے اتنے عزیز ہوگئے کہ انھوں نے وؔلی کو ''ریختہ'' میں سخن گوئی کا مشورہ دے دیا؟ اس قسم کے مشورے کی بنیاد اگر شاہ گلشن سے وؔلی کے قدیم مراسم سے ہوئی ہوتی تو اس مشورے کی بات کو بلا جھجک تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی رہتی۔ لیکن اس ملاقات کو نوعیت بالکل ہی نئی اور انوکھی ہے اس لئے آیئے اوّل شاہ سعد اللہ گلشن کے متعلق معلومات لیں تا کہ وؔلی سے ان کی ملاقات کی حقیقت کو بآسانی سمجھا جاسکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہ گلشن کے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں اس کا خلاصہ مندرجۂ ذیل ہے۔

> ''شاہ گلشن (۱۷۲۷ء تا ۱۶۶۴ء) کے اسلاف اکبر بادشاہ کی فتح گجرات کے بعد برہان پور آگئے تھے۔ شاہ گلشن یہیں سے دہلی آئے اور صاحب ''کلیات الشعراء'' محمد افضل سرخوش سے مشقِ سخن کرنے لگے، بعد میں بیدؔل سے وابستہ ہوگئے ''کلیات الشعراء'' کے ان الفاظ سے کہ ''طبع درست رکھتا ہے'' اور تذکرے کے ایک اور قلمی نسخے کے الفاظ سے کہ ''آزادانہ طبع وصاحبِ فکر جوان ہے''، سات آٹھ سال میرے سامنے مشق کی ہے'' یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ جوانی میں ہی دہلی آگئے تھے یہاں کچھ عرصے قیام کر کے وہ ''ارادۂ سیاحت'' سے نکل کھڑے ہوئے اور ''۲۲ رسال احمد آباد، گجرات و اورنگ آباد اور دوسرے بلادِ دکن میں گھومتے رہے اس کے بعد بیس سال دہلی میں رہے اور یہیں ۱۷۲۷ء میں وفات پائی۔''[۱]

شاہ گلشن ۱۶۶۴ء میں تولّد ہوئے اور جیسا کہ وؔلی کا سالِ ولادت ۱۶۶۸ء ہے اس اعتبار سے دونوں ہم عصر اور ہم عمر بھی ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ شاعری کی خداداد صلاحیتوں کے مالک بھی ہیں تو بھلا کیا یہ بات قابلِ فہم ہوسکتی ہے کہ وہ وؔلی کو ''ریختہ'' میں شاعری کرنے اور فارسی کے بیکار مضامین کو اردو کے قالب میں

ڈھالنے کا مشورہ دیتے ؟ اس ضمن میں ولؔی کی شاہ گلشن سے ملاقات، مشورت، ولؔی کا اس مشورے پر عمل درآمد ہونا، دیوانِ ولؔی کی ترتیب وتدوین اور پھر ولؔی کے دیوان کے دہلی آنے اور قبولیتِ خاص وعام حاصل کرنے تک کے واقعاتی تسلسل میں ایسے کئی مقام آتے ہیں جن پر گذشتہ صدی میں کافی بحثیں ہوچکی ہیں۔ لیکن اس عقدے کا کوئی قطعی حل یا انکشاف کرنے سے محققین حضرات قاصر رہے ہیں اور جیسا کہ ہماری بحث کا موضوع ولؔی اور شاہ گلشن کے مشورے سے ہے، اس لئے اپنے اس مرکزی نقطہ پر بات کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہوجاتا ہے کہ ولؔی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات اوّل کہاں سے رواج پائی ؟ اس ضمن میں تلاش وجستجو کے لئے اوّل اوّل ہماری نگاہیں انھیں اوراقِ پارینہ یعنی تذکروں پر منحصر ہوجاتی ہیں کہ جہاں پہلے پہل ان کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے۔ جب ہم مختلف تذکروں کی ورق گردانی کرتے ہیں جن میں ولؔی کا ذکر ملتا ہے تو وہیں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''ولؔی اور شاہ گلشن'' کے مشورے کی بات سوائے میر تقی میؔر صاحب کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' کے کہیں اور نہیں ملتا۔ آیئے دیکھیں کہ میؔر صاحب کیا فرماتے ہیں۔۔۔

> ''شاعرِ ریختہ از خاکِ اورنگ آباد است۔ میگویند کہ در شاہجہاں آباد، دہلی نیز آمدہ بود، بخدمت میاں گلشن صاحب رفت، واز اشعارِ خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود، ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختۂ خود بکار بُبر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔ از کمالِ شہرت احتجاج تعریف ندارد، واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست۔''[۲]

غرض یہ کہ میؔر صاحب کا مندرجۂ بالا بیان اس ضمن میں اپنی اوّلیت کا حامل ہے۔ میؔر صاحب کا بیان ہے کہ ولؔی شاہ گلشن کی خدمت میں پہنچے اور اپنا کلام سنایا تو میاں گلشن صاحب نے فرمایا کہ فارسی میں جو مضامین بیکار پڑے ہیں ان کو اپنے ''ریختہ'' میں کام میں لاؤ تم سے کون باز پُرس کرے گا ؟ اس طرح میؔر صاحب کے اسی بیان کو بنیاد بنا کر اس کے بعد لکھے گئے تذکروں میں اسی سے روشنی لی جاتی رہی ہے۔ میؔر صاحب کے بعد قائؔم چاند پوری نے ولؔی اور شاہ گلشن کو ملاقات کا حال لکھتے ہوئے اس میں مزید اضافہ کیا وہ لکھتے ہیں کہ ''شاہ گلشن'' نے ولؔی کو ریختہ میں شعر کہنے کا حکم دیا اور یہ مطلع

ع خوبیِ اعجازِ حُسن یار گر انشا کروں

موزوں کر کے دنیا بیان کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ۔۔۔

''بالجملہ ہمین تفول زبان ایشان سخن ایں بابا چناں حسن قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تراز مطلع آفتاب گردیدہ'' ۳؎

میر تقی میرؔ صاحب کا بیان ہے کہ ولیؔ نے ''شاہ گلشنؔ'' سے ملاقات کی اور اپنی ایک غزل سنائی قائمؔ چاند پوری کا بیان آپ اوپر پڑھ چکے ہیں جو میر تقی میرؔ صاحب کے بیان سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا ہے اور یہاں تو شاہ گلشنؔ سے ملاقات اور غزل کا مطلع موزوں کر کے دینے اور ان سے فیضِ صحبت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر آگے چل کر میر حسنؔ نے شاہ گلشنؔ سے استفادہ کرنا بھی بیان کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''در خدمتِ شاہ گلشنؔ قدس اللہ سرہٗ استفادہ حاصل نمود از توجہ آن بزرگوار مقبول اعلیٰ وادیٔ گردید۔'' ۴؎

شاہ گلشنؔ برہان پوری تھے جیسا کہ جمیل جالبی صاحب نے لکھا ہے اور دہلی میں جا بسے تھے۔ ولیؔ ان سے اس وقت ملے تھے جب کہ اردو شاعری میں پختگی آچکی تھی اور جیسا کہ ولیؔ کے متعلق تذکروں میں ہونے والے اذکار کے بیان میں اضافے ہوتے رہے ہیں، اسی طرح آگے چل کر محمد حسین آزادؔ نے اپنے اردو تذکرہ میں لکھا ہے۔

''یہ (ولیؔ) اپنے وطن سے ابو المعالی کے ساتھ دلّی آئے اور یہاں شاہ سعد اللہ گلشنؔ کے مرید ہوئے شاید اُن سے شعر میں اصلاح لی ہو'' ۵؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ میر تقی میرؔ صاحب کے بیان کے بعد سے دیگر جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں ولیؔ کے متعلق معلومات تو جستہ جستہ ہی ملتی ہے اور اس کے بعد کے ہر تذکرہ نگار کے بیان میں ولیؔ اور شاہ گلشنؔ کے تعلقات کو مزید بڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی تذکرہ نگار کچھ لکھنا چاہے گا تو اپنے سے قبل لکھے گئے تذکروں کو ضرور اپنے پیشِ نظر رکھے گا، یہ ضروری نہیں کہ ان تذکرہ نگاروں کو ولیؔ اور شاہ گلشنؔ کے تعلقات کا علم ہو یا اس قسم کے کسی مشورے کی بات معلوم ہو، لیکن اپنے سے پہلے کے تذکروں سے استفادہ کئے بغیر تذکرہ تخلیق کرنا ممکن نہیں تھا۔ لہذا میرؔ صاحب کے تذکرے ''نکات الشعراء'' سے استفادہ کرتے ہوئے ولیؔ کے متعلق میرؔ صاحب کی گمراہ کن باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اور اپنی معلومات کی برتری جتانے کی خاطر انہی باتوں کو لفظوں کے پھیر بدل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جو آگے چل کر بلا کسی تحقیق و جستجو کے ادب میں راہ پا گئی ہیں۔ یوں ان تمام تذکروں کے بیان مشتبہ نظر آتے ہیں۔ علاّمہ شبلیؔ نے محمد حسین آزادؔ کے تذکرہ

''آبِ حیات'' کے متعلق صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ۔۔۔

''وہ گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے''

اس طرح رشید حسن خان نے محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔۔۔

''محمد حسین آزاد معتبر راوی نہیں، اُن کی کتاب ''آبِ حیات'' جو دراصل جدید تذکرے کی حیثیت رکھتی ہے بہت سے غیر معتبر بیانات کا مخزن ہے''۔۶

علامہ شبلی کا یہ بیان بڑا ہی فکر انگیز ہے ان کے اس بیان سے تذکروں میں نقل بیانات کی قلعی کھل جاتی ہے یوں ولی اور شاہ گلشن کے مبینہ ملاقات، مشورت کا منبع میر صاحب کا تذکرہ ہی ہے۔ لیکن اس کے بعد کے تذکرہ نگاروں نے ایک کی معلومات دوسرے سے زیادہ تھی غالباً یہی جتانے کی کوشش میں ولی اور شاہ گلشن کے تعلقات میں اختراعی باتوں کا اضافہ کرتے رہے۔

میر تقی میر جو کہ مسلم الاستاد شاعر ہیں اور ان کی اس استادی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ''خدائے سخن'' یا ''یاسیات کا امام'' قرار دیا گیا، تو کہیں ان کے حاسدوں نے ان کے خبطی ہونے کا الزام بھی عائد کیا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ بڑے استادِ سخن رہے ہیں اور انھیں اپنی ریختہ گوئی پر ناز رہا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے تذکرہ ''نکات الشعراء'' میں ولی کے ساتھ متعصّبانہ رویہ اختیار کیا ہے اور ولی کی شاعری کو ''شاہ گلشن'' کے مشورے کی مرہونِ منت بتا کر ولی کے وقار اور ان کی شاعرانہ عظمت کو کم کرنے کے لئے دانستہ اور شعوری طور پر یہ فاش غلطی کی ہے۔ گویا اس طرح کا الزام اور بہتان تراشی کر کے انھوں نے اپنے وقار کو بلند رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ میر صاحب کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ان کا کہنا تھا کہ ''میری شاعری کو سمجھنے کے لئے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان کا جاننا ضروری ہے اور جو شخص اس ''ریختہ'' سے واقف نہیں میری شاعری اس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔'' اس لئے ان کے اس بیان کو ذہن نشین رکھتے ہوئے سوچئے کہ دہلی میں ولی کا ایک زمانہ رہا تھا اور مشاعروں، محلّوں اور گلی کوچوں میں ولی کا کلام پڑھا جاتا تھا جہاں دیکھو وہاں ولی کے نام کی دھوم تھی تاریخ اس کی شاید ہے محفلِ سماع، قوالوں کی محفلوں اور فقیروں کی صداؤں میں بھی ولی کا ہی کلام پڑھا جاتا تھا اور ولی کے کلام کو ہر عمر سے تعلق رکھنے والے اپنے سینوں سے لگا کر گنگنایا کرتے تھے۔

ولی کی اس ہر دل عزیزی اور ان کے کلام کی حد درجہ مقبولیت شہرۂ آفاق تھی۔ یوں میر صاحب کو ولی

کے اعلیٰ مقام ہونے کا حد درجہ احساس رہا ہوگا۔ نیز دوسری بات یہ کہ میرؔ صاحب دہلوی واقع ہوئے تھے اور ولیؔ دکنی اور اس طرح میرؔ صاحب کے دہلوی ہونے سے، جیسا کہ حکومت کا مرکز بھی اس زمانے میں دہلی ہی تھا، اور مرکزی شہر ہونے سے اس کی اہمیت ظاہر ہے کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں سے بلند وبالا ہی ہوگی۔ راقم الحروف کا ایسا ماننا ہے کہ غالبًا یہی رجحان مرکزی شاعر ہونے کا میرؔ صاحب کو بھی شدت سے احساس تھا۔ اس لئے اب اسے میرؔ صاحب کی احساسِ کمتری پر محمول کیجئے یا ولیؔ کی عظمت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے حسد سے، دونوں باتوں میں سے چاہے جو بھی نکتہ کارفرما رہا ہو، لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ان کا بیان سراسر متعصّبانہ ہے اور انھیں یہ کیوں کر قبول ہوسکتا تھا کہ ایک دکنی شاعر شمالی ہند میں اپنے نام کا پرچم لہرائے اس لئے میرؔ صاحب بھلے ہی کہتے ہوں کہ۔۔۔

؎ خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

لیکن علاقائی تعصب سے وہ اپنا دامن نہیں بچا سکے اور ولیؔ کی شاعرانہ عظمت کو گھٹانے کی غرض سے ''ولیؔ اور شاہ گلشنؔ'' والا واقعہ ایجاد کیا۔ جب کہ میرؔ کی استادی اپنے زمانے میں بھی مسلّم تھی اور ان کے بعد بھی غالبؔ تک نے میر تقی میرؔ کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں۔۔۔

؎ غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غرض یہ کہ میرؔ کے دور میں بھی ہر بڑے شاعر نے اُن کی استادی کے اعتراف میں اس طرح کے اشعار کہے ہیں اور ان کے بعد آنے والے ہر شاعر نے بھی میرؔ کو اپنا استاد تسلیم کرلیا۔ نیز ہر بڑے شاعر نے میرؔ کے کلام کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اس پر ایمان لے آئے۔ لیکن اگر میرؔ صاحب نے اپنے تذکرہ میں اس طرح کی متعصّبانہ کوشش نہ کی ہوتی تو آج ولیؔ کی استادی کا اعتراف بھی ہر بڑا شاعر کرتا۔ لیکن میرؔ کے بعد کے تمام بڑے شاعر ولیؔ کو بھول گئے، گویا اپنے ''بابائے سخن'' کو بھول گئے۔ اگر میرؔ نے اپنے تذکرے میں اس طرح کی ہتک آمیز بات نقل نہ کی ہوتی اور تحقیر آمیز انداز میں ولیؔ اور شاہ گلشنؔ والا واقعہ ایجاد نہ کیا ہوتا تو آج تک کا ہر بڑا شاعر اپنے ''بابائے سخن'' کو کیسے فراموش کر دیتا؟ جب کہ وہ میرؔ کی استادی کا لوہا مانتے تھے تو اپنے استاذ الاساتذہ کو کیسے فراموش کر بیٹھے؟ میرؔ صاحب جو ولیؔ کے حالات سے کماینبغی واقف نہ ہونے کے معترف ہیں

نہ معلوم کس سمعی روایت کی بنیاد پر یہ گپ سن کر اپنے تذکرے میں نقل کر دی، جس کی ان کے معاصر تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے بھی تصدیق نہیں کی۔ اور اس طرح میر تقی میرؔ صاحب نے ولیؔ کی عظمت کو زبردست طور پر مجروح کیا اس ضمن مین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب رقم طراز ہیں۔

''گذشتہ ڈھائی سو برس کی اردو ادبی تاریخ نگاری اس ایک بات پر متفق ہے کہ ولیؔ کے کارنامے کی وقعت کو کم کر کے دکھایا جانا چاہیئے، کیوں کہ وہ شمال کے لئے ''غیر ملکی'' تھے اور غیر ملکی ہی نہیں، دکنی بھی تھے۔ دکنی ہو کر بھی انھوں نے دہلی والوں کو اردو شعر گوئی سکھائی یہ بات دہلی کے ''مرزایان'' کے لئے زہر سے بھی زیادہ کڑوی رہی ہوگی یہ گھونٹ وہ پی تو گئے، لیکن اس کا ذائقہ اپنے ذہن سے محو کرنے کی انھوں نے پوری کوشش کی، اور وہ کوشش اب تک کامیاب رہی ہے۔'' ۷

میرؔ صاحب نے اپنے متعصّبانہ رویّے کو عملی جامہ پہنا کر ایک ادبی سازش کا نقطۂ آغاز کیا تھا، جو ولیؔ کے وجود پر ایک بدنما دانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن آگے چل کر یہی دانہ، ایک پھوڑا اور پھر ایک ناسور بن گیا۔

جیسا کہ ولیؔ کے بارے میں یہ مشہور واقعہ اپنی غلط بنیادوں پر دہرایا جاتا رہا ہے، لیکن اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو ہمیں فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ صرف شاہ گلشنؔ کا اتنا سا مشورہ کہ ''تم فارسی والوں کا طرز اور ان کے مضامین اختیار کرو'' اور اس طرح شاہ گلشنؔ سے ولیؔ کی ملاقات اتنے بڑے تغیر کا پیش خیمہ ثابت ہوجائے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اور ولیؔ اس پر عمل پیرا ہو کر مجدّد غزل بن جائیں گے۔ جب کہ شاہ گلشنؔ خود فارسی کے بلند پایہ شاعر ہیں اور نثر شاعرانہ مسجع ورنگین لکھتے ہیں اور ان کا سرمایۂ کلام تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور وہ خود ریختہ کہنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ دہلی کا سیاسی حال ان کی نظروں کے سامنے تھا اور فارسی کے چلن اور اقتدار میں آتی ہوئی کمیوں کا انھیں بخوبی احساس تھا۔ تو ایسی صورت میں انھوں نے ولیؔ کو مشورہ دینے کے بجائے فارسی مضامین کو ریختہ میں لانے کا کام خود ہی سرانجام کیوں نہ دیا؟ اور ولیؔ کو ہی کیوں مشورہ دیا؟ اور بقول شاہ گلشنؔ کے ''کوئی ان سے باز پُرس کرنے والا نہیں تھا'' کیا یہ بات مصنوعی اور اختراعی نہیں معلوم ہوتی ؟

نیز یہ کہ اگر شاہ گلشنؔ ولیؔ کو تبرکاً اپنی ریختہ میں کہی ہوئی غزل دے سکتے ہیں تو خود بھی ریختہ میں اعلیٰ پیمانے کی شاعری کر سکتے تھے، تو انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اور اپنے عہد میں ریختہ کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بھی انھوں نے خود ریختہ گوئی سے پرہیز کیوں کیا ؟ اگر کچھ دیر کے لئے یہ سوچیں کہ اگر

شاہ گلشن نے بطورِ تبرک اپنی ایک غزل ولؔی کو دی ہوتی تو ولؔی اس غزل کو ضرور شاملِ دیوان کرتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیا ولؔی کے لئے شاہ گلشن مُرشد کی حیثیت رکھتے تھے؟ یا یہ کہ وہ کوئی ولی اور خدارسیدہ بزرگ تھے؟ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا، اور اگر ایسا ہوتا تو ولؔی اس تبرکاً دی ہوئی غزل کو ضرور گلشن کے تخلص کے ساتھ شاملِ دیوان کرتے اور اپنے دیوان میں اس بات کی وضاحت بھی کرتے اور اُس غزل کا حوالہ دیتے، جب کہ بیان یہ کیا جاتا ہے کہ ولؔی نے اس غزل کا مطلع بدل کر اپنا تخلص شامل کر کے دیوان میں شامل کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں۔

''شاہ گلشن کی غزل کی حیثیت اس تبرک کی تھی جو درویش وفقیر کبھی کبھار کسی کو دے دیتے ہیں اور لینے والا باعثِ برکت سمجھ کر اُسے حفاظت سے رکھتا ہے ولؔی نے بھی یہی کیا اور اس غزل میں تخلص شامل کر کے اپنے دیوان میں محفوظ کرلیا'' ۸

راقم الحروف جالبی صاحب کے بیان سے قطعی متفق نہیں، کیوں کہ شاہ گلشن کی حیثیت ولؔی کے لئے کوئی مرشد یا استاد کی نہیں تھی اور نہ ہی ان کا شمار ولؔی کے عزیز دوستوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ولؔی جیسے مہذب شخص کے لئے یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ کسی اور کی غزل پر اپنے نام کا لیبل چسپا کر کے ازراہِ عقیدت اپنے دیوان میں شامل کرلیتے؟ کیا ان کا یہ عمل دیانت داری کے منافی نہیں ہوتا؟ کیا ولؔی جیسے با اخلاق، مہذب اور صوفی منش شخص سے ایسے غیر اخلاقی فعل وعمل کی توقع کی جاسکتی ہے؟ غالباً ہر حساس شخص کا جواب ''نہیں'' ہوگا۔ کیوں کہ ولؔی تو خود مذہبی آدمی تھے، پند ونصائح کا درس دیتے تھے، بھلا ان کا ضمیر یہ کیسے گوارا کرسکتا تھا کہ وہ کسی اور کی غزل کو اپنے دیوان میں جگہ دیتے؟ اور اگر شاہ گلشن ولؔی کے لئے اتنی ہی متبرک ہستی ہوتے یا ان کا مان ومرتبہ ان کی نگاہوں میں اتنا بلند ہوتا کہ ان کے مبینہ مشورے کی ایماء پر ہی اپنی تمام شعری تخلیقات کو وجود میں لائے ہوتے تو ان کے کلام میں ''شاہ گلشن'' کا ذکر خیر بڑی ہی عقیدت سے ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہوں پر آیا ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ولؔی کی تمام تر شاعری میں ''شاہ گلشن'' کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ جب کہ ولؔی انسانی قدروں اور محبت کے رشتوں کو استوار کرنے والے شخص تھے۔ اسی لئے انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے تمام احباب اور دوستوں کا ذکر بڑی ہی عقیدت اور محبت سے کیا ہے اور بعض مقامات پر اپنے عزیز احباب کی دل کی گہرائیوں سے سراپا کشی بھی کردی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے افراد جن کا تعلق ولؔی سے رہا ہے، (ان رشتوں کی نوعیت چاہے جو بھی ہو) انھوں نے اپنی شاعری میں انھیں جگہ دی ہے۔ جیسے کھیم داس، امرت لال، بیرم

لال، گوبند لال اور سیّد ابو المعالی وغیرہ۔ اسی طرح ولؔی نے اپنے کلام میں بعض احباب معاصرین کے نام سے بھی اشعار کہے ہیں۔ ولؔی کے اعزہ میں سے چار بزرگوں کا ذکر ولؔی کے کلام میں موجود ہے۔ جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) شاہ سراج الدین (۲) شاہ شمس الدین (۳) شاہ کابل (۴) شاہ اکمل

اس طرح ''شاہ گلشنؔ'' کا تعلق براہِ راست کسی بھی نوعیت مطلب دوستانہ، استادانہ یا مرشدانہ ولؔی سے ہوتا تو ولؔی ان کا ذکر ضرور کرتے۔ لیکن درحقیقت ولؔی کی شاعری میں شاہ گلشنؔ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ میر تقی میرؔ، قائمؔ چاندپوری یا محمد حسین آزادؔ کے تذکروں میں جو مبینہ مشورے کی بات شامل تذکرہ کی گئی ہی اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور یہ صرف ایک فرضی اور اختراعی بات ہی معلوم ہوتی ہے۔

راقم الحروف اپنی اس بات کی تقویت میں مزید یہ کہنا چاہے گا کہ ''شاہ گلشنؔ'' کی عنایت کردہ اردو غزل کا مقطع تبدیل کر کے ولؔی کا اپنے دیوان میں شامل کرنے کا خیال تو بہت دور کا ہے، کیوں کہ ایک زندہ ضمیر اور بے حد حسّاس طبیعت کا مالک شخص (شاعر) جب اپنا دیوان ترتیب دیتا ہے تو اپنا ابتدائی اور کمزور کلام بھی دیوان کی ترتیب سے قبل ہی دور کر دیتا ہے اور اس دور کے مختلف صاحبِ ذوقِ ادب وسخن دوست واحباب کو دکھلاتا ہے تاکہ اس کے کمزور کلام اور دیگر نقائص کو دور کر کے عوام کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ کمزور پہلو بھی اس کی نظروں کے سامنے آجائیں جو اس کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ تاکہ اس کے کلام کو تمام نقائص سے پاک کر کے عوام کے سامنے پیش کیا جاسکے اور اس کے کلام کو پڑھ کر سماج میں اس کی استادی کا سکّہ بیٹھ جائے اور ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے چار سو تسلیم کرلیا جائے۔ تو بھلا بتایئے کیا کوئی شاعر کسی دوسرے شخص کی غزل کو چاہے وہ اُس سے کتنی ہی عقیدت اور محبت رکھتا ہو بھلا کیا اپنے دیوان میں جگہ دینے کی حماقت کرسکتا ہے؟ کیا تاریخ میں کوئی ایسی نظیر ملتی ہے کہ کسی شاعر نے کسی دوسرے کی تخلیق کردہ غزل کو اپنے دیوان میں جگہ دی ہو؟ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی تو پھر بھلا ولؔی ہی کیوں کسی کی غزل کو اپنے دیوان میں جگہ دینے لگے؟ اور صرف ولؔی ہی کیوں اس الزام اور تہمت کا شکار ہوگئے، جب کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے۔ کیا کوئی صاحب عقل وفہم یہ قبول کرنے کی جسارت کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

دراصل ولؔی کی تمام شخصیت، نام، جائے پیدائش، جائے وفات اور ان کی زندگی کے کچھ واقعات اتنا متنازع فیہ رہے ہیں کہ محققین حضرات نے اپنی ذاتِ گرامی کو ان متنازعات میں الجھائے بغیر بس سیدھے سیدھے روایتوں کو ہی موضوعِ بحث بنا کر اس کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل گئے ہیں۔ اور وہ اتنی اخلاقی ہمت

بھی پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ حقیقت کو واضح طور پر کھول کر لوگوں کے سامنے منظرِ عام پر لاسکیں۔ اس لئے وؔلی کی زندگی، نام اور کلام تمام چیزیں ادبی سیاست میں الجھ کر رہ گئیں اور اگر کسی محققین نے ایسی کوشش کی بھی ہے تو اس کو حیثیت جزوی ہے اور اس پر بھی وہ بے جانقادوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔

''وؔلی اور شاہ گلشنؔ'' کے مبینہ مشورہ ''تم سے کون باز پُرس کرے گا؟'' اگر شاہ گلشنؔ کو مدِّ نظر رکھ کر بات کی جائے تو، جیسا کہ ان کے متعلق بعض عالموں نے لکھا ہے کہ شاہ گلشنؔ حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور نقشبندیہ سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ عبد الاحد وحدتؔ معروف بہ شاہ گل کے مُرید اور اپنے زمانے کے مسلم الثبوت فارسی شاعر میرزا عبد القادر بیدلؔ کے شاگرد تھے۔ اس سلسلے کے اعتبار سے شاہ گلشنؔ صوفی طرز کے آدمی تھے۔ راقم الحروف کے خیال میں جس طرح شاہ گلشنؔ خود فارسی کے اعلیٰ ترجے کے شاعر تھے اور فنِ موسیقی میں اس قدر ید طولیٰ رکھتے تھے کہ ''خسروؔ ثانی'' کہے جاتے تھے۔ ایسے با کمال شاعر اور صوفی بزرگ کے شایانِ شان کیا یہ بات ہوسکتی ہے؟ کہ وہ کسی کو یہ مشورہ دیں کہ ''فارسی مضامین کو اردو میں منتقل کرو؟ اور وہ بھی وؔلی جیسے ایک با کمال اور فطری شاعر کو، اسی طرح وؔلی جیسے صاحبِ فن اور اپنی ذات میں خود مجموعۂ کمالات رکھنے والی ہستی کے لئے بھی یہ بہت بعید امر ہے۔

ہمارا ذہن کچھ دیر کے لئے یہ تسلیم کرنے کو تو ضرور تیار ہوسکتا ہے کہ وؔلی نے ''شاہ گلشنؔ'' سے ملاقات تو ضرور کی ہوگی۔ کیوں کہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ سیّد ابو المعالی کے ھمراہ دہلی گئے تھے اور چوں کہ سیّد ابو المعالی ساکنِ احمد آباد (گجرات) تھے اور چوں کہ ''شاہ گلشنؔ'' نے بھی اپنی زندگی کا طویل حصّہ (۲۲ سال) احمد آباد میں بسر کیا تھا۔ اس اعتبار سے شاہ گلشنؔ اور سیّد ابو المعالی کے تعلقات کی بنیاد سرزمینِ احمد آباد ہوسکتی ہے۔ چونکہ وؔلی سیّد ابو المعالی کو لے کر دہلی وارد ہوئے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے ساتھ وؔلی کو بھی شاہ گلشنؔ سے ملاقات کو لے گئے ہوں گے اور دورانِ گفتگو سیّد ابو المعالی نے یہ ذکر کیا ہو کہ یہ (وؔلی) شاعری کرتے ہیں۔ پھر دونوں صاحبِ سخن نے اس موضوع پر کچھ گفتگو کی ہو اور تبادلۂ خیالات کئے ہوں۔ بہت ممکن ہے دورانِ گفتگو سیّد ابو المعالی نے یہ ذکر کیا ہو کہ یہ (وؔلی) سخن گوئی سے ذریعۂ معاش کی تلاش میں یہاں وارد ہوئے ہیں۔ یا وؔلی نے بھی اس موضوع پر کچھ گفتگو کی ہو اور اپنے یہاں آنے کے مقصد سے آگاہ کیا ہو، جسے بعد میں کسی سمعی روایت کی بنا پر اس دور کے دیگر صاحبِ شعر و سخن تک، وؔلی کی دہلی میں آمد اور شاہ گلشنؔ سے ملاقات کا چرچا ہوا ہو۔

کیوں کہ یہ بات بھی اتنی ہی سچ ہے کہ وؔلی دہلی میں صرف شاہ گلشنؔ سے ملنے کے بعد واپس نہیں لوٹ

آئے ہوں گے یا وہ صرف شاہ گلشن سے مشورہ لینے ہی دہلی نہیں گئے تھے۔ بلکہ ان کے دہلی کے سفر کی ٹھوس اور بنیادی وجہ ذریعۂ معاش کی تلاش تھی (جس کا ذکر راقم الحروف نے ''ولی کا سفرِ دہلی'' والے باب میں کیا ہے) اور اس تلاش وجستجو میں ان کے رفیقِ سفر سیّد ابو المعالی ان کے معاون اور مددگار تھے۔ اس لئے اس تلاش وجستجو میں غالباً ''شاہ گلشن'' ان کی پہلی منزل تھی۔ کیوں کہ ان کے مقامی ہونے کے باعث یہاں کے حالات اور ماحول سے وہ بخوبی واقف رہے ہوں گے۔ نیز ولی کی اس تلاش کے سلسلے میں معاون بھی ثابت ہوسکتے تھے۔ گویا اس ملاقات میں انھوں نے اپنے یہاں آنے کے مقصد کے ساتھ شاہ گلشن کے ذرائع سے کسی اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کی ہوگی۔

اس طرح ایسا بھی ممکن ہے کہ ولی نے اپنے مقصدِ سفر کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر دہلی کے دیگر اور معتبر لوگوں سے بھی ملاقات کی ہوگی اور اپنے یہاں دہلی آنے کے مقاصد سے بھی آگاہ کیا ہوگا۔ اس لئے یہ بات یقینی طور پر تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ولی نے اپنے سفرِ دہلی کے دوران دیگر متعدد لوگوں سے ملاقاتیں کی ہوں گی۔ نیز یہاں (دہلی) اپنے قیام کے دوران شعری نشستوں میں بھی شرکت کی ہوگی۔ کیوں کہ جب کوئی شخص پہلی مرتبہ کسی دور دراز ممالک کے سفر پر جاتا ہے تو دو چار دن یا ہفتہ میں ہی نہیں لوٹ آتا، بلکہ ماہ یا دو ماہ ضرور قیام کرتا ہے۔ اس لئے راقم الحروف کا ایسا ماننا ہے کہ ولی نے بھی دہلی میں اپنے اس سفر کے دوران ایک تا دو ماہ تک ضرر قیام کیا ہوگا۔ اور قیام کے اعتبار سے یہ عرصہ خاصہ طویل ہے۔ اس عرصے میں ولی نے دہلی کے سیکڑوں لوگوں سے بحیثیت مہمان شاعر کے ملاقات کی ہوگی، اور جیسا کہ ممکن ہے ''شاہ گلشن'' سے انھوں نے اپنے شعری ذوق اور فنِ شاعری اور کلام کے متعلق گفتگو کی ہوگی اور اشعار کا لین دین بھی کیا ہوگا۔ کیوں کہ ایک شاعر کی اپنی زندگی کا تمام تر سرمایۂ حیات اس کا کلام ہی ہے اور وہ جب بھی کسی شخص سے ملتا ہے اسے اپنے اشعار سنائے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ایک شاعر کی فطرت کا خاصہ ہے۔

اس لئے اگر ولی نے شاہ گلشن سے ملاقات کے وقت ایک شاعر کی فطری عادت کے مطابق اپنی کوئی غزل سنائی بھی ہو تو یہ امر صرف ''شاہ گلشن'' کے لئے ہی مختص نہیں تھا، بلکہ اس قبیل میں ایسے درجنوں افراد ہوں گے جن سے ولی نے دل کھول کر باتیں کی ہوں گی۔ اور ان باتوں میں ہزاروں طرح کی باتیں ہوسکتی ہیں۔ اس لئے ولی کے سفرِ دہلی کو صرف ''شاہ گلشن'' کی ملاقات سے جوڑ دینا قطعی درست نہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ ولی نے ''شاہ گلشن'' کے گھر ہی قیام کیا ہو اور چوں کہ شاہ گلشن فارسی کے مانے ہوئے استاد تھے،

اس لئے وہ دہلی میں ہر خاص وعام میں مشہور اور مقبول بھی ہیں۔ اس لئے ایسا ممکن ہے کہ لوگ ہمہ وقت ''شاہ گلشن'' اور ولی کو ساتھ میں ہی دیکھتے ہوں۔ اس لئے اس زمانے کے صاحبِ ذوق اور شعر وسخن سے دلچسپی رکھنے والوں نے یہ قیاس کرلیا ہو کہ ولی شاہ گلشن کے مہمان ہیں۔ ان کی مسلم الاستادی کو دیکھتے ہوئے شاید کچھ لوگوں نے خود ہی یہ قیاس کرلیا ہو کہ ولی اپنے کلام کی اصلاح بھی ''شاہ گلشن'' سے لیتے ہوں گے۔ کیوں کہ یہ بات بھی یقینی ہے کہ اس وقت ۱۷۰۰ء میں ولی افقِ شاعری پر نمودار نہیں ہوئے تھے بلکہ اس سعی میں لگے ہوئے تھے۔

ولی چوں کہ اُردو کے شاعر ہیں اور اردو میں کلام کہتے تھے، جب کہ گلشن فارسی کے معتبر شاعر تھے۔ اس لئے اس زمانے میں ایسا ممکن ہے کہ ولی اور شاہ گلشن دونوں موضوعِ بحث بنے رہے ہوں۔ الغرض یہ کہ چاہے جو بھی حالات بنے ہوں، شاہ گلشن نے ولی کو ''ریختہ'' میں کلام کہنے کا مشورہ دیا ہو یا نا دیا ہو۔ لیکن ایسا ممکن ہے کہ اس زمانے کے بعض لوگوں نے خود ہی کبھی ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کی روایت کو جلا دی ہو کیوں کہ ان لوگوں نے یہ تصوّر کیا ہو کہ ''شاہ گلشن'' کے مہمان (ولی) اردو کے شاعر ہیں۔ مطلب یہ کہ ابھی مشقِ سخن جاری ہے (یہ بات ذہن نشین رکھتے ہوئے کہ ۱۷۰۰ء تک ولی غیر معروف شاعر تھے) اور شاہ گلشن فارسی کے مانے ہوئے استاد شاعر تھے۔ اس لئے ایسا ممکن ہے کہ اِن ملنے جلنے والوں نے ہی یہ قیاس کرلیا ہو کہ شاہ گلشن صاحب اپنے عزیز مہمان کو ''ریختہ'' کی جانب راغب کر رہے ہیں اور ان کے کلام کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔ اس لئے غالباً ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی ہو جس نے شاہ گلشن کے اطراف رہنے والوں حلقوں میں یہ بات پیدا کی ہو کہ انھوں نے ولی کو ریختہ کی طرف مائل کیا ہے اور انہی لوگوں نے اس بات کو ہر طرف مشتہر بھی کیا ہو۔

حاصل بحث یہ کہ چاہے جو بھی حالات رہے ہوں، شاہ گلشن نے ولی کو مشورہ دیا ہو یا نہ دیا ہو، اس بات کی حقیقت بہت جزوی ہے۔ کیوں کہ ولی نے اردو شاعری کو جس بڑی تبدیلیوں سے روشناس کرایا ہے اس میں ان کی علمی استعداد اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ اس لئے ''شاہ گلشن'' سے ملاقات اور وہ مبینہ مشورہ کہ'' فارسی کے بیکار مضامین کو اردو میں منتقل کرو'' صرف اتنی سی بات کسی طرح بھی ان کی شاعری میں اتنے بڑے تغیّر کا پیش خیمہ نہیں بن سکتی۔ جس کی بنا پر ولی شعر وادب کی تاریخ میں اپنے لئے مخصوص اور مستقل مقام بنالیتے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق بجا طور پر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

''صرف اتنی سی بات زبان میں اتنے بڑے تغیّر کا باعث نہیں ہوسکتی اس کی اور وجوہ بھی ہیں۔'' ۹

اس لئے یہ بات یقینی اور قطعی ہے کہ ولؔی کی شاعری کسی طرح بھی شاہ گلشؔن کے ارشاد کی تعلیم کا نتیجہ قرار نہیں دی جاسکتی کیوں کہ۔۔۔

ع راہِ مضمون تازہ بند نہیں

کہنے والا شاعر کیا شاہ گلشؔن کے مشورے کے دائرے کا اسیر ہوکر رہ سکتا ہے؟ اس لئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ شاہ گلشؔن کا مبینہ مشورہ بے حقیقت ہے۔ کیوں کہ یہاں اس موقع پر یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ اگر ولؔی کی شاہ گلشؔن سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو کیا یہ تحریکِ شاعری ولؔی کے کلام میں رونما نہ ہوئی ہوتی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولؔی اور شاہ گلشؔن کی ملاقات کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اہمیت دی گئی ہے اردو کے مشہور اور عظیم نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے ولؔی اور شاہ گلشؔن کے اس مبینہ مشورے کو بے حقیقت سمجھتے ہوئے لکھا ہے۔

''بعد کے اساتذہ، خاص کر میؔر اور قائؔم نے ولؔی کے کارنامے کی وقعت گھٹانے کی پوری کوشش کی، اور شاہ سعد اللہ گلشؔن والا ''واقعہ'' ایجاد کیا۔'' ۱۰

راقم الحروف اپنے دلائل میں مزید وضاحت کے ساتھ یہ کہنا چاہے گا کہ، آپ تصوّر کیجئے کہ، ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ایک بند کمرے میں مشورہ دیتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے امر کا جو اس کے لئے بالکل ہی نیا ہو اور وہ جس پر کبھی شعوری یا غیر شعوری طور پر عمل پیرا بھی نہ ہوا ہو اور وہ بات یا فعل جو اس کے تجربے میں بالکل نئی ہو اور نہ ہی اس سے قبل اس نے وہ شئے یا اس کے نمونے دیکھے ہوں۔ تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص اس کے دیئے ہوئے مشورے پر نہایت سعادت مندی سے عمل کر کے اُس امرِ خاص میں انقلاب پیدا کردے؟ کیا یہ بات قابلِ فہم ہوسکتی ہے؟ گویا یہ کہ ولؔی اور شاہ گلشؔن کے مبینہ مشورے کی حقیقت کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک مصوّر جب کوئی تصویر بناتا ہے تو اس میں رنگ آمیزی کے لئے ان ہی رنگوں کا استعمال کرتا ہے جس سے وہ شناسا ہو اور وہ رنگ اس دنیا میں موجود اور فراہم ہو، بھلا جو رنگ مصوّر نے کبھی دیکھا ہی نہ ہو اور کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ فلاں رنگ استعمال کرو اور وہ اس خیالی رنگ کو اپنی خالی تصویر میں بھر کر اس میں جان ڈال دے کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے؟ ہر گز نہیں، کیوں کہ جب کوئی مصوّر کوئی خیالی تصویر صفحۂ قرطاس پر بناتا ہے تو اس تصویر میں آب وتاب پیدا کرنے کے لئے اُن ہی رنگوں کا استعمال کرتا ہے جو

رنگ وافر ذخیرے میں موجود ہو۔ بالکل اسی طرح جب شاعر اپنے تخیلی خیالات کو عملی جامہ پہنا کر شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور اُسے نیا رنگ وروپ دیتا ہے، تو وہ اس کے مخصوص شاعرانہ تخیل کا روپ ہوتا ہے، کسی سے مستعار لیا ہوا کوئی خیالی پیکر یا ترکیب وغیرہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ تجربات ہوتے ہیں جس سے شاعر بذاتِ خود بالواسطہ طور پر متاثر رہا ہے۔ لہذا اپنے ذہن میں لہروں کی مانند اُٹھنے والے خیالات کی موجوں کو لفظوں کے ساحل تک پہنچاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا قطعی اور درست ہوگا کہ وؔلی کی شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں کا منبع شاہ گلشؔن کا مبینہ مشورہ نہیں ہے، بلکہ وؔلی کی ذہنی اختراع کا نتیجہ ہے۔ اس لئے میرتقی میؔر کا وؔلی کے متعلق لکھا ہوا بیاں بے وزن معلوم ہوتا ہے اور یہ سراسر اتہام (تہمت) کی شعوری کوشش ہے، کہ وؔلی کی شاعری فارسی تراکیب اور فارسی اندازِ بیان کا چربہ ہے۔ وؔلی کی شاعری میں اگر کہیں فارسی شعراء کے اندازِ بیان کا چربہ ملتا ہے تو میرتقی میؔر، ذوؔق اور غالؔب کا کلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس بات کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ وؔلی اور شاہ گلشؔن کی ملاقات یقینی طور پر ہوئی ہوگی اور جیسا کہ دونوں شعراء حضرات میں ہم عمری اور ہم عصری کا تعلق کارفرما ہے۔ اس لئے وؔلی کے لئے یہ بڑی تحقیر کا سبب ہوتا کہ وہ ''ریختہ'' کے شاعر ہوتے ہوئے کسی فارسی شاعر سے اصلاحِ کلام کرواتے، جب کہ اس زمانے میں دہلی میں فارسی شعراء کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اس ضمن میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ ---

> ''دہلی کی حالت اس وقت یہ تھی کہ فارسی کے اچھے اچھے کہنے والے وہاں موجود تھے اور علاوہ سراج الدین علی خاں آرزؔو، مرزا عبد القادر بیدؔل، سلیمان قلی خاں داؔود، شیخ سعد اللہ گلشؔن، مرتضیٰ قلی خاں فراؔق، علی قلی خاں ندؔیم وغیرہ نہایت خوش گو شعراء پائے جاتے تھے لیکن اردو سے بالکل نابلد تھے اور کبھی بطورِ تفنن کچھ کہا بھی تو بالکل بیگانہ لب ولہجہ میں'' [۱۱]

غرض یہ کہ دہلی میں اس زمانے میں فارسی شعراء کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اور خود شاہ گلشؔن کے استاد میرزا عبد القادر بیدؔل (۱۷۲۰ء تا ۱۶۴۴ء) بھی دہلی میں موجود تھے اور جن کی شہرت کا ستارہ اس وقت برجِ شرف میں تھا۔ اُس زمانے میں وؔلی نے اپنے سفرِ دہلی کے وقت وہاں غالباً ایک تا دو ماہ قیام کیا ہوگا۔ اس لئے یہاں اِس موقع پر ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ، کیا شاہ گلشؔن وؔلی کو اپنے استادِ محترم کے پاس لے گئے؟ کیا انھوں نے وؔلی کو اپنے استاد عبد القادر بیدؔل سے متعارف کرایا؟ اور اگر وؔلی کو مشورہ ہی دینا تھا تو اپنے استادِ محترم سے

کیوں نہ دلوایا؟ اور اپنے استاد کے ہوتے ہوئے خود ہی یہ شرف کیوں حاصل کرلیا؟ اگر ولؔی کے مبینہ مشورے کی بات شاہ گلشن کے استاد عبد القادر بیدلؔ سے منسلک ہوئی ہوتی تو اس بات کوتسلیم کرنے میں کچھ غور وفکر ضرور کیا جاسکتا تھا اور شاید یہ کڑیاں کچھ ایسی ہوتیں کہ اس بات کوتسلیم کرنے میں کوئی تامّل حائل نہیں ہوتا، کہ ولؔی ذریعۂ معاش کی تلاش میں دہلی آئے تھے اور سیّد ابو المعالی کے طفیل شاہ گلشن سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنا کچھ کلام سنایا اور اصلاح چاہی تو میاں گلشن نے ولی کو اپنے استادِ محترم سے متعارف کرایا اور بیدلؔ نے ولؔی کو مشورہ دیا اور اس مشورے کے تاثر سے ولؔی کے ذہن کے ساکن سمندر میں تحرک کی لہر ڈور گئی اور ولی شعوری طور پر بیدار ہوکر اپنی طبیعت کو ریختہ کی طرف موزوں کرلیا۔

نفسِ مضمون یہ کہ اگر ولؔی کے مشورے کی بات مزکورہ ترتیب سے ظہور پذیر ہوئی ہوتی تو اس بات کی صداقت کا امکان بن سکتا تھا۔ لیکن یہاں تو صرف مشورے کی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا اس بات کی مثال اس طرح سے پیش کی جاسکتی ہے کہ جیسے سیاہ رات میں کسی نے سیاہ پتھر پھینک دیا ہو اور جو خود اس رات کی تاریکی میں گم ہوگیا اور یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ یہ کس سمت سے آیا تھا اور کس سمت گیا ہے۔ ولؔی کے متعلق میر تقی میرؔ کا بیان بھی کچھ اِسی طرح کا ہے اور اُس کے آگے پیچھے کی تمام کڑیاں مفقود ہیں کہ ولؔی دہلی میں کہاں کہاں ٹھرے؟ کتنے روز قیام کیا؟ اور پھر کب واپس لوٹے؟ وغیرہ، وغیرہ۔۔۔

چوں کہ ولؔی کی شخصی زندگی کے بارے میں مستند کوائف دستیاب نہیں ہیں۔ اس لئے سنی سنائی باتوں پر ہی اکتفا کرتے ہوئے بات کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے شاہ گلشن کا واقعہ بھی حقیقت سے زیادہ سنی سنائی باتوں پر زیادہ مبنی ہے۔ اسی لئے مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنے سے پہلے لکھے گئے تذکروں سے استفادہ کرتے ہوئے، نیز اپنی رائے شامل کر کے ولؔی اور شاہ گلشن کے تعلقات کی نوعیت کو ملاقات کے دائرے سے نکال کر مرید اور شاگرد تک پہنچا دیا، اور ولؔی کے ادبی کارنامے کو ''شاہ گلشن'' کے مشورے سے جوڑ کر اس مشورے کا ''رہین احسان'' بتا کر بے وقعت کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی اور ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی نے تو سرے سے ہی ولؔی کو شاہ گلشن کا شاگرد لکھ دیا ہے۔ جو کہ ان دونوں حضرات کا بیان علاقائی تعصب کے زیرِ اثر معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ ولؔی کی وطنیت کے باب میں شاہ گلشن کا تعلق بھی اس مقام سے رہا ہے۔ کیوں کہ ''شاہ گلشن'' نے اپنی عمرِ عزیز کا طویل حصّہ سرزمین احمد آباد میں گزارا ہے۔ اس ضمن میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی رقم طراز ہیں۔۔۔

''ان (شاہ گلشنؔ) کا بار بار اپنے آبائی وطن احمد آباد میں آنا جانا ہوتا تھا بلکہ قریب ۲۲ سال سے وہ گجرات میں رہے ہیں، اورنگ آباد اور دیگر بلادِ دکن میں رہے ہیں۔ برہان پور میں برسوں رہے اور غالباً ولیؔ سے وہیں احمد آباد یا برہان پور میں ان کی ملاقات ہوئی ہوگی اور وہیں سے تعلقاتِ استاد وشاگرد قائم ہوئے ہوں گے پھر جب وہ (گلشنؔ) دلّی تشریف لے گئے تو وہاں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔'' ۱۲

اسی طرح ڈاکٹر سیّدظہیر الدین مدنیؔ یوں تحریر کرتے ہیں۔۔۔

''شاعری میں ولیؔ کے استاد شاہ گلشنؔ تھے جیسا کہ میر حسنؔ اور دی تاسی نے اس طرف اشارہ کیا ہے خود ولیؔ بھی ''نور المعرفت'' کے اختتام پر اس امر کا اظہار کرتا ہے'' ۱۳

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی کے مذکورہ بیان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے کن شہادتوں پر ولیؔ کو شاہ گلشنؔ کا شاگرد مان لیا؟ جب کہ موصوف نے ولیؔ کے ''شاہ گلشن'' کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے نیز استادی اور شاگردی کے تعلق کی بنیاد جس رسالہ ''نور المعرفت'' پر رکھی ہے۔ دراصل آج تک یہ ثابت ہی نہیں ہوا کہ مذکورہ رسالہ ہمارے شاعر ولیؔ ہی کا تصنیف کردہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسالہ ''نور المعرفت'' ''ہدایت بخش'' نامی ایک مدرسے کی ثناء میں ہے۔ یہ فارسی زبان کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ یہاں یہ بھی یاد کرادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب ولیؔ احمد آباد (گجرات) میں ''مدرسۂ علویہ شاہ وجیہ الدین علویؒ'' میں حصولِ تعلیم میں مشغول تھے، تو یہاں کے دو مدارس ہندوستانی سطح پر اپنی تعلیم کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ جن میں ایک تو ''مدرسۂ علویہ شاہ وجیہ الدین'' تھا (جہاں ولیؔ تعلیم حاصل کر رہے تھے) اور دوسرا مدرسہ ''ہدایت بخش'' تھا۔ جس کی تعریف میں مذکورہ رسالہ لکھا گیا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مدرسہ مولانا شیخ نور الدین صدیقی سہروردی (جن سے بعض لوگوں نے ولیؔ کا دست بیعت ہونا لکھا ہے) کے ایک شاگرد وعقیدت مند نواب اکرام الدین نے ۱۱۰۲ھ میں اس کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اور یہ عمارت ۱۱۱۱ھ میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ جہاں مولانا موصوف ۱۱۵۵ھ تک درس وتدریس میں مشغول رہے تھے۔ مذکورہ رسالہ ''نور المعرفت'' اسی مدرسے ''ہدایت بخش'' اور مولانا نور الدین صدیقی سہروردی کی تعریف وتوصیف میں لکھا گیا ہے اور جسے ولیؔ کی تصنیف

قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ محض ایک خیال ہی ہے کیوں کہ آج تک یہ قطعی طور پر ثابت ہی نہیں ہو پایا ہے کہ یہ مذکورہ رسالہ ہمارے اسی وؔلی شاعر کا ہی تصنیف کردہ ہے یا کسی اور وؔلی کا ؟ جنھوں نے یہ رسالہ لکھا ہے۔

کیوں کہ اس زمانے میں وؔلی نام کے اور بھی اشخاص تھے اور شعر وشاعری کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مذکورہ رسالہ ''نور المعرفت'' کا کوئی تحریری نسخہ نہیں ملتا، صرف نام ہی ملتا ہے۔ لہٰذا اس بات میں شک ظاہر کیا گیا ہے کہ کیا اُس زمانے میں وؔلی نام کا کوئی اور شخص بھی ایسا تھا ؟ جس کو شاہ گلشنؔ کا شاگرد بتایا گیا اور ممکن ہے کہ وہ فارسی کے شاعر ہوں ؟ کیوں کہ یہ رسالہ ''نور المعرفت'' فارسی زبان میں ہے اور اگر کچھ دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ رسالہ ''نور المعرفت'' ہمارے وؔلی شاعر کا ہی ہے، تو اس سے ہمارے شاعر وؔلی کی فارسی دانی اور اس زبان پر ان کی دست رس اور گرفت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور ان کی فارسی دانی میں کسی طرح کی شک وشبہات کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے بھی وؔلی کو شاہ گلشنؔ یہ مشورہ دیں کہ ''فارسی کے بیکار مضامین کو اپناؤ تم سے کون باز پُرس کرے گا'' یہ بات خارج از بحث معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ وؔلی خود باشعور اور وسیع الذہن تھے اور اگر انھوں نے اپنی شاعری میں فارسی اندازِ بیان اور اسلوب اختیار کیا ہے تو وہ ان کی اپنی فارسی دانی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ لیکن شاہ گلشنؔ سے مشورے کی مرہونِ منت ہرگز نہیں، اس ضمن میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اپنی تذبذب رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔

> ''اس معاملے میں فی الحال تو اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات سخت مستعبد ہے کہ شاہ گلشنؔ کے دو شاگرد ہوں، اور دونوں کا نام وؔلی ہو یا پھر ہمارے شاہ گلشنؔ کے وقتوں میں ایک اور شاہ گلشنؔ ہوں، اور وہ بھی احمد آباد میں ہوں'' [۴۱]

ایک ہی وقت میں ایک نام کی دو مشہور ومعروف شخصیتیں منظرِ عام پر ہوں ایسا بہت ہی کم ممکن ہوا ہے، کیوں کہ وؔلی کے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرنے کے نتیجے میں آج تک جس وافر مقدار میں وؔلی کے دیوان ملتے ہیں، اس بات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ آخر رسالہ ''نور المعرفت'' ہی وؔلی کی تصنیف ہونے میں کیوں ثابت نہ ہوسکا ؟ جب کہ دیوانِ وؔلی کے بہت سے نسخے اور بیاضیں ایسی بھی ضرور ہوں گی جو دست وبرد زمانے کا شکار ہوگئی ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود وؔلی کا کلام ہونے کے متعلق کوئی شک وشبہات کی گنجائش نہیں ہوتی اور موجودہ دور میں تین صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کے درجنوں دیوانِ کلمی موجود ہیں۔ اسی طرح اگر وؔلی جیسی صاحبِ کمال اور مشہور زمانہ ہستی کا تصنیف کردہ یہ رسالہ ''نور المعرفت'' ہوتا

تو محفوظ بھی ہوتا اور اس طرح سے ولیؔ کی تصنیف ہونے کے تعلق سے الگلوں سے پاک بھی۔

اس سے تو یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ رسالہ ''نور المعرفت'' ہمارے شاعر ولیؔ کا نہیں بلکہ کسی دوسرے ولیؔ نامی شخص کا ہوسکتا ہے۔ جو شاید احمد آباد، برہان پور یا دکن کے کسی دوسرے علاقہ کا ساکن رہا ہو۔

اب رہا سوال استادی اور شاگردی کا تو جیسے ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی اور قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے اس امر میں ذرا بھی شک کا اظہار کئے بغیر سیدھے سیدھے میرؔ صاحب کے حوالے کو سند مانتے ہوئے لکھ دیا ہے۔

اس ضمن میں یہ ملحوظِ نظر رہے کہ راقم الحروف نے مدلل مباحث سے میر تقی میرؔ کے بیان کی نفی کی ہے اور شاعری میں استادی اور شاگردی کا معاملہ تو ولیؔ کے زمانے تک وجود میں ہی نہیں تھا اور اردو شعر وشاعری میں استادی اور شاگردی کا رواج غالباً اس کے بعد کے زمانے میں ہوا ہے۔

راقم الحروف اس ضمن میں یہ بھی کہنے کی جسارت کرے گا کہ تاریخ میں ایسی کوئی نظیر بھی تو نہیں ملتی کہ کسی اردو (ریختہ) کے شاعر کا کوئی فارسی شاعر استاد ہوا ہو۔ کیوں کہ لسانی اور شعری اعتبار سے بھی ان دونوں زبانوں کے مزاج میں کافی فرق ہے۔ ویسے بھی فارسی کے مسلم الاستاد شاعر ہوتے ہوئے بھی فارسی زبان کے شعراء اردو (ریختہ) سے نابلد ہوتے تھے اور اگر پھر بھی انھوں نے اس زبان میں کچھ کہنے کی ہمت جٹائی تو بھی ان کا کلام بالکل بے رنگ اور بھدّا معلوم ہوتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں آپ تصوّر کیجئے کہ فارسی کا مسلم الاستاد شاعر ہونے کے باوجود جو اس زبان کی نوک پلک سے بھی واقف نہ ہو بھلا کیا کسی اردو (ریختہ) کے شاعر کا استاد بننے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے؟ تو پھر بھلا اُس زمانے میں فارسی کے شعراء، مع شاہ گلشنؔ کے، عموماً اردو (ریختہ) سے ناواقف تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ولیؔ شاہ گلشنؔ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے؟ اور انھیں اپنی استادی کا شرف بخشتے۔ کیا ولیؔ کو شاہ گلشنؔ کی اردو دانی کا علم تھا؟ کیا وہ شاہ گلشنؔ کی اردو علمی استعداد سے واقف تھے؟ جیسا کہ راقم الحروف نے نیاز فتحپوری کے حوالے سے رقم کیا ہے۔

اس لئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فارسی کے اساتذہ ریختہ (اردو) کو اس زمانے میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور پھر اس زبان میں شعر موزوں کرنا تو ان کے مرتبے سے گری ہوئی بات تھی۔ تو پھر اس زبان کو سیکھنے اور کسی دوسرے شخص کو اس زبان میں شعر گوئی کی ترغیب دینے کی بات کس طرح تسلیم کی جاسکتی ہے؟ اور پھر فارسی استاد کا اردو کے شاعرِ نو کو اپنے تلامذہ کے زمرے میں شمار کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ کہ ولیؔ اور شاہ گلشنؔ کی استادی اور شاگردی کی بات مشتہر ہوجائے۔ کیا ان دلائل سے اس بیان

کے بے بنیاد ہونے کی شہادت نہیں ملتی ؟ کیوں کہ یوں بھی استادی اور شاگردی کا رواج اور آغاز ولؔی کے زمانے کے بہت بعد کی چیز ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھی اس بات کی حمایت میں رقم کیا ہے کہ۔۔۔

''اس زمانے میں فنِ شعر میں استادی اور شاگردی کا جھنجھٹ نہ تھا'' ۱۵

گویا اس طرح اردو میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ اس کے بہت بعد کی چیز ہے اور اپنی جگہ بالکل نئی بھی، کیوں کہ جہاں تک معلوم ہوا ہے کسی دوسرے ادب میں یہ رواج اس شکل میں نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ زبان نئی تھی اور اس کے قواعد وضوابط مستند کتابوں میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ، ہر نیا شاعر اپنے لئے ایک رہنما تلاش کرے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ ایک ایسی مستقل روایت بن گئی کہ جب تک کوئی نیا شاعر اپنے دور کے کسی استاد شاعر کے سامنے زانوے تلمذ طے نہیں کرتا اس وقت تک اس کی تمام شعری کوششوں کو قدرومنزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، اور اس کے کلام کو پُر عیوب تصوّر کیا جاتا تھا، اور وہ شاعر اپنی ادبی حیثیت مسلم نہیں کرپاتا تھا۔ گویا استاد کا ہونا اس زمانے کے رواج کے باعث ایک لازمی امر ہوگیا تھا۔ کیوں کہ اس سے نوآموز شاعروں کے ذاتی جوہروں کونکھرنے کے مواقع پوری طرح مِل جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ حاتؔم کے شاگرد میرزا رفیع سوؔدا، مصحفؔی کے شاگرد آتش، تسلیم کے شاگرد حسرؔت موہانی اور داغؔ کے شاگرد اقبالؔ ہیں۔ یہاں تک کہ غالبؔ کا کوئی استاد نہیں تھا، لیکن اس خوف سے کہ کوئی بے استاد نہ کہے انھوں نے بھی اپنے لئے ایک فرضی ایرانی استاد ڈھونڈ نکالا جس کا نام عبد الصمد تھا اور جس نے انھیں فارسی کی تعلیم دی تھی اور وہ ایران سے آیا تھا اور پارسی سے مسلمان ہوگیا تھا۔ کیوں کہ غالبؔ کو اپنی فارسی دانی پر بڑا نازِ تھا اور وہ خود اپنے اردو مجموعۂ کلام کو'' بے رنگ من است'' کہتے ہیں۔ اسی لئے کہ غالبؔ کی فارسی شاعری پر کوئی حرف نہ رکھ سکے انھوں نے بھی فرضی استاد گڑھ لیا اور جس کا اعتراف انھوں نے خود اپنے خطوط میں کیا ہے اور پھر یہ بھی لکھا ہے۔۔۔

''مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے چوں کہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی نام گڑھ لیا ہے۔'' ۱۶

ولؔی اور شاہ گلشن کی ملاقات، مشورت اور ان کے تلامذہ میں شریک ہونے جیسی اختلافی باتوں کی حقیقت

کو سمجھنے کے لئے اوّل یہ جاننا ضروری ہے کہ وؔلی کی شاعری میں پیدا ہونے والی غیر معمولی تبدیلیوں کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟ کیوں کہ راقم الحروف نے وؔلی کی شاعری کو ''شاہ سعد اللہ گلشنؔ'' کے مشورے کی مرہونِ منّت تسلیم نہیں کرتا، کیوں کہ راقم الحروف نے اپنے مضبوط دلائل سے گذشتہ اوراق میں اس کی تردید کی ہے۔ اس لئے اگر ہم وؔلی کی شاعری میں پیدا ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کا جائزہ اس سیاسی تناظر میں تلاش کریں جو اُس وقت دکن اور دہلی میں جاری تھا۔ تو یقینی اور واضح طور پر ''وؔلی اور شاہ گلشنؔ'' کے تعلقات کے نوعیت کی عقد کشائی ہوجاتی ہے، اور اس بات کا انکشاف ہوجاتا ہے کہ وؔلی کی شاعری میں تغیر کا پیش خیمہ شاہ گلشنؔ نہیں بلکہ وہ سیاسی اسباب وعمل تھے جو اُس وقت ہندوستان اور بطورِ خاص دہلی میں رونما تھے۔ کیوں کہ وؔلی نے جب ۱۷۰۰ء میں دہلی کا اپنا پہلا سفر کیا تھا، اس وقت اورنگ زیب عالمگیر کی علالت کے سبب حکومت میں انتشار پیدا ہوچکے تھے اور اُن کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں زوال پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے اور بزم شعر وشاعری کے بجائے رزم کی بساط بجھنے لگی تھی اور پھر فارسی شاعری کی شمع عالمگیر کے چند ایک جانشینوں تک جھلملاتی رہی تھی۔

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں یہ بڑا المناک دور گزرا ہے۔ ایک تو کمزور بادشاہوں کی دہلی کے تخت پر جلوہ افروزی، امراء ودربار کی ریشہ دوانیاں، سادات بارہ کا بادشاہ گر بن جانا، حقیقت یہ ہے کہ مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی نہ صرف فارسی زبان کی قدر وقیمت کم ہونے لگی تھی بلکہ ''ریختہ'' کی وہ بنیاد جو اورنگ زیب عالمگیر کی سیاسی فتوحات کے زمانے میں دکن کی ریاستوں اور شمالی ہند کی سرزمین میں پڑی تھی، اس کی جڑیں زمین میں گہری اُتر چکی تھیں۔ اسی کے ساتھ فارسی زبان کا کرّ وفر رخصت ہورہا تھا، لیکن ان دونوں زبانوں کے انضمام سے زبان کا جو نیا حیولا تیار ہورہا تھا، اس کا تعلق براہِ راست عوام سے تھا۔ اور اُسے بڑی مقبولیت بھی حاصل ہو رہی تھی۔ کیوں کہ وؔلی کے زمانے میں اورنگ زیب ایک عرصے تک سرزمینِ دکن پر فاتح کی حیثیت سے قابض ہوکر سیاسی مصلحتوں کی بناء پر وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے شمالی ہند کی افواج کا ایک جمِ غفیر دکن میں آمد ورفت جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس لئے جیسے جیسے عالمگیر کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے دکن کی مقامی زبان دکنی میں بھی تغیر پیدا ہوتا گیا ہے، اور اس کی جگہ ابتدائی ''اردو'' جسے اس دور میں ''ریختہ'' کا نام دیا گیا تھا، اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ وجود میں آچکی تھی۔ لیکن اس کے برعکس مغلوں کے زوال کے ساتھ فارسی زبان کی قدر قیمت میں بھی کمی واقع ہوتی گئی تھی۔

مذکورہ یہ تمام وہ سیاسی حالات تھے جس سے ہر خاص وعام شخص متاثر تھا۔ گویا یہ کہ وؔلی کے پیش نظر بھی

یہی وہ تمام حالات تھے اس لئے یہ ممکن ہے کہ ولی کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی ہو کہ فارسی کے مقابلے ''ریختہ'' کا مستقبل زیادہ روشن ہے۔ کیوں کہ سیاسی اسباب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فارسی زبان کا مستقبل تاریک تھا۔ جبکہ اردو (ریختہ) ادب کے اوّلین دور سے گزر رہی تھی۔ اس لئے ممکن ہے فارسی کو خیر آباد کہہ کر اردو میں شاعری کرنے کا خیال ولی کو زیادہ مناسب معلوم ہوا ہو۔ اس لئے جہاں تک شاہ گلشن کے مبینہ مشورہ ''فارسی کے مضامین اردو میں استعمال کرو'' یہ بات کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں لگتی۔ اور جہاں تک ولی اور شاہ گلشن کے مبینہ مشورہ کی بات ہے، اس بات کو یوں بھی بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ ولی کی بنیادی تعلیم تو عربی اور فارسی میں ہی ہوئی تھی، کیوں کہ اس زمانے میں بنیادی تعلیم انھیں زبانوں میں دی جاتی تھی اور یہی زبانیں ذریعۂ تعلیم تھیں۔ چونکہ ولی نے ایک طویل عرصہ تک ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) میں تعلیم حاصل کی تھی اور خود انھوں نے فارسی کے بلند پایہ شاعروں کے کلام کو پڑھا تھا اور ان فارسی شعراء کے کلام سے بے حد متاثر رہے تھے۔ لہٰذا ولی کی فارسی دانی کا اندازہ ان کے اُس کلام سے ہو جاتا ہے۔ جس میں انھوں نے فارسی کے مسلم الاستاد شعراء کا تخلص اپنی غزلوں میں بطورِ قافیہ استعمال کیا ہے اور اپنے محبوب کے حُسن و جمال کی توصیف میں بعض فارسی شعراء کا تخلص بطورِ تشبیہ اور استعارہ بھی استعمال کیا ہے۔ راقم الحروف نے گذشتہ باب میں اس کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس لئے وہ شخص جو بنیادی طور پر فارسی زبان کا جاننے والا رہا ہو اور اس کی نوک و پلک سے واقفیت رکھتا ہو، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، سوجھ بوجھ کا مالک ہو، وہ خود بھی تو اتنی صلاحیت ضرور رکھتا ہوگا کہ اُس وقت ہندوستان اور بطورِ خاص دہلی میں پیدا ہوئی سیاسی اور لسانی ادبی صورتِ حال سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکے۔

لہذا ولی کی فارسی تعلیم اور فارسی شعراء سے واقفیت، ولی کے کلام کو دیکھتے ہوئے کوئی نافہم چیز نہیں ہے۔ یہاں اس موقع پر یہ وضاحت کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے کلام میں فارسی کے شعراء کا ذکر تو آیا ہی ہے لیکن ولی نے بعض اشعار ایسے بھی کہے ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی فارسی کے استاد شعراء سے خود کو کمتر نہیں گردانتے تھے، بلکہ ان پر اپنی فوقیت اور برتری کا احساس رکھتے ہیں اسی ضمن میں کچھ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

عُرفی و انوری و خاقانی
سب مجھ کو دیتے ہیں حسابِ سخن

ٹک ریختہ ولؔی کا جاکر اُسے سناؤ ؎
رکھتا ہے فکر روشن جو انورؔی کے مانند

یوں شعر ترا اے ولؔی مشہور ہے آفاق میں ؎
مشہور ہے جیوں کہ سخن اس بلبل تبریز کا

ان مندرجۂ بالا اشعار کو پڑھ کا آپ اندازہ لگایئے کہ ولؔی کے ذہن میں ان کا اپنا معیار کتنا بلند تھا کہ انھوں نے فارسی کے بڑے بڑے شعراء کو للکارا ہے اور انھیں بعض مقام پر اپنا حریف یا اپنے سے کمتر بھی قرار دیا ہے۔ اور اپنی شاعری کے آگے وہ انھیں لائقِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے اور اپنی سربلندی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی اس سربلندی کا احساس اتنا قوی ہے کہ ان کے اس احساس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ فارسی شاعروں سے ناواقف ہیں یا ان کی فارسی دانی کمزور ہے۔ بلکہ ان کے ان اشعار سے یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ ولؔی فارسی کے مضامین اور شاعری میں استعمال ہونے والے انداز اور طرز سے بخوبی واقف تھے گویا یہ کہ ولؔی کا یہ احساسِ برتری کسی طرح بھی کسی کے مشورے کے زیرِ اثر نہیں ہوسکتا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے کلام میں اس طرح کے اشعار کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ کہیں نہ کہیں ان کی احساسِ کمتری کا شائبہ تو ضرور ہی نظر آتا، اور کہیں نہ کہیں ان کی شاعری میں ان کی اس احساسِ کمتری کی جھلکیاں بھی ضرور ملتیں۔ اس لئے یہ بات شیشہ کی طرح شفاف اور بآسانی سمجھ میں آنے والی ہے کہ اگر ولؔی نے اپنی شاعری میں فارسی مضامین کو اپنایا اور اس کے ذریعے اپنی شاعری کو نیا رنگ وروپ دینے کی عملی کوشش کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ولؔی کی شاعری کو شاہ گلشن کے مشورے سے جوڑا جائے یا ولؔی کی شاعری میں ان کے مشورے کا عمل دخل ہے۔ اس لئے یہ بات بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس یہ تو ولؔی کی اپنی ذہنی اختراع اور ان کی اپنی انفرادی کوششوں کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہے۔ جناب احسن مارہروی صاحب نے ولؔی کی شاعرانہ لیاقت کو دیکھتے ہوئے رقم طراز ہیں۔۔۔

> ''کسی معمولی قابلیت والے کا کام نہیں کہ وہ تصوّف میں کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار چھوڑے، کسی کم سواد کی یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی فن یا روشِ خاص کا موجّد بنے، اور پھر اپنے مضامین کو ایسے عالی مضامین ومعانی سے موزوں ودل آویز بنائے جو کسی چلتے پھرتے سے ممکن نہیں۔'' ۱۷؎

مذکورہ دلائل کو دوسرے رُخ سے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اردو اس زمانے میں اپنی ابتدائی حالت میں ردّ وقبول کے مراحل سے بھی گزر رہی تھی۔ اس لئے فارسی کے پرانے مضامین بھی اس زبان کے لئے تو نئے ہی تھے۔ لہٰذا اس زبان کو تقویت بخشنے اور پروان چڑھانے میں مزید معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ خیالات کے اظہار کے لئے فارسی زبان میں وافر ذخیرہ موجود تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں مقامی بولیوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ادبی زبان کا درجہ اختیار کر پاتی اور فارسی شاعری کے جلال وجمال کو اپنے میں جذب کر کے شاعری کے بلند مدارج تک پہنچ پاتی۔ کیوں کہ فارسی زبان سے اختلاط وادغام ان مقامی زبانوں میں ممکن نہیں ہوسکا تھا۔ کیوں زبان ایک سماجی عمل سے تشکیل پاکر فطری طور پر وجود میں آتی ہے۔ اگر اس کے فروغ پر مصنوعی قدغن عائد کردی جائے تو اُس زبان کا قدرتی سرچشمہ آہستہ آہستہ خشک ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق براہِ راست عوام سے ہوتا ہے۔ اگر زبان عوام کی مقبولیت حاصل کرنے سے قاصر رہی تو اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔ لیکن جہاں تک وؔلی کے فارسی مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سوال ہے، عوام کی زبردست مقبولیت اور پُر رفتار ارتقاء کو دیکھتے ہوئے، وؔلی نے فارسی مضامین کو اردو میں سمونے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں شاہ گلشن کا کوئی عمل دخل ہو ایسا ممکن نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وؔلی کی شاعری کو نیا موڑ دینے میں وہ عوامل اور اسباب کارفرماں ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں۔۔۔

> ''وؔلی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمالی کی زبان کو دکنی ادب کی طویل روایات سے ملا کر ایک کردیا، اور ساتھ ساتھ فارسی ادب کی رچاوٹ سے اس میں اتنی رنگارنگ آوازیں شامل کردیں اور امکانات کے اتنے سرے بھی ابھار دیئے کہ آئندہ دوسو سال تک اردو شاعری انھیں امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی۔'' ۱۸

یہاں اس موقع پر یہ بات ذہن نشین کرادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وؔلی جب ۱۷۰۰ء میں دہلی گئے تھے۔ اس وقت وہ ایک شاعر کی حیثیت سے دہلی گئے تھے۔ وہ کوئی نومشق شاعر نہیں تھے اور نہ ہی مشقِ سخن کر رہے تھے کہ اصلاح کے لئے ''شاہ گلشن'' کے پاس دہلی پہنچ گئے ہوں۔ کیوں کہ اس سے قبل شاہ گلشن اور وؔلی کے تعلقات کی بنیاد بھی قائم نہیں ہوئی تھی کہ وہ سیدھے اصلاحِ شعر کے لئے دہلی پہنچ جائیں اور اپنے کلام کی اصلاح چاہیں۔ اور وہ بھی ایک فارسی شاعر سے جو عموماً اس زبان ''ریختہ'' سے نابلد ہوتے تھے۔ اس لئے اس باتِ کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے کہ وؔلی ایک مکمل شاعر کی حیثیت سے ہی دہلی گئے تھے اور ان کا مقصد اپنی شاعری

کے ذریعے معاش کی تلاش تھی جیسا کہ راقم الحروف نے ''ولی کا سفرِ دہلی'' والے باب میں دلائل کے ساتھ رقم کیا ہے کہ وہ معاش کی تلاش میں متعدد مقامات کو سفر پر گئے تھے جن میں دہلی بھی شامل ہے۔ تاکہ اپنے لئے کسی کفیل کی تلاش کر لیں اور کسی امیر، رئیس یا حکمراں کی کفالت میسّر ہو جانے سے آلامِ روزگار کی پریشانیوں کا انجام آجائے۔

آپ ذرا تصوّر کیجئے اور سوچئے کہ جو شخص اپنی شاعری پر اتنا اعتماد رکھتا ہو کہ اس کے بل پر وہ کسی اعلیٰ مقام پر اپنے کفیل کی تلاش میں سرگرداں ہو، اور اپنی شاعری سے متاثر کر کے اپنے لئے ذریعۂ معاش کی تلاش میں نکلا ہو، بھلا کیا وہ شخص ایک نومشق شاعر ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی خود اعتمادی اس بات پر دلائل نہیں کرتی کہ وہ کسی سے اصلاحِ سخن کا محتاج نہیں؟ کیا ایسا شخص جو کسی فن یا ہنر میں طفلِ مکتب ہو اپنی کسی صلاحیت کی بنا پر سفرِ دہلی کو روانہ ہوگا؟ کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ولی اپنی شاعری کے فن میں یکتا تھے اور دکن کی شیعہ حکومتوں کے تغافل سے پریشان ہو کر انھوں نے مجبوراً دہلی کا رُخ کیا تھا جہاں سنّی العقیدہ حکمراں کی حکومت تھی۔ گویا وہ شخص جسے اپنے فن پر اتنا بھروسہ اور اعتماد ہو وہ شخص بھلا کسی کے مشورے کا اسیر ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے ولی شاہ گلشن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے دہلی نہیں گئے تھے، جیسا کہ ان کے بارے میں مذکور ہے۔ اس لئے مذکورہ تمام سوالات ایسے ہی ہیں کہ ایک صاحبِ عقل و فہم اسے مقبول نہیں کر سکتا اور ان مذکورہ سوالات کے متعلق اس کا جواب ہمیشہ نفی میں ہی ہوگا۔

کیوں کہ ولی کی پیدائش ۱۶۶۸ء کے مطابق جب وہ عیسوی سن ۱۷۰۰ء میں دہلی گئے، اس وقت ان کی عمر ۳۳ (تینتیس) سال رہی ہوگی اور یہ عمر انسانی زندگی کے اوسط کے حساب سے عمر کا نصف حصّہ ہے اور یہ عمر کسی استاد شاعر اور وہ بھی فارسی شاعر کے تلامذہ میں شریک ہونے کی نہیں، بلکہ ایک صاحبِ کلام شاعر کی ہے۔ اور ولی بھی غالباً اپنا بہت کچھ سرمایۂ کلام ساتھ لے کر دہلی گئے تھے اور باقاعدہ شاعر تھے۔ لیکن ولی کے کلام سے کوئی تاریخ معلوم نہیں ہوتی کہ کون سا کلام ۱۷۰۰ء یا اس سے پہلے کا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ۱۷۰۰ء میں اپنے سفرِ دہلی کے وقت ولی کے کلام کا وافر ذخیرہ تھا۔ جس میں اس دور کے دیگر بلند مشہور شعراء جو اس وقت دہلی میں موجود تھے ان سے ولی کی معاصرانہ چشمک کے اشعار کو دیکھتے ہوئے ولی کی حیثیت ایک استاد شاعر کے مسلّم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال میں ۱۷۰۰ء میں ولی کا کسی استاد کے شاگرد ہونے یا مشورے کے زیرِ اثر اپنی شاعری کو پروان چڑھانے یا فارسی کے بیکار مضامین کو کسی کی ایماء پر اپنی شاعری میں کام میں لانے

کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھی ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

''ہمیں اس بات پر حیرت ہونا لازمی ہے کہ آخر میاں صاحب (شاہ گلشن) عرصۂ دراز تک اس بات کے منتظر کیوں رہے کہ ولی، یا دہلی کے باہر والا کوئی آئے تو اُسے اپنا قیمتی مشورہ دیں؟'' ۱۹

غرض یہ کہ ۱۷۰۰ء میں ولی اور شاہ گلشن کی مبینہ ملاقات کے وقت مذکورہ دلائل وقرائن ہمیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ اُس زمانے میں کسی طرح بھی ولی کو مکتبِ سخن کا ابجد خواں نہیں کہا جاسکتا۔

دراصل ولی کی شخصیت پر اس کی شاعرانہ شہرت نے پردہ ڈال دیا۔ اب اُسے تذکرہ نویسیوں کی بے اعتنائی کہیے یا ولی کی کمالِ شہرت کی برکت کہ، ان کی تمام زندگی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ لیکن ولی کی شاعری ان کی شخصیت کا صادق عکس ہے۔ اس آئینہ میں اُن کی فطرت کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں، اس سے اُن کی شخصیت کے متنوع نقش دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ ولی اپنی زندگی میں ایک سیاح ہی واقع ہوئے تھے اور اس سیاحی کے تجربوں نے اُسے تجدد پسندی کی طرف مائل کیا تھا۔ اس لئے ولی کی شاعری جس نئی جہت کی طرف گامزن ہوئی اس کی بنیاد گلشن کی ملاقات نہیں، بلکہ دہلی اور دکن کے ہمہ گیر سیاسی اور لسانی اثرات تھے۔ جس نے ولی کے فکری ذہن کو برانگیختہ کر کے متحرک طرز پر رواں کردیا۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ولی کی شاہ گلشن سے مبینہ ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو کیا ولی کی شاعری میں یہ نیا تغیر پیدا نہیں ہوتا؟ کیوں کہ ولی کوئی پہلے شاعر نہیں تھے جنھوں نے دہلی کا سفر کیا تھا بلکہ اُن سے قبل اور بعد بھی شاعروں نے ایک مقام سے دوسرے مقام پر سفر کیا ہے اور وہاں قیام بھی کیا ہے جناب علی احسن مارہروی نے لکھا ہے کہ۔۔۔

''کسی سیاح شاعر کی سیر وسیاحت ایسی چپ چاپ اور ساکت وصامت نہ ہوگی جیسی ہمارے تذکرہ نویسوں کی غفلتوں سے بے چارے ولی کی دیکھی جاتی ہے۔'' ۲۰

اسی طرح محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''ولی کا سفر دکنی شعراء میں سے صرف ولی نے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ جب شمال اور جنوب میں گھر آنگن کا رشتہ قائم ہوا تو اس عہد کے دکنی شعراء مثلاً: بحری، فراق،

آزؔاد، وجدؔی، نورؔی، امامؔی اور رحماؔن وغیرہ برابر مائل بہ حرکت رہے اور ان میں سے اکثر شعراء نے دلّی کی سیر وسیاحت بھی کی ہے۔'' ۲۱

اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ وؔلی شمالی ہند (دہلی) اس وقت پہنچے جب دکن میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ غرض فارسی شاعری کی تمام مروجہ اصنافِ ادب ترقی کے مدارج ومنازل طے کر چکی تھیں۔ وؔلی کو شاید اس بات کا شدید احساس تھا، جیسا کہ راقم الحروف نے پچھلے اوراق میں لکھا ہے کہ دہلی میں پیدا ہوئی صورتِ حال کے نتیجے میں فارسی روبہ زوال کی طرف گامزن تھی، قصائد اور مراثی کی اتنی قدر وقیمت باقی نہیں رہ گئی تھی اور وہ دور مثنویوں کا دَور تھا۔ لہذا اس عہد کے تمام شاعر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر اسی صنف میں دکھلا رہے تھے اور صنفِ غزل بڑی حد تک نظر انداز ہو رہی تھی۔ یوں جس دور میں وؔلی نے صنفِ غزل کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، اس وقت یہ ایک کم مایہ صنفِ سخن تھی۔ لہذا وؔلی کے پیشِ نظر ریختہ (اردو) کی بڑھتی ہوئی مقبولیت تھی جس نے عوام کے علاوہ عالمگیر اُمراء اور رؤسا کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ غالبًا ان وجوہات سے جو تجربات ہوئے اس نے وؔلی کو اردو غزل گوئی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس لئے وؔلی کو اس جانب صرف ایک قدم بڑھانا تھا اور فارسی کے مضامین اور اردوئے معلّٰی کی زبان یہ دونوں چیزیں دلّی والوں کو اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔ غالبًا وؔلی نے یہی سوچ کر اپنی فارسی دانی کو بروئے کار لاتے ہوئے ان دونوں زبانوں کا ایسا حسین امتزاج پیش کیا کہ لوگ وؔلی کے اس نئے مخلوط کلام کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس نئے رنگ کے کلام نے ایسی اثر آفرینی پیدا کی کہ ہر طرف وؔلی کی شاعری کا غلغلہ بپا ہوگیا۔ لہذا وؔلی کی استادی کو مسلم کرنے میں کوئی رکاوٹ مانع نہ رہی۔ ڈاکٹر انور سدید نے وؔلی کی اس نئی کوشش کو ایک تحریک سے تعبیر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ---

''وؔلی کی تحریک نے جو چراغ جنوب میں جلایا تھا اس کی روشنی اکنافِ ہند میں پھیلی اور زبان وادب کو نیا معیار، منفرد لہجہ اور جداگانہ ذائقہ حاصل ہوگیا اور اُس زبان کی شاعری کا ڈنکا چاروں طرف بجنے لگا۔'' ۲۲

گویا یہ کہ وؔلی کی شاعری میں پیدا ہونے والے تغیر کے بنیادی محرکات وہ مذکورہ عوامل ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ حاصل بحث یہ کہ وؔلی کی تجدّد پسندی، ان کی سیّاحی کے تجربوں نیز ان کی فارسی دانی کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس لئے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ وؔلی کی شاعری کسی نہ کسی طور پر شاہ سعد اللہ

گلشن کی مثال، یا تعلیم کی مرہونِ منت ہے۔

الغرض یہ کہ تذکروں میں مذکور وؔلی اور شاہ گلشن کے متعلق جو بیان دہلی کے معتبر شعراء میر تقی میؔر اور قائؔم چاند پوری نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے اس سے وؔلی شبیہہ بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ وؔلی کی پوری شاعری شاہ سعد اللہ گلشن کی رہینِ احسان ہے۔ جنھوں نے انھیں (وؔلی) یہ مشورہ دیا کہ فارسی تراکیب اپنے شعروں میں سموئیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ''شاہ گلشن'' کے مشورے میں یہ بات بھی تھی کہ تم (وؔلی) سے اس بات پر محاسبہ کون لیگا؟ اور اس طرح کی باتوں کی تشہیر کے ساتھ یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ وؔلی کی پوری شاعری فارسی سے مستعار ہے اس ضمن میں فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ۔۔۔

''شفیق اورنگ آبادی اور وؔلی میں ہم وطنی کا تعلق تھا، لیکن اگر یہ نہ بھی ہوتا تو دکنی ہونے کی وجہ سے وؔلی کے بارے میں انھیں اوروں سے زیادہ معلوم رہا ہوگا۔ شفیق نے شاہ گلشن کا کوئی ذکر وؔلی کے ترجمے میں نہیں کیا ہے۔'' ۲۳

اس ضمن میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شفیق اورنگ آبادی'' کے تذکرے ''چمنستانِ شعراء'' کے حوالے سے بجاطور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ''شاہ سعد اللہ گلشن'' کے مشورے کی بات محض افسانہ طرازی ہے اور اس کا مقصد وؔلی کی شاعری کی وقعت کو کم کرنے کی بھی سازش ہے۔ اگر کچھ دیر کے لئے یہ فرض کرلیں کہ شاہ گلشن نے وؔلی کو کوئی مشوری دیا بھی ہو تو اس مشورے کی حقیقت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے انھوں نے چند جملوں میں کوئی خیال ظاہر کیا ہو، لیکن ان کا یہ خیال یا رائے زنی کسی طرح بھی وؔلی جیسے استاد شاعر کے کلام کو بدلنے میں معاون نہیں ہوسکتا۔ ایسا ممکن ہے کہ وؔلی نے جب سیّد ابو المعالی کے ہمراہ ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا اور وہاں شاہ گلشن سے ملاقات کی اس وقت چوں کہ وؔلی اپنے آبائی وطن اورنگ آباد دکن سے دہلی گئے تھے۔ لہٰذا ایسا ممکن ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں دکنی زبان کی گہری چھاپ کے سبب دہلی کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے سے قاصر رہا ہو اور اس موضوع پر گفتگو میں شاہ گلشن نے اپنی رائے یا اپنا خیال ظاہر کیا ہو کہ یہاں فارسی کا چلن زیادہ ہے۔ لہٰذا آپ (وؔلی) اپنے کلام میں دکنی الفاظ اور اثرات کو کم کیجئے اور یہاں دہلی کے چلن کے مطابق اپنے کلام میں فارسی زبان کی آمیزش کیجئے تبھی آپ کا کلام عوام میں مقبول ہوگا اور داد وتحسین بھی ملے گی اور آپ کے یہاں آنے کا مقصد بھی حل ہوگا۔ (جیسا کہ راقم الحروف نے لکھا ہے کہ وؔلی اپنی شاعری کے ذریعہ کسبِ معاش کی تلاش میں دہلی گئے تھے)۔ شاہ گلشن کے اس مبینہ مشورہ کو وقتی طور پر

فرض بھی کرلیں تب بھی دل ودماغ اِس بات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا کہ ''صرف اتنا سا مشورہ کسی شخص کی شاعری کو بنیادی طور پر تبدیل کرنے کا ضامن نہیں ہوسکتا۔''

ولؔی اور شاہ سعد اللہ گلشؔن کے مبینہ مشورے کو اگر قیاس کی بنیاد پر ایک تصوّری خاکے کے ذریعے ذہن کے پردے پر رونما کریں تو یہاں تک تو یہ بات قابلِ فہم ہوسکتی ہے۔لیکن یہ کہنا جیسا کہ میؔر صاحب نے لکھا ہے کہ ''فارسی کے بیکار مضامین کو اپنے ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کرے گا'' اس بات کو دوسرے عام لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ''فارسی کی نقل کرو'' لہٰذا اِس جملہ سے سیدھے سیدھے ولؔی کی ہتک کا پہلو نکلتا ہے اور ولؔی کی عظمت اور بلندی وبرتری کو دیکھتے ہوئے میؔر صاحب کے اس بیان میں حسد کی بو آتی ہے اور ان کا یہ مذکورہ بیان ولؔی کی عظمت کو کم کرنے کی خاطر شعوری طور پر دیا گیا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ دہلی ولؔی کے لئے اجنبی شہر تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے عزیز دوست سیّد ابو المعالی کو لے کر دہلی گئے جن کی دہلی میں آمد ورفت تھی اور ان کے دیگر بہت سے شناسا دہلی میں موجود تھے۔ جن میں شاہ گلشؔن بھی شامل ہیں، ظاہر ہے ولؔی کو اس اجنبی شہر میں شاہ گلشؔن کے ذرائع سے اپنی پہچان بنانے اور ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری نیز اپنی ذات کو لوگوں سے متعارف کرانے کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن ولؔی کا قیامِ دہلی چند روزہ یا چند ہفتوں اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اور کیا ہوگا۔ لیکن اس مختصر سے عرصہ میں بھلا کیا ولؔی اپنی شاعری کے ذریعے افقِ شاعری پر اس قدر مقبول ہوجاتے ؟ یا جیسا کہ قائؔم نے میؔر کے بیان کا اعادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ---

''یہاں (دہلی میں) آکر حضرت شیخ سعد اللہ گلشؔن کی خدمت میں باریاب ہوئے تو انھوں نے ریختہ گوئی کے لئے حکم دیا اور تعلیم کی غرض سے یہ مطلع کہہ کر ان کے حوالے کیا۔

خوبیِ اعجاز حسنِ یار اگر افشاں کرو
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں'' [۲۴]

غرض یہ کہ قائؔم چاندپوری نے اس بیان سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ولؔی نے شاہ گلشؔن سے ملاقات ۱۷۰۰ء تک شعر گوئی شروع ہی نہیں کی تھی حالانکہ ولؔی کی دہلی میں آمد کے وقت میؔر اور قائؔم دونوں ہی ناپید تھے اور ایک کی معلومات دوسرے سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اگر جیسے کہ قائؔم نے بیان کی ہے کہ شاہ گلشؔن سے ملاقات کے بعد ولؔی نے ریختہ گوئی شروع کی۔ تو یہاں ایک اور سوال یہ بھی ضرور ابھرتا ہے کہ ولؔی اس

وقت عمر کی ۳۳ (تینتیس) بہاریں دیکھے چکے تھے اور کیا تھا وہ اس عمر تک بس یوں ہی بیٹھے رہے تھے اور کوئی مشغلۂ زندگی اختیار نہیں کیا تھا؟ لہذا یہ بات اتنی آسانی سے گلے اترنے والی نہیں ہے۔ کیوں کہ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ولّی اس سے قبل ہی شاعری کا آغاز کر چکے تھے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو، ولّی کے دیوان کی دوبارہ دہلی میں آمد کا عرصہ انّیس برسوں پر مشتمل ہے۔ کیوں کہ ۱۷۱۹ء میں ولّی کا دیوان دہلی پہنچا تھا۔ لہذا اس عرصے میں ولّی اردو شاعری کے ابجد خواں سے ایک مسلم الاستاد شاعر کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیوں کہ ''دیوانِ کلام'' کسی بھی شاعر کی تمام عمر کا سرمایہ ہوتا ہے۔ لہذا اپنے سفر کے بعد ولّی نے شعر گوئی شروع کی ہو اس بات میں کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا۔

راقم الحروف کے خیال میں کہ اس بات کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ولّی کے کلام میں دکنّیت کی گہری چھاپ تھی اور اسی سبب غالباً ولّی کے کلام میں ایک طرح کی بے لطفی کا احساس ہوتا ہوگا اور شاید اسی سبب شاہ گلشن نے اس کمی کو دور کرنے کی غرض سے اپنی رائے دی ہو کہ ''دکنی الفاظ کی جگہ یہاں کے چلن کے مطابق فارسی کی آمیزش کرو'' جسے قائم چاند پوری نے ایک افسانہ بنا کر بہت کچھ اپنی رائے کا اضافہ کیا اور ولّی کو ایک ''نو مشقِ سخن'' شاعر کی حیثیت سے شاہ گلشن کا شاگرد بتا کر پیش کیا ہے۔ مذکورہ غزل کا مطلع موزوں کر کے دینے سے یہی معنی برآمد ہوتا ہے۔ گویا قائم چاندپوری کا بیان بھی میر پر اپنی فوقیت جتانے نیز ولّی کی شبیہ کو بگاڑنے کی بدنیتی پر محمول کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں۔۔۔

> ''شاہ گلشن کے مشورے سے پہلے ولّی نے جو غزلیں لکھی تھیں وہ کیا ہوئیں؟ کیا ولّی نے انھیں شامل دیوان نہیں کیا؟ اور اگر شامل دیوان کیا ہے تو پھر تو وہ مشورۂ گلشن کے بعد کہی گئی غزلوں سے کیوں کر مختلف ہیں؟'' ۲۵

جیسا کہ ولّی کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں بعض غزلیں ایسی ضرور پائی جاتی ہیں جو بالکل دکنی زبان اور پرانی روش پر کہی گئی ہیں۔ غالباً یہ وہی غزلیں ہوسکتی ہیں، جو ولّی نے اپنے سفرِ دہلی سے قبل بلادِ اورنگ آباد (دکن) میں کہی ہوں گی اور انھیں غزلوں کے ساتھ وہ دہلی وارد ہوئے ہوں گے۔ اس لئے قائم کا بیان جیسا کہ وہ ولّی کو ایک نومشق (نوسکھیا) شاعر بتا رہے ہیں۔ خارج از بحث ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ ولّی نے مشقِ سخن کی ابتداء اپنے آبائی وطن اورنگ آباد میں ہی اپنے تحصیلِ علم کے بعد ہی شروع کر دی تھی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظِ نظر رہے کہ عالمگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد جب اس نے دکن کی حکومتیں کو معلوب کرنے کی غرض سے اورنگ آباد میں قیام کیا اور وہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی، کہ دکن کے تمام خطّہ پر قابض ہوجائے۔ اس مہم خاص کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر لاکھوں افواج اور دیگر اُمراء اور فوجی افسران اس بڑے حملے میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے اور دہلی اور اس کے گردونواح کے علاقوں سے بڑی بڑی فوجیں فراہم کر کے دکن کو روانہ کی جاتی تھیں۔ نیز میدانِ جنگ میں ضروری تمام اشیاء واصلحہ کی فراہمی بھی دہلی سے ہوا کرتی تھی۔ لہذا اس جنگی مہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر تعداد میں افواج کی موجودگی اور پھر دکنی ریاستوں پر فتح یابی نے یہاں کی تہذیب وتمدن کو زبردست متاثر کیا، اور فاتح کا مفتوح پر یوں بھی غلبہ ہوتا ہے۔ یہ غلبہ لسانی اعتبار سے بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے جس نے دکن کی مقامی زبان سے خلط ملط ہوکر اپنے اثرات یہاں کی مقامی زبانوں پر ڈالے اور جیسے جیسے اورنگ زیب کی مقبوضات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے یہاں کی مقامی زبان کے اثرات کمزور ہوتے گئے اور پورے دکنی خطّہ پر دہلی اور اس کے گرد ونواح میں بولی جانے والی زبان کے اثرات حاوی ہوگئے۔

مذکورہ فوجی کاروائیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا لسانی تغیر تاریخ میں اپنی اہمیت کا حاصل ہے۔ جس نے شمال اور جنوب کی زبانوں کی آمیزش سے اردو زبان کی ہیئت اور ساخت کو برابر متاثر کیا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی، جس سے ولؔی بھی متاثر ہوئے اور جیسے جیسے دونوں خطّوں کی عوام کے درمیان تہذیبی اور تمدنی روابط بڑھے ویسے ویسے زبان میں بھی فرق آتا گیا۔ کیوں کہ اس سے قبل کے دکنی شعراء کا کلام اور طریقۂ نظم ایسا ہے کہ اگر ان کا تصفیہ (صرف کرنا) کیا جائے تو بمشکل اور وہ بھی شاید ایک جز ایسا منتخب ہوسکے جس کے لفظی مفہوم کو نہ صرف اہلِ دہلی بلکہ دکنی عوام بھی بغیر ہجّے کئے مطلب نہ بتاسکیں گے۔ اس کے برخلاف ولؔی کا کلام اپنی بعض دکنی طرز کی غزلوں کو چھوڑ ایسا ہے جسے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے گویا ان کے کلام کو بالا استیعاب (کسی کتاب یا مضمون وغیرہ کو شروع سے آخر تک پڑھنا) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولؔی بھی وقتاً فوقتاً اپنی قابلِ ترک روش کو چھوڑتے گئے ہیں۔ کیوں کہ جیسے جیسے عالمگیری افواج کا اقتدار بڑھتا گیا ویسے ویسے ولؔی کی صفائی زبان بھی ہوتی گئی۔

اس لئے ولؔی کے کلام میں جو نیا رنگ اور تبدیلی پیدا ہوئی وہ کسی شاہ گلشؔن کے مشورے کی مرہونِ منت نہیں، بلکہ وہ تہذیبی اور تمدنی میل جول کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ کیوں کہ ولؔی خود بلادِ اورنگ آباد میں موجود تھے

لوگوں سے عام تعلقات کی بنا پر زبان میں پیدا ہوا یہ لسانی تغیر ولی کی شاعری کو بھی اسی رنگ ڈھنگ میں کہنے پر مجبور کردیا۔ کیوں کہ ولی کا رشتہ بھی تو اسی سماج سے تھا جہاں یہ نئی زبان وجود میں آرہی تھی۔ لہذا اس زبان کے بولنے والوں سے ولی کے تعلقات کی بناء پر، نیز ولی خود بھی تو اسی سماج کا ہی حصہ تھے۔ لہذا وہ خود کو بھی کس طرح اس لسانی تغیر سے محفوظ رکھ پاتے۔

ولی کے کلام میں پیدا ہوئی تبدیلیاں اسی لسانی تغیر کا نتیجہ تھیں۔ کیوں کہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن کی حکومتوں کو مغلوب کر کے اورنگ آباد میں قیام کیا تو اس سبب سے ہندوستان وایران کے شاعروں سے یہاں کے مقامی شعراء کا ارتباط بھی بڑھا، تو رفتہ رفتہ زبان کی سادگی اور فارسی خیالات، فارسی تراکیب اور فارسی تشبیہات واستعارات کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ یہاں کے شعراء نے ان کی پیروی کو باعث فخر سمجھ کر ان کے رنگ میں طبع آزمائی شروع کی۔ ولی نے بھی غالباً انھیں اثرات سے مغلوب ہوکر فارسی تراکیب اور مضامین کو اپنی شاعری میں سمویا ہے اس لئے جہاں تک شاہ گلشن کے مبینہ مشورے کی بات ہے، راقم الحروف نے مدلل اور مختلف اسباب وقرائن کی روشنی میں اس مشورے کو بے بنیاد بتایا ہے اور اس کی نفی کی ہے۔ اور یہ ''مبینہ مشورہ'' محض ولی کی استادی اور مراتب کو شعوری طور پر مجروح کرنے کی سازش ہی نظر آتا ہے۔

نفسِ مضمون یہ کہ ولی اور شاہ گلشن کے مبینہ مشورے کے متعلق میر تقی میر اور قائم چاندپوری نے چاہے جس سمعی روایت کی بنیاد پر نقل کیا ہو، لیکن اس ضمن میں دستیاب تمام کوائف سے ایسی کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملتی جسے قطعی طور پر قبول کیا جاسکے۔ ولی اور شاہ گلشن کے مبینہ مشورے کی روایت کا منبع چوں کہ میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' سے شروع ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس روایت کو باضابطہ تحریری طور پر منظرِ عام پر لانے کا سہرا تو میر صاحب کے ہی سر ہے۔ اس لئے میر صاحب ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کو منظرِ عام پر لانے میں بانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے میر صاحب پر ہی یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات اپنے تذکرہ میں کی ہے۔ اس ضمن میں میر صاحب چاہے کتنے ہی صادق اور پاک دامن رہے ہوں، لیکن ان کی یہ کاوش ولی کی شہرت اور استادی میں ضرور بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔

نفسِ مضمون یہ کہ ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات اور اس سلسلے میں موجود تمام کوائف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ولی کی ۱۷۰۰ء میں دہلی میں آمد پر شعر وسخن کی محفلیں، شعراء کی ملاقاتیں، لطیفے اور اذکار یقیناً ہوئے ہوں گے لہذا محی الدین قادری زور اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔۔۔

''ولؔی نے بھی دلّی کا سفر کیا اور وہاں کے مشاعروں میں اپنا دکنی کلام سنا کر وہاں
کے شاعروں کو اتنا مسحور کیا کہ وہ اردو میں لکھنے پر مائل ہو گئے۔'' ۲۶؎

ولؔی کی اورنگ آباد سے دہلی میں آمد اور شہرت نیز شاہ گلشن کے میزبان ہونے کو ملحوظِ نظر رکھیں تو ولؔی اور شاہ گلشن کے مبینہ مشورے کی عقدہ کشائی اور اس افسانے کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ جیسا کہ راقم الحروف نے گذشتہ صفحات میں متفرق دلائل سے واضح کیا ہے۔ کیوں کہ شاہ گلشن فارسی کے استاد شاعر تھے اور کوئی غیر معروف شخص نہیں تھے اور اس زمانے میں ان کا آستانہ غالباً مرجع خاص وعام ہوگا۔ راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ میؔر اور قائمؔ کے تذکروں میں مذکور ولؔی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات چاہے جس نقطۂ نظر سے نقل کی گئی ہو بہر حال تذکروں کی بنیادی حقیقت اس تذکرہ نگار کی اپنی معلومات کے دائرے اور کچھ سمعی روایات پر ہی مبنی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان تذکروں میں مذکور تمام بیانات حقیقت پر ہی مبنی ہوں ایسا ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ان تذکروں کی حقیقت کسی آسمانی صحیفہ کی نہیں کہ اس میں درج تمام بیانات سے اتفاق کیا جائے۔ اس لئے ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ ولؔی کی شہرت کو دیکھتے ہوئے اس وقت دہلی کے کچھ حاسدین شعراء کی طبیعت پر ولؔی کی آمد اور پھر اس کی شہرت ناگوار گزری ہو۔ لہٰذا راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اسی زمانے میں دہلی کے کچھ مقامی شعراء کی طرف سے، ولؔی کے شاہ گلشن کے مہمان ہونے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات مشتہر کی گئی ہو کہ ''ولؔی کی شاعری شاہ گلشن کے مشورے کی مرہونِ منت ہے'' اور اس کے بعد کئی دہائیوں تک یہ سمعی روایت لوگوں میں چلتی رہی ہو اور میؔر کے تذکرہ لکھنے تک یہ بات ان کے کانوں تک بھی پہنچی ہو اور پھر انھوں نے اس سمعی روایت کی بات اپنے تذکرہ میں نقل کر دی ہو۔ اس لئے اس مشورہ کے خالق چاہے میؔر صاحب بھلے ہی نہ ہوں تب بھی اس افسانہ کو تحریری شکل میں منظرِ عام پر لانے کی ذمّے داری تو میؔر صاحب پر ہی عائد ہوگی۔ اس لئے ولؔی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات چاہے بھلے ہی سمعی روایات کی بناء پر ہو یا کہ میؔر صاحب کی بدنیتی پر، بہر حال، ولؔی کی شخصیت اس افسانہ سے ضرور مجروح ہوئی ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔۔۔

''ولؔی کے بارے میں جو افسانہ سب سے زیادہ مشہور ہے، وہ یہ ہے کہ شاہ گلشن
نے، جو دہلی میں قیام پذیر تھے ولؔی کو یہ مشورہ دیا کہ ''تم فارسی والوں کا طرز اور ان
کے مضامین اختیار کرو'' لہٰذا اس مبینہ مشورے کے جتنے دیر بعد تک ولؔی جیے ہوں،

اتنا ہی اچّھا ہے، کیوں کہ اگر وہ اس ''مشورے'' کے بعد جلد ہی راہی ملکِ عدم ہوگئے ہوں تو انھیں اس کا کوئی قابلِ لحاظ نفع اُٹھانے کا وقت نہ ملا ہوگا اور اگر ایسا ہے تو ولؔی کی زیادہ تر شاعری اس ''دہلوی / فارسی مشورہ'' کی مرہونِ منت نہیں اس کے برخلاف، اگر اس ''مشورے'' کے بعد ولؔی بہت دن جیے ہوں تو پھر ان کی شاعری پر اس ''دہلوی / فارسی مشورے'' کا احسان ثابت ہے اور جس حد تک یہ ''احسان'' ثابت ہے اسی حد تک ولؔی کے اپنے کارنامے کو توقیر کم ٹھہرے گی، اور ولؔی کی شاعری میں ان کی اپنی طبیعت کی اپج کم دکھائی دے گی۔'' ۲۷

الغرض یہ کہ مذکورہ مبینہ مشورہ چاہے جس شخص نے اختراع کیا ہو، یا اس کا تعلق ولؔی کے زمانے سے ہوتے ہوئے میؔر کے تذکرے ''نکات الشعراء'' تک جس سمعی روایت پر مبنی ہو بہر حال اس ''مشورے'' سے یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ اس مشورے کی بات کا حقیقت سے کوئی تعلق ممکن نہیں ہے بلکہ یہ ایک فرضی بات ہی معلوم ہوتی ہے اور صرف اور صرف ولؔی کی شاعری کو علاقائی تعصب کی بناء پر نظر انداز کر کے اُسے ساکنِ دہلی کے مشورے کے احسان کا گراں بار بتا کر ان کی وقعت کو کم کرنے کی ایک سازش کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں کہ ولؔی سے قبل دہلی کا کوئی شاعر اردو میں باقاعدہ طور پر غزل کی طرف مائل نہیں دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ولؔی نے باقاعدہ طور پر صنفِ غزل میں طبع آزمائی شروع کر کے شمالی ہند کے سنجیدہ اور اہم شاعروں کو اردو شاعری اور اردو غزل کہنے پر مجبور کردیا۔ نور الحسن ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ۔۔۔

''دہلی میں باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز تو ولؔی کے دیوان کے اثر سے محمد شاہ کے زمانے میں ۱۲۱۲ھ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس سے پیشتر بھی اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ خود ولؔی ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے تھے اور اُسی وقت سے ان کے کلام کی مقبولیت نے بہتوں کو اس طرف راغب کرلیا تھا اسی عام رغبت کو دیکھ کر بعد میں حاتؔم، آبؔرو، فائزؔ وغیرہ نے اردو میں شعر کہنا شروع کردیا'' ۲۸

غرض یہ کہ ولؔی کی شاعری دہلوی شعراء کے لئے ایک نمونہ قرار پائی اور دہلی کے فارسی دانوں نے یہ محسوس کیا کہ اب اس ریختہ (اردو) زبان شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے لائق بن گئی ہے۔ اسی لئے ولؔی کی ایماء پر اردو شاعری اور خاص طور پر غزل کی طرف جس طرح اس زمانے کے شعراء متوجہ ہوئے، یہ ولؔی ہی

کے بدولت ہوئے تھے۔ لیکن اس سے قبل وہ اس زبان سے بے اعتنائی برتتے تھے اور اُسے چنداں لائق اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب ولی نے اپنی شعری تخلیقات کے نت نئے رنگ اس زبان میں پیش کیے تو اس زمانے کے صاحبِ ذوق ہی نہیں بلکہ عوام بھی اس نئی رنگ کی شاعری کو سراہنے لگی۔ یہ ولی کا ایسا کمال تھا کہ جس نے اُسے اُفقِ شاعری پر ایک ''مجدّدِ غزل'' بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس لئے باشندگانِ دہلی نے اس کی عظمت کا اعتراف تو ضرور کیا اور اس کے کلام کو سراہا بھی لیکن ولی کو علاقائی تعصّب کی بنا پر غیر ملکی تصوّر کر کے اُسے قبول کرنے سے قاصر رہے۔

المختصر یہ کہ اس وقت کے باشندگانِ دہلی اس بات کو اتنی آسانی سے کیسے قبول کر لیتے کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز ولی سے ہو، یا یہ کہ ولی نے دہلی والوں کو اردو شاعری سکھلائی، لہٰذا ولی کے شعری کارنامے کی وقعت کو علاقائی تعصّب کی بنا پر نظر انداز کر کے دانستہ طور پر چشم پوشی کی گئی۔ لہٰذا ولی کی شاعری کو کسی دہلوی / فارسی شعراء کے احسان کی مرہونِ منت بتا کر اُسے نظر انداز کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔

اس ضمن میں راقم الحروف کا یہ بھی ماننا ہے کہ یہ کوشش اس دور کے کسی فردِ واحد تک محدود نہیں تھی بلکہ اس دور کے تمام شعراء پر یہ الزام صادق آتا ہے کہ ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کی بات کو مشتہر کرنے میں ان سبھی کی متفقہ رائے شامل ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ضرور اس فرضی مشورے کی بات کو ہوا دینے کی بابت میں اس دور کے سخن گویوں میں بھی اختلافِ رائے ہوتا لیکن اس ضمن میں ان تمام کی خاموشی ولی کے متعلق اس غلط بیانی کو رواج دینے میں معاون ثابت ہوئی ہو، اور اسی کوشش میں غالباً شاہ گلشن والا واقعہ ایجاد ہوا ہو، یا کہ اگر ولی کی طرز پر دہلی کے شعراء مائل بھی ہوئے اور اس کے رنگِ سخن کو اپنایا ہے تو وہ ہمارے یہاں کے ہی فارسی شاعر (شاہ گلشن) کا ودیعت کردہ ہے اور انھیں کے مشورے کی دین ہے۔ کیوں کہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اس میں حسد کا مادّہ کارفرماں ہے اور اس انسانی دماغ نے ابتداء سے ہی حد بندیوں کو اپنی زندگی میں برتا ہے اور یہ حد بندیاں انسانی زندگی کے ہر حصّے میں اپنا جلوہ دکھاتی رہی ہیں۔ گویا یہ کہ ولی دہلوی نہ ہوتے ہوئے بھی یہاں کی سرزمین پر اپنی صلاحیتوں کو لوہا منوالیے۔ اس لئے یہ بات اخلاقی طور پر قبول نہ کر پانے کی اٹکلوں نے ولی اور شاہ گلشن کے مشورے کو مشتہر کیا ہے۔ جس نے ولی کے وقار کو کم تو نہیں کیا لیکن مجروح تو ضرور ہی کیا ہے۔

مذکورہ مباحث سے اس حقیقت کا انکشاف ہوجاتا ہے کہ ولی کی شاعری ''شاہ گلشن'' کے مشورے کی

رہینِ احساس نہیں بلکہ ان کی اپنی طبیعت کا خاصہ ہے۔ لیکن یہ بھی اتنی ہی تلخ سچائی ہے کہ اگر میر نے اس مبیّنہ مشورے کو ضابطۂ تحریر میں لانے کی غلطی نہ کی ہوتی تو آج ولی کے وجود پر یہ بدنما داغ نہ ہوتا اور اس کی عظمت میں مزید چار چاند لگے ہوتے۔ اور ان کے بعد کے شعراء فخر سے انھیں اپنا استاد مانتے اور ان کی استادی کے اعتراف میں اپنی خودستائی سے پرہیز کرتے۔ حالانکہ اس دور کے تمام اہم اور قابلِ ذکر شعراء ولی کو ہی اپنا استاد اور رہنما مانتے رہے ہیں لیکن ان کے اشعار اس نوعیت کے ہیں گویا وہ اپنی ذات کو ولی کے ہم پلّہ گردانتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار دیکھئے جسے پڑھ کر قاری عجب سے تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔

شاہ حاتم کا یہ شعر دیکھئے۔۔۔

ے حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی، ولی ہے جہانِ سخن کے بیچ

اسی طرح شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر دیکھئے۔۔۔

ے آبرو شعر ہے ترا اعجاز
جوں ولی کا سخن کرامت ہے

ے ولی ریختہ بیچ استاد ہے
کہے آبرو کیوں کہ اس کا جواب
و لیکن تتبع سیں کہنا سخن
کرے فیض سوں فکر میں کامیاب

حاصلِ بحث یہ کہ مذکورہ بالا اشعار سے عجب گومگو کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ ولی کے متعلق مشہور ''شاہ گلشن'' کا مبینہ مشورہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہوا ہوتا تو بعد کے تمام شعرائے اردو غزل کے اس ''ابو الآباء'' کی استادی میں سرِ تسلیم خم کر لیتے اور ان کی مسلم الاستادی کا اعتراف بھی کرتے تو ان کا انداز نہایت پُر انکسار اور مؤدبانہ ہوتا۔ خیر اس دور کے شعراء نے ولی کی استادی کا اعتراف تو ضرور کیا ہے کیوں کہ ولی نے بالخصوص غزل کی ترقی کے امکانات بہت روشن کر دیئے تھے اور صرف وہی اُس (غزل) کے موجّد معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ شمالی ہند میں انھیں کے دم سے اردو شاعری میں گہما گہمی شروع ہوئی تھی۔ لیکن اس گہما گہمی کے فوراً بعد اردو شاعری ایہام گوئی کے خارزار میں الجھ کر رہ گئی تھی اور ولی کے بعد کے ہر شعراء نے

اس فن میں کمال حاصل کیا جن میں حاتم، آبرو، میر، شاکرناجی اور میرزا جانِ جاناں وغیرہ، سبھی پر اس ایہام گوئی کا خبط سوار رہا تھا۔ لیکن جب عوام اور شعراء دونوں نے اس قسم کی شاعری کو ناپسند کیا اور یہ تلاش وجستجو شروع ہوئی کہ اردو شاعری بالخصوص غزل میں ایہام گوئی کی ابتداء کہاں سے ہوئی ؟ تو اس کا الزام بھی کسی دہلوی شاعر کے سر نہ آیا بلکہ ایک غیر ملکی ہونے کی غرض سے ولی کو ہی اس کا ذمّے دار ٹھہرایا گیا کہ انھوں (ولی) نے ہی اپنی شاعری میں ایہام گوئی کو فروغ دیا اور ولی ہی اس کے خالق ہیں۔

جب کہ حقائق بالکل اس کے برعکس ہیں۔ ولی نے اپنی شاعری میں حسبِ ضرورت کہیں کہیں بطورِ صنعت ہی ایہام کا سہارا لیا ہے۔ یوں ایہام گوئی کے فروغ کی ذمّے داری ولی کے بعد کے شعراء پر عائد ہوتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی مایۂ ناز تصنیف میں لکھا ہے کہ اردو شاعری میں ایہام گوئی سنسکرت ہوتی ہوئی ہندی سے آئی ہے۔ تو پھر بھلا ولی کہاں اس صنعت کو فروغ یا رواج دینے کے ذمّے دار ٹھہرے؟ لیکن جیسا کہ راقم الحروف نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک غیر ملکی ہونے کے ناطہ جس طرح ولی کی شاعری اور اس کی عظمت کا اخلاقی طور پر اعتراف نہ کر پانے کی شکل (دقت) میں ولی اور شاہ گلشن کے مشورے والا واقعہ ایجاد ہوا اسی طرح ایک بدیسی اور غیر ملکی ہونے کی غرض سے اردو شاعری میں ایہام گوئی کے فروغ کی ذمّے داری کے لئے بھی ولی کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا گیا اگر ولی کی شاعری کے متعلق پہلا الزام عائد نہ ہوتا تو شاید ممکن تھا کہ اس الزام سے بھی ولی بری ہوتے۔

ولی کے متعلق مبینہ الزامات صدیوں سے لگے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں حقیقت کی تلاش وجستجو جاری رہنی چاہیے۔ ان الزامات کے باوجود ولی اردو شاعری میں قد آور، فعال اور تخلیقی شخصیت کے مالک ہیں۔ جنھوں نے غزل میں نئی خوشبو اور نزاکت پیدا کی اور اس خوشبو اور نزاکت کو پیدا کرنے میں انھوں نے ''ریختہ'' اور فارسی زبان کی آمیزش سے ایسا کیمیائی امتزاج پیش کیا کہ اس زبان کی غرابت دور ہوگئی اور اردو غزل ترقی کے اس سفر پر رواں ہوگئی، جہاں اُسے ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے اردو غزل کو نئی زندگی، نیا رنگ وآہنگ بخشنے میں ولی کی اپنی واحد ذات کا حصّہ ہے، اور اس میں کسی کے مشورے کا عمل دخل نہیں، اس اعتبار سے ولی اردو غزل کے بانی اور ''ابو الآباء'' تھے اور ہیں۔ اِس اعتبار سے ولی کی عظمت اردو شاعری میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

★★★★★★★

حواشی

باب پنجم (ب) :- ولؔی اور شاہ سعد اللہ گلشنؔ

۱	تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ص : ۱۳۰،۱۲۹
۲	نکات الشعراء	میر تقی میرؔ	ص : ۹۴
۳	مخزنِ نکات	قائمؔ چاندپوری	ص : ۱۱۰
۴	تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسنؔ	ص : ۲۱۴
۵	آبِ حیات	محمد حسین آزادؔ	ص : ۸۴
۶	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خان	ص : ۳۳،۳۴
۷	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	ص : ۱۲۸،۱۲۷
۸	تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ص : ۱۲۹
۹	خطباتِ عبد الحق	مولوی عبد الحق	ص : ۱۹۲
۱۰	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	ص : ۱۲۹
۱۱	انتقادیات	نیاز فتحپوری	ص : ۱۷۲
۱۲	ولؔی گجراتی	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی	ص : ۱۴۰
۱۳	ولؔی گجراتی	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	ص : ۷۲
۱۴	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	ص : ۱۳۱
۱۵	ایضاً	ایضاً	ص : ۱۳۲
۱۶	غالبؔ حقیقت کے آئینے میں	ہنس راج رہبر	ص : ۳۳
۱۷	کلّیات ولؔی	جناب علی احسن مارہرویؔ	ص : ۲۴
۱۸	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ص : ۵۲۹

۱۹	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	ص : ۱۳۱
۲۰	کلّیاتِ ولؔی	جناب علی احسن مارہروؔی	ص : ۱۷
۲۱	دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زوؔر	ص : ۱۳۰
۲۲	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	ص : ۱۸۳
۲۳	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	ص : ۱۳۳
۲۴	مخزنِ نکات (قائمؔ چاند پوری)	تلخیص و اردو ترجمہ از عطا کاکوی	ص : ۱۰۵
۲۵	مجلّہ : ایوانِ اردو (جولائی ۲۰۰۵ء) ''ولؔی دکنی'' پروفیسر صادق		ص : ۵
۲۶	دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زوؔر	ص : ۱۷۹
۲۷	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	ص : ۱۲۶
۲۸	کلّیاتِ ولؔی	جناب علی احسن مارہروؔی	ص : ۵۹

☆☆☆☆☆☆☆

chapter - 6

باب ششم

ماحصل

باب ششم
ماحصل

وؔلی اردو شاعری کے افق پر طلوع ہونے والے ایک ایسے درخشندہ ستارے ہیں، جن کی شہرت کی روشنی ہندوستان گیر پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور اس شہرت کی بنیاد ان کی غزل گوئی ہے۔ وؔلی نے اردو غزل کو اپنے نت نئے تجربات سے اتنا دلچسپ اور اتنا پُر لطف بنا دیا کہ ہر خاص وعام غزل کی طرف متوجہ ہوگیا اور دیگر اصنافِ نظم پر بھی اس کا غلبہ ہوگیا اور اس غزل کے ترقی کے امکانات اتنے روشن ہوگئے کہ وؔلی کے بعد سے لے کر آج تک ہر شخص اس کا مدّاح ہے۔ وؔلی کی بدولت اردو غزل کا دائرہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوگیا کہ آج تک اردو غزل کو جو ترقی اور فروغ حاصل ہوا ہے اس کا سہرا صرف وؔلی کے سر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وؔلی اردو غزل کے ''باوا آدم'' یا ''ابو الآباء'' ہیں۔ اس لئے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آج ہم اردو غزل کو جن بلندیوں پر دیکھ رہے ہیں وہ وؔلی کی اُسی جدّتِ طبع اور تنوّع کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اپنی غزلوں میں برتا تھا۔

وؔلی کا یہ کارنامہ تھا کہ انھوں نے اپنے زورِ بیان سے اُردو غزل کا مرتبہ اتنا بلند کردیا کہ فارسی زبان میں شعر گوئی کرنے والے فارسی شعراء کی للچائی ہوئی نظریں اس پر پڑنے لگیں اور وہ بھی اردو شعر گوئی کی طرف مائل ہونے لگے اس کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی کہ وؔلی سے قبل اردو شاعری ناپید تھی یا اس کی روایت کمزور تھی، بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ وؔلی سے قبل دکن میں ایک بہت طویل شعری روایت اپنی تمام ترقی اور شاعرانہ خوبیوں اور امتیازات کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن اس پر مقامیت کا رنگ بہت گہرا اور شدید تھا۔ وؔلی نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ دکن کی طویل شعری روایات کو شمالی ہند کی زبان سے ملا کر ایک کر دیا۔ گویا یہ کہ وؔلی نے اردو شاعری میں دکنی اور عجمی روایات کو ملا ایسا خوبصورت امتزاج پیش کیا کہ اس انضمام سے اردو ادب کی نئی روایات نے خوب فروغ حاصل کیا۔

یوں تو وؔلی سے قبل غزل ضرور موجود تھی لیکن اس کا دائرہ نہایت تنگ تھا اور اُسے بس اس قدر سمجھا جاتا تھا کہ غزل محض عورتوں سے بات کرنے اور اس قسم کے عاشقانہ خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ

اُس زمانے میں اردو غزل خواتین کے اردگرد طواف کرتی ہوئی نظر آتی تھی نیز انداز بے حد عامیانہ ہوتا تھا۔ گویا یہ کہ غزل حُسن کے خارجی موضوعات کے بیان تک محدود تھی۔ یہ ولؔی کا ہی کارنامہ تھا کہ انھوں نے اپنی جدّت پسند طبیعت سے غزل میں نت نئے موضوعات پیش کئے اور اس طرح غزل کا دامن اتنا وسیع ہوگیا کہ اس میں ہر طرح کے خیالات کی گنجائش اور جیسا کہ میر حسؔن نے کہا ہے کہ۔۔۔

''ابتدائے ریختہ از وست۔ اوّل استادیٔ این فن نام اوست''

ولؔی نے صنفِ غزل کو اپنا خاص میدان بنایا اور اپنی شعری صلاحیتوں وتیغ زبان کے وہ جوہر دکھائے کہ انھیں اردو شاعری میں ایک مجتہد کا مقام حاصل ہوا اور اردو غزل میں ان کی حیثیت استاد الاساتذہ کی مسلم ہوگئی۔ انھوں نے اردو کی ابتدائی زبان یا دکنی زبان سے فارسی روایت کو جوڑ کر غزل کو ایک نیا آہنگ دیا اور اپنی غزلوں میں فارسی الفاظ اور تراکیب کو اس فنی چابکدستی سے برتا کہ اردو غزل کی دنیا ہی بدل گئی۔

لیکن ولؔی اپنی تمام تر اوّلیت اور استاد الاساتذہ ہونے کے باوجود ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے لئے نسبتاً ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں غالباً اس کی وجہ ان کی شاعری کی اس قدر مقبولیت بھی ہوسکتی ہے جو ان کی ذاتی اور شخصی زندگی پر حاوی ہوگئی، کہ ان کے خاندانی حالات، نام، وطنیت، وغیرہ پردۂ اخفا میں پڑ گئے۔ اس لئے اگر ہم، جب اس عظیم شاعر کی شخصی زندگی کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں انہی اوراق پارینہ کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، جنھیں تذکرہ کہا جاتا ہے۔ اس لئے ان تذکروں کے مطالعے سے جن میں ولؔی کے متعلق کچھ معلومات ملتی ہیں، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولؔی جسے ہم اردو شاعری اور بالخصوص غزل کا ''ابو الآباء'' سمجھے ہوئے ہیں، وہ تو، تمام تذکرہ نویسوں کی بے پروائیوں سے اختلافات کی نیرنگیوں میں ایسا گھرا ہوا ہے صحیح حالات وانکشاف تو دور خود ولؔی کے نام پر اتنے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی کہ تذکروں کی اپنی حیثیت ایک یادداشت کی ہے اور اس کا ماٰخذ سمعی روایات یا مؤلفِ تذکرہ کی اپنی معلومات نیز اس کی اپنی ذاتی رائے پر مبنی تھا۔ لہذا ولؔی کے زمانے میں تو نہیں لیکن اُن کی وفات کے بعد جب تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا تو سنی سنائی سمعی روایات کی بناء پر تذکرہ نگاروں نے شعراء کے حالات چند سطروں میں لکھ کر نیز چند عمدہ اشعار نقل کر کے تذکروں کی تخلیق کی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ ان تذکروں کی معلومات کا ماٰخذ سمعی روایات تھیں۔ لہذا متفرق تذکرہ نگار جنھوں نے ولؔی کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے، ان کی معلومات کا ماٰخذ یا سمعی روایات علیٰحدہ علیٰحدہ تھیں۔ اور

اُس پر اپنی بعض طرح کی قیاس آرائی اور رائے زنی کے وؔلی کے متعلق دستیاب کوائف کو زیادہ پیچیدہ اور پُر معمّہ بنادیا۔ ایسا ممکن ہے کہ وؔلی کے نام، وطنیت اور دیگر متنازعات جو موجودہ زمانے تک معرضِ بحث ہیں، اس کی وجہ تذکرہ نویسوں کی ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش یا ایک کی معلومات دوسرے سے زیادہ تھی یہ دکھانے کی غرض سے بھی حیطۂ تحریر میں لایا گیا۔ یا ایک تذکرہ نگار کی معلومات دوسرے سے زیادہ نہ تھی شاید اس بناء پر ہی وؔلی کی ذاتی اور شخصی زندگی کے متعلق متفرق آرائیں ملتی ہیں۔ خیر وجوہ جو بھی رہی ہوں، ان تذکروں میں مذکور وؔلی کے متعلق بیانات نے ان کی شخصی زندگی کے معمّہ کو اتنا متازع فیہ بنادیا کہ وؔلی کی پوری زندگی ایک مسلّم استاد شاعر کی نہ ہوکر ایک ادبی سیاست کا حصّہ ہوگئی۔

وؔلی کو اس ادبی سیاست کا حصّہ بنانے میں کچھ تو یہ تذکرہ نگارہ ذمّے دار ہیں جنھوں نے وؔلی کے متعلق بے احتیاطی سے کام لیتے ہوئے اُسے کبھی ساکنِ ''دکن'' یا ''اورنگ آبادی'' لکھا تو کہیں کسی نے ''احمد آبادی'' یا ''گجراتی'' اسی طرح وؔلی کے صحیح نام کا پتہ لگانا تک مشکل ہوگیا ہے۔ کوئی اُنھیں وؔلی محمد، شمس الدین، شمس وؔلی اللہ، محمد وؔلی یا شاہ وؔلی لکھتے ہیں۔

الغرض یہ کہ وؔلی کے متعلق یہ اختلافات اتنے شدید اور قوی ثابت ہوئے کہ موجودہ زمانے تک بھی ہم بعض اختلافات کا قطعی طور پر حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ وؔلی کے متعلق ان متنازعات کو دیکھ کر ایک عام فہم شخص بھی کش مکش میں پڑ جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ آخری ایسی کونسی وجوہات ہیں جس کی بنا پر وؔلی جیسے عظیم شاعر کی زندگی ان متنازعات میں الجھ کر رہ گئی۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ وؔلی کے متعلق معرضِ بحث تمام باتیں جو شدید اختلافی شکل اختیار کرگئی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وؔلی نے عہدِ طفلی میں حصولِ تعلیم کی خاطر صوبۂ گجرات کے شہر ''احمد آباد'' کا سفر کیا تھا۔ جہاں ''مدرسۂ علویہ، حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ'' علم وہدایت کے لئے ملک گیر پیمانے پر مشہور ومعروف تھا اور تشنگانِ علم اپنی علمی تشنگی کو دور کرنے علمی سیرابی کے لئے یہاں دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ اور پورے ہندوستان میں ''مدرسۂ علویہ'' مشہور ومعروف تھا۔ اس زمانے میں والدین کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اپنے لختِ جگر کو اس مدرسہ میں تعلیم دلواکر اُسے ایک مکمل انسان بنائیں، مدرسۂ علویہ جو کہ ایک خیراتی اور اقامتی مدرسہ تھا۔ اس لئے جیسا کہ راقم الحروف نے وؔلی کی حیات والے باب میں مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وؔلی کے والدین اور آباء واجداد اہلِ دولت نہیں بلکہ عام لوگ تھے۔ گویا یہ کہ وؔلی کے

والدین یا خاندانی افراد کسی امرِ خاص میں مشہور ومعروف نہیں تھے اور غالباً مفلوک الحال تھے۔ لیکن علم کے شیدائی اور اس کی اہمیت اور افادیت کو جاننے والے ضرور تھے۔ اسی لئے انھوں نے اپنے فرزندِ انجمن کو اتنے دور احمد آباد، صوبہ گجرات میں حصولِ تعلیم کے لئے بھیجنا گوارا کرلیا تا کہ علم کے نور سے منوّر ہو جائے۔

اُس زمانے میں احمد آباد میں علماء مشائخ کا سکّہ چلتا تھا اور تمام سلسلے کے خدا رسیدہ شوخ موجود تھے۔ ایسے علمی ماحول اور صحبتوں سے وؔلی کے خمیر میں جو صلاحیتیں پوشیدہ تھیں، اُسے نکھرنے کا خوب موقع ملا۔ اور وؔلی چونکہ بذاتِ خود حساس طبیعت کے مالک تھے۔ لہٰذا اس علمی ماحول نے وؔلی کے فنی جوہروں کو جلا دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ گویا یہ کہ اسی علمی ماحول نے وؔلی کی غیر معمولی لیاقتوں کو ابھرنے کا خوب موقع دیا اور نتیجتاً وؔلی کو ایک مجتہد، بے مثال شاعر اور امامِ غزل بنادیا۔

اُس زمانے میں مدارس کا ذریعۂ تعلیم عربی اور فارسی ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا وؔلی نے فارسی کے مشہور ومقبول شعراء کے کلام کو بڑی دل جمعی سے پڑھا اور وؔلی کے کلام میں پائے جانے والے فارسی شعراء کے تخلص جنھیں وؔلی نے بعض غزلوں میں بطورِ قافیہ استعمال کیا ہے اور اپنے محبوب کے سراپے کے بیان میں اُس کے بعض جسمانی اعضاء کو انھیں فارسی کے مشہور ومعروف شعراء کے تخلص سے تشبیہ دی ہے۔ جسے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وؔلی فارسی شعراء کے کلام سے کس قدر متاثر تھے۔ ان فارسی شعراء میں انورؔی، جماؔلی، روؔمی، جاؔمی، فردوؔسی وغیرہ ہیں۔ لہٰذا ان شعراء کے تخلص کا وؔلی کے کلام میں پایا جانا اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وؔلی بذاتِ خود فارسی زبان وادب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کی فارسی دانی میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

غالباً جہاں اس ''مدرسۂ علویہ'' نے وؔلی کو تعلیم دے کر انھیں غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بنادیا، وہیں وؔلی کا یہ سفرِ گجرات ان زندگی کے بارے میں پائے جانے والے متنازعات کا منبع بھی ثابت ہوا۔ اگر وؔلی نے حصولِ تعلیم کی خاطر صوبۂ گجرات (احمد آباد) کا سفر نہ کیا ہوتا اور تحصیلِ علم کے لئے ایک طویل مدّت تک غالباً سات تا دس سال تک یہاں قیام نہ کیا ہوتا تو شاید آج وؔلی کی وطنیت، نام اور جائے پیدائش اور وفات وغیرہ کا کوئی جھگڑا نہ ہوا ہوتا۔ گویا یہ کہ اس سفرِ گجرات نے وؔلی کی عظمت کو مجروح کرنے میں ایسا اہم رول ادا کیا کہ وؔلی دکن اور گجرات دونوں سرحدوں میں بٹ کر رہ گئے۔ گویا یہ کہ وؔلی کی پوری زندگی ادبی سیاست کی نظر ہوگئی۔ لہٰذا علماء اور محققین حضرات نے اگر اپنی نوکِ قلم کو وؔلی کے عنوان سے جنبش دی تو صرف اس لئے کہ تذکروں

میں مذکور وؔلی کے متعلق بیانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نیز وؔلی کے کلام کی روشنی میں اُنھیں ''دکنی'' یا ''گجراتی'' ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیوں کہ اردو ادب میں وؔلی کی وطنیت، نام اور جائے پیدائش ایسے سلگتے ہوئے سوالات ہیں، جن کا آج تک علمائے ادب حل تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔

لیکن اتنا ضرور ہے کہ وؔلی جیسا کہ اردو غزل کے ''ابو الآباء'' مانے گئے ہیں، اس اعتبار سے بھی وؔلی کی اپنی ادبی حیثیت اتنی بلند ہے کہ ان پر اگر کوئی شخص قلم اُٹھاتا ہے تو وہ اردو ادب کے پڑھے لکھے طبقے میں ضرور معروف ہوجاتا ہے۔ لیکن اس بات سے کچھ دیر قطع نظر کرتے ہوئے وؔلی کے متعلق پائے جانے والے بنیادی اختلافات جن میں خصوصاً نام، وطنیت اور جائے پیدائش کو خاص دخل ہے۔ یوں اگر اِس بنیاد پر بھی کوئی شخص دانستہ خامہ فرسائی کرتا ہے تو بھی اردو ادب میں بحث کا موضوع بن جاتا ہے۔ اس لئے بعض اہلِ قلم حضرات نے خود کی ذات کو اردو ادب میں متعارف کروانے کی غرض سے بھی وؔلی کو زیرِ بحث لائے ہیں اور بعض نئے متنازعات کو رواج دینے کی بھی کوشش کی ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر وؔلی زندگی کے متنازعات کا حل انہی کے کلام کی روشنی میں تلاش کیا جائے کو وؔلی کے متعلق بہت سے متنازعات کا بآسانی حل مل جاتا ہے۔ یہاں اس موقع پر اک سوال ضرور ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ آخر وؔلی کی ذاتی زندگی کے بارے میں تمام حالات گمنامی میں کیوں ہیں اور تمام حالات ایسی تاریکی میں کیوں پوشیدہ ہیں؟ کہ بغیر قیاس کا سہارا لئے کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ آخر اس کا کیا سبب ہوسکتا ہے؟ تو جیسا کہ راقم الحروف کا خیال ان متنازعات اور گمنامی حالات کی وجوہات مندرجۂ ذیل ہوسکتی ہیں۔

اوّل :- وؔلی کے آباواجداء غیر معروف اور عام لوگوں میں سے تھے اور شاہی دور میں بھی اس خاندان کے کسی فرد کو کوئی اعلیٰ منصب یا عہدہ نہیں ملا تھا اور اگر وؔلی کے والدین یا اعزّہ وغیرہ میں سے کسی کو اعلیٰ عہدہ ملا ہوتا تو تاریخ میں ان کا کوئی نہ کوئی ذکر ضرور ملتا۔

دوم :- وؔلی کے والدین بذاتِ خود عام اور مفلوک الحال رہے ہوں گے لیکن تعلیمی ذوق کی بناء پر وؔلی کو خیراتی طرز کے مدارس میں تعلیم دلوانے پر مجبور تھے۔

سوم :- وؔلی کی دکن اور گجرات کے درمیان مسافرت کی وجہ سے دونوں مقامات کے لوگوں سے مستقل طور پر تعلقات استوار نہ ہوئے غالبًا اسی وجہ سے لوگوں میں بھی ان کے متعلق بہت کم معلومات رہی ہوگی۔

چہارم :- ولی نے جب شعر گوئی کی ابتدائی کی اس زمانے میں وہ غالباً ایک عام شاعر اور شاید صوبائی یا ملکی سطح پر بالکل ہی غیر معروف رہے ہوں گے۔

پنجم :- ولی کے زمانے میں دکن میں تمام حکمراں شیعہ تھے اور ولی یقینی طور پر سنی العقیدہ تھے۔ ان شیعہ شاہانِ دکن کے تغافل نے غالباً ولی کو ۱۷۰۰ء میں اپنے پہلے سفر دہلی کی طرف رجوع کیا، جہاں سنی العقیدہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی اور اس مرکزی شہر میں اپنی پذیرائی کا ولی کو قوی یقین تھا اور کسی اعلیٰ مقام پر رسائی حاصل کرنے کے امکانات بھی روشن تھے۔ لیکن چوں کہ اس زمانے میں ولی کی شاعری پر دکنیت کی گہری چھاپ تھی اور فارسی طرز واسلوب کی کمی بھی، لہذا دہلی میں ولی کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی اور وہ اپنے اس سفر کے تجربوں کے ساتھ اورنگ آباد دکن لوٹ آئے۔

لیکن چونکہ راقم الحروف کا قوی یقین ہے کہ ولی سنی العقیدہ تھے اور اسی وجہ سے شاہانِ دکن کے درباروں میں ان کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ لہذا ولی اپنی اس کس مپرسی کی بناء پر اپنی نظریں شمالی ہند کی طرف اُٹھائیں، جہاں ان کی قدر افزائی کا معاملہ بن سکتا تھا۔ لیکن دہلی میں ولی کی آمد بے سود ثابت ہوئی بلکہ نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی وہ اس طرح کہ ولی کے یہاں دہلی آنے سے شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورہ کا واقعہ ظہور پذیر ہوا، اور ولی کی شاعری کو ''شاہ گلشن'' کے مشورہ کی مرہونِ منت کیا گیا۔ یوں ولی کا سفرِ دہلی ان کے حق میں بڑا مضر ثابت ہوا۔

ششم :- جب تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا اس وقت ولی کی وفات کو کم وبیش ۱۰ تا ۱۵ برس ہو چکے تھے۔ مطلب یہ کہ اگر ولی کو جاننے پہچاننے والے کچھ لوگ تھے بھی تو وہ اس طویل مدّت میں راہی ملکِ عدم ہوگئے۔ اس لئے ولی کے متعلق معلومات رکھنے والے یا جن سے ولی کی صحبتیں رہی ہوں وہ باقی نہ رہے۔

غالباً یہ وہ اسباب وعلل ہیں جن کی بنا پر ولی کی زندگی کے حالات مستند طور پر معلوم نہیں ہوتے کیوں کہ ولی دکن اور گجرات دونوں مقام میں سکونت رکھتے تھے۔ لہذا اس ضمن میں قطعی اور ناقابلِ تردید شواہد تذکرہ نویسوں کی دسترس سے باہر تھے۔ اب اُسے تذکرہ نویسوں کی لاعلمی، بے اعتنائی یا غفلت کہیئے کہ ولی کے متعلق جس تذکرہ نگار کو جو باتیں زیادہ مناسب معلوم ہوئیں انھوں نے اپنے تذکروں میں نقل کردی اور ہر ایک تذکرہ نگار نے غالباً دوسرے تذکرہ نگار پر فوقیت جتانے اور اس کی اپنی معلومات دیگر تذکرہ نگاروں سے زیادہ ہے یہ بتلانے کی غرض سے، یا یہ کہ اپنے سے پیش تر لکھے گئے تذکروں سے اُس نے ولی سے متعلق بیانات سیدھے

سیدھے نقل نہیں کیے، یہ بتلانے کی غرض سے ہر تذکرہ نگار نے اپنا بیان الگ رقم کیا ہے۔لیکن اس کے باوجود جہاں تک وَلی کے ناموں کا اختلاف ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں، کیوں کہ ایک شاعر تو صرف اپنے تخلص سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

لیکن جہاں تک وَلی کی وطنیت کا تعلق ہے علمائے ادب میں یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی سنگین اور کچھ زیادہ ہی موضوعِ بحث رہا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ وَلی کے مراتب اور اردو شاعری میں اس کی عظمت کو دیکھتے ہوئے صرف یہ رہی ہے کہ وَلی جس کے وطن کا ساکن ہے انھیں بجا طور پر اس پر فخر کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اور اسی فخر کو اپنے دامن میں ہمیشہ کے لئے سمیٹ لینے کی خاطر اس ادبی جنگ کا آغاز ہوا جو تا حال جاری ہے اور اس ادبی اور قلمی جنگ نے بہت سے علمائے ادب کو اس طرح اپنی گرفت میں جکڑے رکھا کہ ان کی دیگر تخلیقی صلاحیتیں بھی اسی کی نذر ہوگئیں۔ اور وہ تحقیقی کام جو وَلی کی زندگی اور کلام کی خوبیوں نیز دیگر معاملات میں کیا جانا چاہیئے تھا پسِ پشت پڑ گئے۔

وَلی جہاں بحیثیت شاعر ایک اہم شخصیت کے حامل ہیں وہیں ابتداء سے ہی ان کی زندگی اور وطنیت انہی متنازعات کے حل میں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اہلِ گجرات انھیں ''وَلی گجراتی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اہلِ دکن انھیں ''وَلی دکنی'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اگر اس تنازعہ کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وَلی کی وفات کے کم وبیش ڈھائی سو سال تک تو وَلی ''دکنی'' ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں گجرات کے کچھ ادیبوں نے اپنے مضامین میں یہ دعویٰ کیا کہ وَلی ''احمد آبادی'' یا ''گجراتی'' تھے۔ اس مضمون کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے کے بعد گجرات کے علمی حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی اور قدیم شعراء کے تذکرے کھنگالے گئے اور یہ اوسط نکالنے کی کوشش کی گئی کہ کتنے تذکرہ نگاروں نے وَلی کو ''دکنی'' لکھا ہے اور کتنوں نے ''گجراتی'' اور پھر خود ہی صداقت کا ایک پیمانہ بنا کر انھیں صحیح اور غلط کہا گیا۔ پیروں کی بیاضیں کھلیں اور وَلی حسب ونسب کو اپنے خاندانی شجروں سے جوڑنے کی کوشش کی گئی اور اس کوشش میں انہی تذکروں کو بنیاد بنایا گیا۔ جہاں ان تذکروں میں وَلی کی وطنیت اور وفات کے متعلق چند سطریں مرقوم ہیں۔ لیکن ان تذکرہ نگاروں کے بیانات کے اختلافات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ان تحریروں کو مِن وعَن قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان تذکرہ نگاروں کی باتوں میں پائے جانے والے تضاد کی بنیادی وجوہات راقم الحروف نے بیان کردی ہے بہر حال ان تحریروں سے کچھ مدد تو ضرور

ہی ملتی ہے۔

تذکرہ نگاروں کے متضاد بیان کی وجوہات اس سے قبل قدرِ تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ ولؔی اپنی وفات کے کم وبیش ڈھائی سو سال تک تو ''دکنی'' ہی نظر آتے ہیں۔ پھر یہ تنازعہ ان کی وفات کے اتنی صدیوں بعد کیوں کر ظہور پذیر ہوا۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظِ نظر رہے کہ ان تذکروں میں مذکور بیانات بیسویں صدی کے نہیں ہیں بلکہ اٹھارہویں صدی کے نصف ختم ہوجانے کے بعد سے ۱۹ویں صدی کے ابتدائی اوائل تک کے ہیں۔ لیکن پھر اس کے بعد جو تذکرے لکھے گئے ان میں ولؔی کا کوئی ذکر نہیں تو پھر یہ تنازعہ ۲۰ ویں صدی کی پانچویں دہائی میں کیوں رونما ہوا؟

راقم الحروف کا خیال ہے کہ جب سرزمینِ دکن میں جناب سیّد محی الدین قادری زورؔ کی کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں ولؔی کی دوصد سالہ برسی بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ منائی گئی اور ولؔی کی زندگی و شاعری کی صفات پر مقالات لکھوا کر اس یادگار جشن میں پڑھوائے گئے اور ان مقالات کو محفوظ کر دینے کی خاطر ''یادگار ولؔی نمبر'' کی شکل میں شائع کیا گیا۔ غالباً اُسی وقت سے گجرات کے چند عالموں میں ولؔی کی وطنیت کو لے کر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ کیوں کہ گجرات کے کسی عالم یا محقق نے ولؔی کے متعلق ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی یا یہ کہیئے کہ ولؔی ''گجراتی'' ہیں، اس بات کا بھی انھیں احساس نہیں تھا اور نہ ہی دکن میں ۱۹۳۷ء سے قبل ولؔی کے باب میں اس طرح کے کسی پروگرام کو لائحہ عمل میں لایا گیا تھا۔ چونکہ اہلِ دکن کی ولؔی کو خراجِ عقیدت دینے کی یہ پہلی کوشش تھی اور اس دوصد سالہ برسی کے جشن کے موقع پر ولؔی کے متعلق پیش کیئے گئے مقالات میں ولؔی کے تخیل، ان کی فنِ شاعری، ان کی وطنیت اور متصوفانہ کلام پر شرح بسیط بحث کی گئی۔ ولؔی کے اس یادگار جشن میں یہ بھی تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ''اس کے بعد گجرات کا کوئی عالم ولؔی کو ''گجراتی'' کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اہلِ دکن نے ولؔی کی اس دوصد سالہ برسی کے موقع پر جس بلند بانگ آواز میں یہ صور پھونک کر للکارا تھا، شاید اُسی کی پاداش میں یہ وطنیت کا تنازعہ کھڑا ہوا۔ کیوں کہ اہلِ دکن کی یہ للکار اُس وقت گجرات کے علماء و ادباء نیز علمی حلقوں کی طبیعت پر بڑی شاق اور گراں گزری ہو۔ گویا پھر اس کے بعد اس للکار کا جواب دینے کی غرض سے ولؔی کے کلام میں پائے جانے والے تین مآخذ سے ولؔی کو ''گجراتی'' ثابت کرنے کے دلائل میں پیش کیا گیا۔ یہ تین مآخذ مندرجۂ ذیل ہیں۔

(۱) قطعہ در فراقِ گجرات

(۲) مثنوی در تعریف سورت

(۳) مدح حضرت علاّمہ شاہ وجیہ الدین علویؒ (آپ کا مزارِ مبارک احمد آباد (گجرات) کے خان پور علاقہ میں واقع ہے)

مندرجۂ بالا ان تینوں مآخذات کو بنیاد بنا کر نیز ولؔی کے کلام میں پائے جانے والے بعض گجراتی الفاظ اور احباب کے ناموں کو بنیاد بنا کر ولؔی کو گجراتی ثابت کرنے کی حمایت میں اپنے دلائل سے زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے اور اپنے دلائل کو مضبوط تقویت بخشنے کی خاطر علمائے گجرات جن میں صرف تین ہی ناموں کو عمل دخل ہے جن میں (۱) قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (۲) ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی اور (۳) سیّد منظور حسین علوی المعروف بہ حسینی پیر صاحب (والد بزرگوار پروفیسر وارث علوی صاحب جو اردو کے مانے ہوئے نقاد ہیں) ان تینوں افراد نے ولؔی کو گجراتی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش کے نتیجہ میں ولؔی کی ایک مہر اور ایک تمسک نامے کا بھی ذکر کیا گیا جس میں ولؔی کا شجرۂ نسب موجود تھا۔ نیز اُسی کے ساتھ ہی ولؔی کی قبر کی بھی نشاندہی کی گئی۔

لیکن ولؔی کے متعلق مذکورہ تینوں شہادتوں کو علمائے گجرات منظرِ عام پر لانے سے قاصر رہے۔ کیوں کہ نہ تو ولؔی کی مذکورہ مہر کو منظرِ عام پر لایا گیا، اور نہ ہی ولؔی کا مبینہ اصل شجرۂ نسب جس پر اُس وقت کے قاضی القضاۃ کی مہریں ثبت تھیں۔ نیز اس تمسک نامے میں ولؔی کے دستخط بھی موجود تھے، گویا یہ کہ اِن علماء کی طرف سے پیش کردہ ولؔی کی وطنیت کے مذکورہ اشیاء صرف زبانی اور پھر تحریری شکل میں ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنؔی نے اپنی کتاب ''ولؔی گجراتی'' میں رقم کیا ہے۔ یوں ولؔی کی وطنیت کو گجراتی الاصل ثابت کرنے میں علمائے گجرات نے جن دلائل کا سہارا لیا یا جن بنیادوں پر ولؔی کو گجراتی لکھا ہندوستان کے دیگر تمام علماء اور خصوصاً اہلِ دکن کو یہ تمام دلائل کمزور اور بے بنیاد لگے جیسا کہ راقم الحروف نے بھی ''ولؔی کی سوانح حیات'' والے باب میں علمائے گجرات کے پیش کردہ دلائل پر طویل بحث کرتے ہوئے انھیں نہایت کمزور اور بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

راقم الحروف کا ایسا ماننا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں دکن میں ولؔی کا جو دو صد سالہ جشن منایا گیا اُسے اہلِ گجرات کے ان علماء نے اِس زاویۂ نظر سے دیکھا ہو کہ اہلِ دکن نے ولؔی کا جشن منا کر ولؔی کو گجراتی والوں سے چھین لیا ہے یا یہ کہ ''اس کے بعد گجرات کا کوئی عالم ولؔی کو گجراتی کہنے کی جرائت نہیں کر سکتا'' اس للکار نے شعوری طور پر نہیں اس امر پر اُکسیا ہو کہ اور اس للکار کے جواب میں ہی ولؔی کو گجراتی الاصل ثابت کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔

دورِ حاضر میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ۔ ''ادبی تہذیب وتاریخ کے پہلو'' میں ''ولی نام کا ایک شخص'' نام سے ایک تحقیقی مضمون قلم بند کیا ہے جس میں گجراتی دانشوروں کی تحقیق سے بھی استفادہ کیا گیا ہے فاروقی صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ان کا ولی کے موضوع پر قلم اُٹھانا ہی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فاروقی صاحب نے مذکورہ مضمون میں جن اُمور پر رائے زنی کی ہے اس پر بحث جاری رہنی چاہیئے تاکہ حقائق واضح ہوکر منظر عام پر آسکیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر ولی کی وطنیت ان صوبائی سرحدوں میں نہ الجھتی تو ولی کے فنی محاسن اور دیگر خصوصیاتِ شاعری پر بہتر ادبی کام ہوسکتا تھا، ویسے بھی کسی ادیب یا شاعر کا وطن کوئی بھی ہو، صرف اس کے کمالِ فن سے سروکار ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں کوئی بھی شاعر علاقائی حدبندیوں سے آزاد ہوتا ہے اور وہ تو پوری قوم اور ملک کا سرمایہ ہوتا ہے لہذا اُسے کسی خاص صوبائی علاقہ سے جوڑا جانا درست نہیں، بلکہ اس کے فنی محاسن کا اعتراف کرنا ہی اُسے حقیقی خراجِ عقیدت دینے کے مترادف ہے۔

الغرض یہ کہ جب کسی شاعر کی شخصی زندگی کے متعلق مستند کوائف موجود نہ ہوں، قیاس کا سہارا لئے بغیر کوئی بات نہ کی جاسکتی ہو، تذکرہ نگاروں کے بیانات متضاد ہوں تو پھر ایسی صورت میں لامحالہ اُس شاعر کے کلام کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے کہ شاید وہیں سے کوئی سراغ مل جائے گویا یہ کہ ولی کی وطنیت کو حل کرنے میں ولی کا کلام بذاتِ خود علمائے کرام کو معاون ثابت ہوا۔ جہاں ولی نے بجا طور پر خود کو ''دکنی'' شاعر لکھا ہے وہ شعر مندرجۂ ذیل ہے۔

ے ولی ایرانِ وتوران میں ہے مشہور
اگر چہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

ے یوں مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس
ولی پروانگی کرتا تری ملکِ دکن بھیتر

یوں مذکورہ اشعار میں ولی نے واضح طور پر اپنے وطن کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ اس لئے ان اشعار کی روشنی میں ولی کے وطن کا سراغ مل جاتا ہے۔ لہذا اس کو مان لینے میں کسی طرح کی کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے، لیکن ولی کے ان اشعار کے علاوہ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں احمد آباد کی مشہور تاریخ ''تاریخ احمدی'' ۱۷۳۷ء جس کے مصنف مٹھن لال ہیں ولی کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی ''تحفتہ الکرام'' میں ولی

کا کوئی ذکر ہے۔ اس لئے کہ اگر ولیؔ احمد آباد میں تولد ہوئے ہوتے اور یہیں وفات پائے ہوتے یعنی یہ کہ ولیؔ جیسا معروف شاعر سرزمینِ احمد آباد میں پیوندِ خاک ہوتا اور گجرات کی ان تاریخوں میں اس کا ذکر نہ ہو کیا یہ ممکن ہے؟ لیکن ان ٹھوس دلائل کے باوجود قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے متعدد مقالات یہ ثابت کرنے میں سپرِدِقلم کئے کہ ''ولیؔ کی وطنیت گجراتی الاصل ہے''، موصوفکے یہ مقالات رسالہ ''مصنف'' علیگڑھ میں وقتاً فوقتاً ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء کے عرصہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد اختر جونا گڑھی کے انہی مقالات کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ نے ''ولیؔ گجراتی'' نامی کتاب بمبئی سے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۵۴ء میں شائع کی اور اس کتاب میں تمام زور ولیؔ کو گجراتی ثابت کرنے میں صرف کیا گیا تھا۔

مدنیؔ صاحب نے ولیؔ کے مذکورہ اشعار کو یہ کہہ کر مشکوک کرنے کی کوشش کی کہ اُس زمانے میں گجرات بھی دکن میں شامل تھا وہ رقم طراز ہیں۔۔۔

''قدمانے لفظ دکن کا اطلاق جس حصّہ ملک پر کیا ہے وہ محض اورنگ آباد یا بیجاپور نہیں ہے بلکہ دریائے نربدا کے اس کنارے سے مع سلسلہ کوہ ست پڑا، راس کماری تک کی سرزمین میں شامل ہے، اس خطّہ میں گجرات وخاندیش بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ صاحب کا مذکورہ بیان راقم الحروف کو بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے کیوں کہ صوبہٗ گجرات کا دکن کے خطّہ میں شامل ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن اگر کچھ دیر کے لئے یہ فرض کرلیں کہ صوبہٗ گجرات کسی زمانے میں دکن کا حصّہ رہا بھی ہو. یا گجرات کو سیاسی مصلحتوں کے سبب دکن کے خطّہ میں ضم کردیا گیا ہو، تاکہ حکومت کے نظم وضبط کو بہتر طور پر چلایا جاسکے اس کے باوجود ولیؔ کی وطنیت کسی طرح بھی گجراتی الاصل گردانی نہیں جاسکتی۔ کیوں کہ ولیؔ کے کلام سے یہ شاہد ہو رہا ہے کہ ان کا مولد ومسکن صوبہٗ دکن ہے پھر چاہے بھلے ہی کئی صوبوں کومخلوط کر کے ''دکن'' کا نام دیا گیا ہو۔

راقم الحروف اس بات کی وضاحت میں یہ کہنا چاہے گا کہ انگریزی حکومت کے دورِ اقتدار میں ''صوبہٗ گجرات'' کو ''صوبہٗ مہاراشٹر'' میں ضم کردیا گیا تھا اور یہ دونوں صوبہ تقریباً ایک صدی تک ایک دوسرے میں ضم رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں صوبوں میں رہنے والوں کی شناخت اپنے صوبائی سرحدوں کی بنا پر علیٰحدہ ہی رہی، اور ایسا نہیں ہوا کہ کسی ''مہاراشٹری'' نے جو اِس صوبے میں پیدا ہوا اُس نے اپنا جائے تولد ''صوبہٗ گجرات'' کو قرار دیا ہو۔ اُسی طرح ''صوبہٗ گجرات'' میں جائے پیدائش حاصل کرنے والے کسی شخص نے کیا

اپنے کو کبھی ''مہاراشٹری'' لکھا ہے؟ یہ بالکل آسان اور عام فہم بات جو بہ آسانی ہر کسی شخص کے گلہ اتر سکتی ہے۔ اس لئے جیسا کہ ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی صاحب نے ولی کو گجراتی الاصل ثابت کرنے میں یہ شوشہ ڈھونڈ نکالا، اگر کچھ دیر کے لئے یہ فرض بھی کرلیں کہ گجرات اُس زمانے میں دکن کا حصّہ رہا تھا تو بھی اس بنا پر ولی کی وطنیت کسی طرح گجراتی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اورنگ آبادی ہی رہتی ہے جیسا کہ ولی نے اپنے اشعار میں واضح کردیا ہے۔

جیسا کہ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر ولی نے حصولِ تعلیم کی خاطر سرزمین احمد آباد میں قدم نہ رکھا ہوتا تو ان متنازعات کے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہ ہوتے۔ لیکن چونکہ ولی نے اس مبارک سرزمین پر ایک طویل عرصہ گزارا تھا اس صوبۂ گجرات کے مشہورِ زمانہ نسوانی حُسن اور شہر سورت کی خوبصورتی نے بھی ولی کو خوب متاثر کیا تھا۔ لہٰذا یہاں کے نسوانی حُسن اور یہاں کے دیگر خوبصورت مقامات کا ذکر ولی کی شاعری میں نہ ہو ایسا کیسے ممکن تھا۔ لہٰذا یہاں کے حُسن و جمال سے متاثر ہونا ولی جیسے حسّاس شاعر کے لئے ایک ناگزیر عمل تھا۔ کیوں کہ ولی کی شاعری بنیادی طور پر جمال پرستی پر مبنی ہے۔ ولی نے حُسن کے ترانے نہایت شوق سے گائے ہیں اور اپنے محبوب کے ہر ایک ادا کی تصویر کھینچی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی غزلوں میں حُسن کی تکرار نظر آتی ہے۔ لیکن ولی نے حُسن کو اتنے متنوع طریقوں سے پیش کیا ہے کہ حسن کی اس تکرار کے باوجود کسی طرح کی بے لطفی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کا مزہ آتا ہے۔

گویا یہ کہ ولی جب شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے تو انھوں نے گجرات سے اپنی محبت اور عقیدت کو اظہار کرتے ہوئے'' قطعہ در فراقِ گجرات'' تخلیق کیا اور اسی طرحِ شہر ''سورت'' کے خوبصورت مناظر اور نسوانی حُسن سے مغلوب ہوکر ''مثنوی در تعریفِ سورت'' تخلیق کی۔ ظاہر ہے وہ شخص جو ایک طویل مدّت تک یہاں گجرات میں قیام پذیر رہا ہو اس کا یہاں کے علاقے اور لوگوں سے ایک طرح کی انسیت کا پیدا ہوجانا فطری ہے۔ ولی بھی قدرت کے اس فطری عمل سے کیسے دور رہ سکتے تھے۔ لہٰذا غالبًا یہاں سے واپسی کے بعد ولی نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار'' در فراقِ گجرات'' کی شکل میں کیا اور سورت چونکہ اس زمانے میں'' باب المکّہ'' تھا اور بندرگاہ ہونے کی وجہ سے بحری راستے سے گجرات میں داخل ہونے کا واحد ذریعہ بھی ولی غالبًا اسی راستے سے چھٹیوں میں اپنے والدین اور عزیز واقربا کو ملنے اورنگ آباد دکن کو جاتے ہوں گے اور ممکن ہے شہر سورت میں کچھ لوگوں سے ان کی شناسائی رہی ہو یا اپنے طالبِ علمی کے زمانے میں ان کے کچھ ساتھی طالبِ علم شہر سورت

کے رہے ہوں، اس بنا پر انھیں سورت شہر میں کچھ اوقات گزارنے کا موقع ملتا رہا ہو، خیر کوئی بھی وجہ رہی ہو ولیؔ خصوصی طور پر شہر سورت سے بے حد متاثر تھے۔ ولیؔ کی یہ مثنوی ''مثنوی در تعریفِ سورت'' اپنی موجودہ شکل میں ایک اچھّی نظم کہی جاسکتی ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا شہر سورت کی تعریف سے ہوتی ہے۔

؎ اَہے مشہور اس کا نام ''سورت''
کہ جاوے جس کے دیکھے سوں کدورت

اس مثنوی کے بارے میں یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ ولیؔ نے یہ مثنوی یہیں اپنے قیام گجرات کے زمانے میں کہی ہوگی مثنوی اٹھارہویں صدی کے ابتدائی زمانے کی ہوسکتی ہے لیکن اس بات کا تعین موجودہ معلومات کی روشنی میں ممکن نہیں ہے۔ بہر حال اس مثنوی سے ''شہر سورت'' کے ایک خوش حال اور کاسمو پالیٹن شہر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے کہ سورت شہر کی شہری زندگی اپنی ہماہمی اور رنگینی کے سبب صاحبانِ ذوق کے لئے اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتی تھی اور حُسن کے نظارے چاروں طرف عام تھے مندرجۂ ذیل کے چند اشعار اس کے ضامن ہیں۔۔۔

؎ ختم ہے امرداں اوپر صفائی
ولے ہے بیشتر حُسن نسائی

؎ نظر بھر کر دِکھوں ہر گلبدن کوں
کہ ہے پردے سوں بے پروا انن کوں

؎ اَہے واں عاشقاں کوں عام آواز
کہ نئیں پردہ بغیر از پردۂ ناز

؎ زُلف اور مکھ کے طالب سوں پچُھو بات
جسے ہر دن ہے عید اور رات شبرات

غرض یہ کہ مذکورہ ''قطع در فراقِ گجرات'' اور مثنوی ''در تعریف سورت'' کی تخلیق یہاں کے قیام کے نتیجہ میں تخلیق ہوئی ہیں۔ راقم الحروف نے ''ولیؔ کی سوانح حیات'' والے باب میں ولیؔ کی ان دونوں تخلیقات پر مدلّل بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اُسے کسی طرح بھی ولیؔ کی وطنیت ''گجراتی'' ہونے میں شمار نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ ولیؔ نے یوں تو جب دہلی کا سفر کیا اُس وقت وہاں کی رنگینیوں، چہل پہل اور بازاروں کی رونقوں

سے اتنا متاثر ہوئے کہ مت پوچھو اُس زمانے میں دلّی کا صوبے دار محمد یار خاں تھا وَلی نے یقیناً اُسی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے دلی خیالات کا اظہار ان اشعار میں کیا۔

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں
حُسن کی دہلی کا ہے صوبہ دار محمد یار خاں

جیسا کہ وَلی کی تمام تر شاعری میں حُسن اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے یہ دیکھتے ہوئے ہی وَلی کو اردو شاعری کا سب سے بڑا حُسن پرست شاعر کا خطاب دیا گیا ہے۔ وَلی نے اس حُسن کی مئے کشی ہر مقام پر کی ہے چاہے وہ دہلی ہو یا گجرات اور اپنی اس مئے کشی سے ان کی طبیعت پر جو وارفتگی پیدا ہوئی اس کے تجربات وَلی نے دل کھول کر اپنی شاعری میں بلا جھجک بیان کئے ہیں۔ گویا یہ کہ وَلی اپنی تمام شاعری میں مجموعی طور پر حُسن کے مدّاح اور ثناء خواں کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں۔ وَلی یقینی طور پر حُسن پرست اور جمال پرست شاعر ہیں اس بات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے راقم الحروف کا یہ ماننا ہے کہ وَلی نے جب گجرات کو (حصولِ تعلیم کے بعد) الوداع کہا اس کے بعد گجرات کی اس مفارقت سے پیدا ہوئی دل سوزی کو "قطع در فراقِ گجرات" کی شکل میں ظاہر کیا جیسا کہ وَلی نے خود کہا ہے۔

اس سیر کے نشے سوں اوّل تر دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

وَلی نے گجرات کو الوداع تو ضرور کہا اور اپنے حقیقی مسکن اورنگ آباد دکن میں بیٹھ کر بھی وہ یہاں کے نسوانی حُسن اور خوبصورت قدرتی مناظر کی یاد اپنے دل سے محو نہ کر سکے اور گجرات خصوصاً سورت کی یاد انھیں تڑپاتی رہی اور یہاں کے خوبصورت چہرے ان کے ذہن کے پردے پر رقص کرتے رہے اور غالباً سورت کے انہی خوبصورت چہروں سے جن سے ان کی نظروں کو تصادم ہوا تھا اس نظری تصادم کی گونج اور کسک ان کے دل میں تا عمر باقی رہی تھی۔ پچھلے صفحات شہر سورت کے متعلق وَلی کے جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ وَلی کے انہی نظری تصادم کے مصداق ہیں۔ چونکہ وَلی سیّاح واقع ہوئے تھے اور سیر و سیاحت کا بے حد شوق رکھتے تھے انہوں نے غالباً جس جس مقام کی سیر کی وہاں انھوں نے غالباً سورت شہر کی حسینوں سے ان کا ضرور مواز نہ کیا ہوگا۔ ان کی غزلوں میں حُسن کی بہتات شاید اُن کے انھیں سفروں یا سیّاحی کا نتیجہ بھی ہوسکتی۔ محمد حسین آزاد نے اس خیال کی تصدیق کی ہے اور راقم الحروف بھی کسی حد تک اس بات سے متفق ہے۔ لیکن ان سفروں کی بنیادی وجہ

تو ولی کی اپنی شاعری کے ذریعۂ معاش کی تلاش بھی تھی جو انھیں دہلی اور دیگر مقامات کی طرف جانے کے لئے مجبور کرتی رہی۔ ولی نے اپنی اس کس مپرسی کا بہت احساس کیا تھا اور اس احساس سے جو اذیّت انھیں ہو رہی تھی اسے انھوں نے اپنے اشعار میں قلم بند کیا ہے۔

ولی کی سیاحی کے ضمن میں اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کے کلام میں حُسن کے متنوع مضامین، مختلف النوع تشبیہات اور استعارات جو اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے ولی کی غزلوں میں بنگال کا بھی ذکر آیا ہے شاید وہ بنگال میں بھی کچھ دنوں قیام پذیر رہے ہوں گے۔ کیوں کہ بنگال بھی ہندوستان کے جنوب میں واقع ہے اور دکن کے علاقے سے قریب بھی ہے۔ ولی نے کن اسباب سے بنگال کا سفر کیا یہ تو نہیں معلوم لیکن اتنا ضرور ہے شہر سورت کا حُسن و جمال ان کے ذہن پر نقش ہے راقم الحروف کا خیال ہے کہ ولی نے غالباً شہر سورت کے انھیں نسوانی حُسن کو مدِّ نظر رکھ کر مندرجۂ ذیل اشعار کہے ہیں۔ شہر سورت سے ولی کا اس قدر متاثر ہونا اس بات کا بھی غماز ہوسکتا ہے کہ وہاں کی کسی خوبصورت اور پری رو سے اُن کا معاشقہ ہو، لیکن اُن کے اس طرح کے کسی معاشقے کی کوئی تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔

ے ہوا ہے دنگ بنگالہ تری نرگس کے جادو سوں
معطر ہے سواد ہند تیری زلف کی بو سوں
ہوا تجھ حسن پر دو جگ دوانہ گر تعجب نئیں
اگر مجھ سے دوانے کا بندھا دل تجھ پری روسوں
مجھے گلشن طرف جانا بجا ہے اے مہِ انور
کہ میں پاتا ہوں تجھ زلفاں کی بو ہر شبوسوں

ے اس انکھیا ہور زلف کا دیکھیا ہے از بس جو طلسم
شعر تیرا اے ولی یوں سحر بنگالا رہے

ولی کے مذکورہ اشعار سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ خود شہر سورت کی پری رووں سے دیوانے ہوگئے ہیں۔ اگر بنگال کے باشندگان بھی ان نرگسی آنکھوں اور معطّر زلف والوں کو دیکھیں تو وہ بھی دنگ رہ جائیں۔ لیکن جس طرح میں ان سورتی آنکھوں اور زلفوں کے سحر میں گرفتار ہوں اسی طرح بنگال کے لوگ میری غزلوں کے سحر میں گرفتار ہیں۔ غرض یہ کہ مذکورہ غزل میں ولی نے اپنے صوبۂ گجرات اور شہر سورت کے تجربات بیان کئے

ہیں کیوں کہ شہر سورت کے متعلق ایک مشہور مقولہ زمانۂ قدیم سے ہر خاص و عام زبان زد ہے کہ۔۔۔

''گجرات کا حُسن اور سورت سونے کی مورت''

غرض یہ کہ سورت کے انھیں زرین چہروں کی یادیں اور اس کی تابناکی کی چمک ولی ''دکن'' میں بھی محسوس کرتے ہیں اور فخریہ اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر میں دیوانہ ہوا تو اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ دونوں جہان کے لوگ یہاں کے حُسن کے دیوانے ہیں۔ نفسِ مضمون یہ کہ ولی کا تخلیق کردہ ''قطع در فراقِ گجرات'' اور ''مثنوی در تعریف سورت'' ان کے انھیں حسین، خوشگوار، اور لطیف احساسات کی یادگار ہیں۔ اور وہ تجربات ہیں جو ولی کو قیامِ گجرات کے دوران ہوئے تھے۔ اس لئے علمائے گجرات کی طرف سے ولی کی ان شعری تخلیقات کو ولی کی گجراتی وطنیت ثابت کرنے میں پیش کیا جانا بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر ولی کی زندگی کے حالات اس طرح کی اٹکلوں میں نہ الجھے ہوتے تو ولی کا معیار آج کتنا تصوّر کیا جاتا اس سے کہیں زیادہ ہوتا۔ ولی کے متعلق ان متنازعات جس میں ولی کے وطن کا مسئلہ بے حد سنگین رہا ہے اور اس سے بھی سنگین واقعہ یہ رہا کہ میر صاحب نے ولی کی تمام شعری کاوشوں کو ''شاہ سعد اللہ گلشن'' کے مشورے کی مرہونِ منّت لکھ کر اردو ادب میں ان کے وقار اور مرتبے کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ یہ دو نکات ولی کی ادبی حیثیت مسلم کرنے میں ایسے مہلک ثابت ہوئے جس نے یقینی طور پر انھیں استاد الاساتذہ کے خطاب سے صدیوں دور رکھا۔ لیکن بہت بعد میں بھی اگر اس امر کا اعتراف کیا گیا تو بھی عجب گومگو اور تذبذب کے ساتھ، گویا یہ کہ ولی کے بعد جتنے مشہور و معروف شعراء اردو ادب میں منظرِ عام پر آئے، جن میں میر، سودا، ذوق، مومن وغیرہ سبھی کا اردو ادب کے علماء اور محققین نے دل کھول کر مطالعہ کیا اور تحقیقات کے دفتر کے دفتر بھر دیئے اور اپنے خیالات سے کئی درجنوں کتب تخلیق کر کے ان کی خدمات سے اردو ادب کو روشناس کراتے رہے۔ جو کہ یہ شعراء تو ولی کے بہت بعد کے ہیں۔ لیکن اردو ادب میں ان پر اس قدر کام ہوا ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری کا کوئی گوشہ تشنہ معلوم نہیں ہوتا اور آج بھی نئے نئے انکشاف ہوتے رہتے ہیں۔

اس ضمن میں ولی کی شاعری اور ان کی وہ زبان جو انھوں نے اردو کے ابتدائی زمانے میں استعمال کی تھی نیز فارسی کی آمیزش سے جو کیمیائی امتزاج عمل میں آئے تھے اس اعتبار سے ولی کا یہ تجربہ اور زبان کا نیا ذائقہ پیش کرنے میں انھیں جو اوّلیت حاصل ہے اس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آپ تصوّر کیجئے کہ اردو ادب میں

ولی کا کیا مقام ہونا چاہیئے تھا اور سینکڑوں کتابیں ان پر اور ان کے کلام کی خصوصیات پر تخلیق ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اس کی بنیادی وجہ راقم الحروف کے نزدیک دو ہیں ---

(۱) ایک یہ کہ ولی ''دکنی'' تھے۔

(۲) دوم یہ کہ ولی کی شاعری کو ''شاہ سعد اللہ گلشن'' کی رہینِ احسان بتایا گیا۔

راقم الحروف کا ایسا ماننا ہے کہ اگر ولی ان متنازعات کے خارزار میں نہ الجھے ہوتے تو ان کی شہرت کا آفتاب اپنی پوری تمازت کے ساتھ روشن ہوتا اور اگر ان کی شاعری کے آفتاب کو شاہ گلشن کے مشورے کا گہن نا لگایا گیا ہوتا تو اردو ادب میں ولی کے بعد کے شعراء کی جتنی قدردانی کی گئی یا کی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ قدردانی ولی کی ہوتی۔ چونکہ ولی کے بعد کے شعراء میں اوّل تو میر تقی میر ہی ہیں۔ انھیں ''خدائے سخن'' کا خطاب دیا گیا، سودا کی اردو خدمات کو دل کھول کر سراہا گیا، اسی طرح انھیں قصیدہ نگاری کا بادشاہ مانا گیا۔ ذوق اور مومن کی غزلوں اور ان کے فن کی دل کھول کر پذیرائی کی گئی۔ لیکن نہایت افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ان شعراء نے غزل گوئی میں اپنا جو مقام پیدا کیا اس وقت تو زبان بھی صاف ستھری ہو چکی تھی، انھیں ولی جیسی دشواریاں بھی حائل نہیں تھی، اس کے باوجود اردو ادب میں انکی اپنی ایک الگ ادبی حیثیت قائم ہے اور ان شعراء کے استادی کے اعتراف میں کسی عالم و محقق کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ان شعراء نے اپنی شہرت کا قصر رفیع الشان جس بنیاد پر قائم کیا ہے اور غزل اور اردو شاعری کی روایت جو بعد میں اپنے عروج پر پہونچی ہے اس کا سرچشمہ تو ولی کی ہی غزل ہے۔ تو پھر بھلا ولی کی عظمت کو قبول کرنے میں کیا چیز مانع ہوئی ؟

لیکن جیسا کہ راقم الحروف نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ ولی کی شہرت ان کی وطنیت کی نذر ہوگئی اور محققین سے اپنی ساری بحثیں اُن کی وطنیت کو حل کرنے میں صرف کردیں۔ گویا ولی اپنی وطنیت کے مجرم تو تھے ہی، لیکن کچھ کسر جو باقی رہ گئی تھی وہ شاہ گلشن کے مشورے کے الزام نے پوری کردی۔ نفسِ مضمون یہ کہ اگر مذکورہ دونوں نکات ولی کے ساتھ جڑے ہوئے نہ ہوتے تو اردو ادب میں ولی کی عظمت سب سے بلند وبالا مقام پر فائز نظر آتی، اور درجنوں نہیں سینکڑوں کتابیں ان کی فنی خصوصیات پر تخلیق ہوئی ہوتیں۔

ولی کی وفات کے بعد کی ڈھائی صدیوں میں ولی پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا اور اگر کچھ تخلیقات منظرِ عام پر آئیں بھی تو دو ہندسوں سے آگے نہیں بڑھیں۔ لیکن اس کے بعد اور بہت بعد اردو ادب کے عالموں اور محققین نے ولی کی عظمت کا اعتراف کرالیا ہے اور ولی کی ذات پر اب تک جو ابر چھایا ہوا تھا تو چھٹتا ہوا دکھائی

دے رہا ہے۔ نیز ولّی کی عظمت کی تائید میں موجودہ دور کی اہم شخصیات ڈاکٹر سیّد عبد اللہ، اعجاز حسین، مختار الدین احمد آرزوؔ، سیّد احتشام حسین، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر محمد صادق، پروفیسر عبد الستار صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، شاربؔ ردولوی اور ساحلؔ احمد وغیرہ نے ولّی کے فنی محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے کلام کی قدر افزائی کی ہے اور اپنے رشحاتِ قلم سے گرانمایاں تخلیقات پیش کی ہیں۔

راقم الحروف نے جب ولّی کی شاعری اور شخصی زندگی کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ولّی کی عظمت کا اعتراف اردو غزل گو کی حیثیت سے جس قدر بھی کیا جاتا ہے اردو غزل کے اس محسن اور مایۂ افتخار شخصیت کا مقام اس سے کہیں بلند ہے۔ اس لئے ہمیں علاقائی تعصّب سے بری ہو کر اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ولّی ''دکنی'' تھے یا ''گجراتی'' انھیں اردو زبان کے شاعر کی حیثیت سے جاننا چاہیئے کیوں کہ انھوں نے اپنی متوازن طبیعت سے فارسی، دکنی اور شمال کی زبان کو اس طرح ملاکر ہمہ گیر کر دیا تھا کہ وہ علاقائی سطح سے بلند وبالا ہوگئی تھی۔ غرض یہ کہ ولّی نے اپنی ذات کو علاقائی تعصب سے بری رکھتے ہوئے اپنے فن کا ایسا امتزاج پیش کیا جو انھیں فطری طور پر ودیّت کردہ تھا اور اس پر عمل پیرا ہوکر ولّی نے جب غزل کو ہاتھ لگایا تو اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور ان کے رنگِ تغزل کی تقلید ہماری شعری روایت کا حصّہ بنی رہی۔ اس لئے اردو شاعری میں رہبر اوّل کی حیثیت سے انھیں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا یوں بھی ایک بڑا شاعر کسی مخصوص علاقے کا نہیں بلکہ پوری قوم کا سرمایہ ہوتا ہے اور اس کی شخصیت علاقائیت سے بلند ہوکر آفاقی ہوجاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

Bibliography

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/ مؤلف/ مرتب	مطبع / ناشر وسنِ اشاعت
۱	کلّیاتِ ولی	جناب علی احسن مارہروی	انجمن اُردو پریس، اُردو باغ، اورنگ آباد۔ ۱۹۲۷ء
۲	کلّیاتِ ولی	جناب نور الحسن ہاشمی	اتر پردیس اردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۸۹ء
۳	دیوان سمجھو سورتی	مرتب: ڈاکٹر نور السعید اختر	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، گجرات۔ ۱۹۹۳ء
۴	نکات الشعراء (میر تقی میرؔ)	مولوی عبد الحق	انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی۔ ۱۹۷۹ء
۵	مخزنِ نکات	شیخ محمد قیام الدین قائمؔ چاندپوری	اتر پردیس اردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۸۵ء
۶	تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسنؔ دہلوی	انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء
۷	تذکرۂ شعرائے دکن	عبد الجبار خاں ملکاپوری	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن۔ ۱۹۳۵ء
۸	تذکرۂ مخزن الشعراء (تذکرۂ شعرائے گجرات)	قاضی نور الدین فائقؔ	اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۸۵ء
۹	تذکرۂ گلِ رعنا	لچھمی نرائن شفیقؔ	مطبوعہ، عہد آفرین برقی پریس حیدرآباد، دکن۔
۱۰	تذکرۂ ریختۂ گویاں	سیّد فتح علی حسینی گردیزی	اتر پردیس اُردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۹۵ء
۱۱	گلشنِ ہند (مزار علی لطف)	مرتب: مختار الدین احمد	کوہ نور پریس، علمی مجلس، دہلی۔ ۱۹۶۷ء
۱۲	سخن شعراء (تذکرہ)	عبد الغفور خاں نساخؔ	اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۸۲ء
۱۳	گلشنِ گفتار (تذکرہ)	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	-

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/ مؤلف/ مرتب	مطبع/ ناشر وسنِ اشاعت
۱۴	مجوعۂ نغز (میر قدرت اللہ قاسم)	حافظ محمود شیرانی	پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۱۹۳۳ء
۱۵	یادگار الشعراء (اسپرنگر)	مترجم: طفیل احمد	اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۸۵ء
۱۶	تذکرۂ گلشن وگلزار	سیّد عطاء الرحمٰن (عطا کاکوی)	رئیسِ ادارہ تحقیقاتِ عربی وفارسی، پٹنہ ۱۹۶۸ء
۱۷	تذکرہ خوش معرکۂ زیبا	مرتب: ڈاکٹر شمیم انہونوی	نسیم بک ڈپو، لاٹوس روڈ، لکھنؤ۔ ۱۹۷۱ء
۱۸	تین تذکرے	نثار احمد فاروقی	مکتبۂ برہان پور، اردو بازار، دہلی۔ ۱۹۶۸ء
۱۹	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۹۵ء
۲۰	نگارستانِ فارس	محمد حسین آزاد	عاکف بک ڈپو، مٹیا محل، دہلی۔ ۱۹۹۲ء
۲۱	سخن ورانِ گجرات	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی۔ ۱۹۸۱ء
۲۲	ولی گجراتی	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی۔ ۱۹۵۰ء
۲۳	انتخابِ ولی	ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی	ادبی پبلشرز، بمبئی۔ ۱۹۵۰ء
۲۴	ولی گجراتی قاضی احمد میاںِ اختر جوناگڑھی	(مرتب: پروفیسر محی الدین بمبئی والا)	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، گجرات۔ ۲۰۰۴ء
۲۵	الموسی - یادگارِ ولی نمبر	سیّد محمد ایم۔اے۔	سٹی کالج میگزین، حیدرآباد، دکن۔ ۱۹۳۷ء
۲۶	ولی- انتخاب وتہذیب	محمد خان اشرف	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۹۹۱ء
۲۷	مطالعۂ ولی	شارب ردولوی	نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ۱۹۷۲ء
۲۸	نذرِ ولی	طالبات جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد۔	مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدرآباد۔ ۱۹۳۷ء
۲۹	ولی	نور الحسن ہاشمی	اردو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ ۲۰۰۵ء
۳۰	ولی دکنی (سیمینار)	گوپی چند نارنگ	اردو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ ۲۰۰۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مؤلف / مرتب	مطبع / ناشر و سنِ اشاعت
۳۱	ولی - فن شخصیت اور کلام	ساحل احمد	اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔ ۱۹۷۹ء
۳۲	ولی اورنگ آبادی (جلد اوّل)	آغا مرزا بیگ	کتب خانہ: آغا مرزا بیگ، حیدرآباد۔ ۲۰۰۲ء
۳۳	ولی اورنگ آبادی (جلد دوم)	آغا مرزا بیگ	کتب خانہ آغا مرزا بیگ، حیدرآباد۔ ۲۰۰۲ء
۳۴	اردو غزل میں تصوّف ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر اعجاز مدنی	رضوی کتاب گھر، ٹیا محل جامع مسجد دہلی۔ ۱۹۹۶ء
۳۵	تذکرۃ الوجیہ	سید حسینی پیر علویؒ	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، احمد آباد ۔ ۱۹۹۰ء
۳۶	اردو کا ابتدائی زمانہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	آج کی کتابیں، پہلا ایڈیشن کراچی۔ ۱۹۹۹ء
۳۷	اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۱۹۸۳ء
۳۸	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	کتابی دنیا، نئی دہلی ۔ ۲۰۰۴ء
۳۹	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خان	الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ ۱۹۸۹ء
۴۰	تاریخ گجرات	سیّد ابوظفر ندوی	ندوۃ المصنفین، نئی دہلی ۔ ۱۹۵۸ء
۴۱	یادِ ایام	حکیم سیّد عبدالحیٔ حسینیؒ	مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، لکھنو ۱۹۸۳ء
۴۲	مرأتِ سکندری	مترجم: پروفیسر مرتاض حسین قریشی	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر، گجرات، احمد آباد۔ ۱۹۹۵ء
۴۳	سلطنت کال (گجراتی)	رسک لال پرکھ اور ہری پرشاد شاستری	سیٹھ بھولا بھائی جے سنگھ بھائی، ادھیّن۔ شنوودھن ۔ ودھیا بھون، احمد آباد ۔ ۱۹۷۷ء
۴۴	گجرات کا اتہاس (گجراتی)	ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک	گجرات یونیورسٹی، احمد آباد۔ ۱۹۶۷ء
۴۵	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	ڈاکٹر جمیل جالبی	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۱۹۸۴ء

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/ مؤلف/ مرتب	مطبع/ ناشر وسنِ اشاعت
۴۶	تاریخ ادب اردو (جلد دوّم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	اعجاز پبلشنگ ہاؤس۔نئی دہلی۔۱۹۸۴ء
۴۷	دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زورؔ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علیگڑھ۔۲۰۰۰ء
۴۸	تاریخ فرشتہ (محمد بن قاسم)	مترجم: محمد فدا علی طالب	نول کشور پریس لکھنؤ۔۱۹۳۳ء
۴۹	خطباتِ عبدالحق	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی۔ ۱۹۳۹ء
۵۰	مقدمہ شعر وشاعری	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	سر سیّد بک ڈپو، علی گڑھ۔ ۱۹۷۶ء
۵۱	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	گیان چند جین/ سیدہ جعفر	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء
۵۲	ہندوستانی لسانیات	محی الدین قادری زور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ ۲۰۰۳ء
۵۳	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۱۹۸۳ء
۵۴	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری	گلشن پبلشرز، گاؤں کدل چوک، شری نگر۔ ۱۹۹۳ء
۵۵	تاریخ جنوبی ہند	محمود خاں محمود	قومی مونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء
۵۶	دکن کے بہمنی سلاطین (ہارون خان)	مترجم: رحم علی الہاشمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء
۵۷	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء
۵۸	پنجاب میں اردو	حافظ محمود خان شیرانی	اتر پردیس اردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۸۲ء
۵۹	قدیم اردو (جلد اوّل)	اکبر الدین صدیقی	شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔۱۹۷۱ء
۶۰	دکنی اردو	پروفیسر عبد الستار دلوی	شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی۔ ۱۹۸۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/ مؤلف/ مرتب	مطبع/ ناشر وسنِ اشاعت
۶۱	غزل تنقید	اسلوب احمد انصاری	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ۲۰۰۲ء
۶۲	اردو غزل	کامل قریشی	اردو ساہتیہ اکادمی، دہلی ۔ ۱۹۹۲ء
۶۳	اردو غزل میں تصوف ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر اعجاز مدنی	رضوی کتاب گھر، دہلی ۔ ۱۹۹۶ء
۶۴	غالب حقیقت کے آئینے میں	ہنس راج رہبر	لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز، بک سیلر اردو بازار، دہلی ۔ ۱۹۷۲ء
۶۵	غالب اور مطالعۂ غالب	ڈاکٹر عبادت بریلوی	سکینہ پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ۱۹۷۰ء
۶۶	انتقادیات (جلد دوم)	نیاز فتحپوری	عبد الحق اکیڈمی، اشاعت منزل، اردو گلی، حیدرآباد، دکن ۔ ۱۹۹۴ء
۶۷	اردو شاعر کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	مکتبۂ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۷۸ء
۶۸	انسائیکلو پیڈیا آف اردو	مدیر اعلیٰ: پروفیسر فضل الرحمٰن	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۱۹۹۷ء

رسائل و جرائد

	نام رسالہ	نام مدیر	ادارہ وسنِ اشاعت
۱	ایوانِ اردو	مرغوم حیدر عابدی	اردو اکادمی، دہلی ۔شمارہ ۳۔ جولائی ۲۰۰۵ء
۲	شاعر	افتخار امام صدیقی	مکتبہ قصر الادب، دینا ناتھ بلڈنگ، پی۔ پی مارگ، بمبئی شمارہ: ۸ (جلد ۷۳) اگست ۲۰۰۲ء
۳	سابر نامہ	وفا جونپوری/ کریم اللہ انصاری	گجرات اردو ساہتیہ اکادمی گاندھی نگر، احمد آباد، گجرات۔سنِ اشاعت: ۱۹۹۹ء

☆☆☆☆☆☆☆
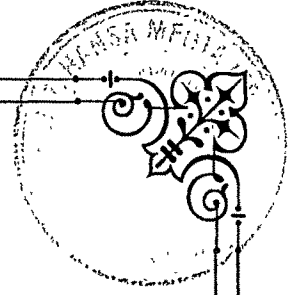
WALI
SHAKHSIYAT AUR FAN

A Thesis Submitted to
The Maharaja Sayajirao University of Baroda
For the Award of Degree of
DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU

BY

MASIHUZZAMA ANSARI

UNDER THE GUIDANCE OF

Dr. Anwar Zaheer Ansari
M.A., M.Phil., Ph.D. (URDU)

Department of Persian, Arabic and Urdu
Faculty of Arts
The Maharaja Sayajirao University of Baroda
Vadodara, Gujarat.

September - 2006

ولی۔ شخصیت اور فن

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودہ کی

پی ایچ۔ ڈی۔ ڈگری (اردو)

کے لئے تحریر کردہ تحقیقی مقالے کی

"تلخیص"

مقالہ نگار

مسیح الزماں ایچ۔ انصاری

نگراں و رہنما

ڈاکٹر انور ظہیر انصاری

ایم۔اے، ایم۔فِل، پی ایچ۔ ڈی۔ (اردو)

ولی

شعبۂ فارسی، عربی اور اردو

فیکلٹی آف آرٹس

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودہ

وڑودرا، گجرات۔

ستمبر۔ ۲۰۰۶
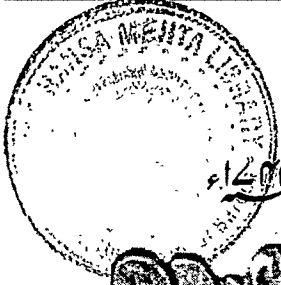
ولؔی
پیدائش : ١٦٦٨ء
وفات : ١٧۴۴ء
شہرت ہوئی ہے جب سے ترے شعر کی ولؔی
مشتاق تجھ سخن کا عرب تا عجم ہوا

ولی - شخصیت اور فن

تحقیقی مقالے کی

"تلخیص"

غزل ہماری تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہے، اور آج ہم غزل کی جو شاندار عمارت دیکھتے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیاد ولیؔ کی ہی غزل پر ہے۔ اس اعتبار سے ولیؔ اردو غزل کے ایک قدآور اور باکمال سخن ور ہیں۔ اُردو میں ولیؔ کی غزل گوئی کی اہمیت کئی اعتبار سے مسلّم ہے۔ کیوں کہ ولیؔ سے قبل اُردو غزل کی جو اوّلین شکل ہمارے سامنے آتی ہے، اس میں فارسی اور اردو کی جگہ مقامی بولیوں میں شاعری ہو رہی تھی۔ امیر خسروؔ سے لے کر دکن کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطبؔ شاہ تک اردو غزلوں پر فارسیت کا غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ ان پر مقامیت کا رنگ گہرا اور نمایاں تھا اور ان مقامی زبانوں میں دکنی کے علاوہ، گجراتی (گجری) اور کھڑی بولی کے الفاظ کثرت سے استعمال میں لائے گئے تھے۔ اس دور میں جو غزلیں شاہکار ہو رہی تھیں ان میں حقیقی سے زیادہ مجازی عشق کو موضوع بنایا جارہا تھا، اسی لیے اس دور میں جن شعراء نے بھی غزلیں کہیں وہ مقبول نہ ہوسکیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دکن میں فارسی کا رواج نہیں تھا اور یہ اشرافیہ کی زبان تصور کی جاتی تھی، جب کہ شمال میں اس کے برعکس وعظ و پند کے لیے فارسی سے بہ آسانی کام چل رہا تھا اور اردو غزل کی روایت کا باقاعدہ آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ اردو میں غزل گوئی کی تاخیر سے شروعات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس زمانے میں اردو کو ابھی غزل کے لیے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ابتدائی دور میں غزلیہ شاعری کی غیر مقبولیت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

ان حالات میں ولیؔ اردو شاعری کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں ایک طرف دکنی شاعری کی عظیم شاہ راہ اختتام کو پہنچی تھی اور دوسری جانب شمالی ہند میں اردو شاعری کے نئے دور کا آغاز ہورہا تھا، ایسے دور میں ولیؔ نے اردو غزل کو اپنا موضوع بنایا اور اُسے مقامیت کے سحر سے آزاد

کر کے اس نئی زبان ''اردو'' کے قالب میں ڈھالا، اور غزل پر فارسیت کے اقتدار کو ختم کر کے اُسے سبکِ ہندی کے زیورات سے مزیّن کیا۔ نیز یہ کہ وؔلی نے اردو (ریختہ) کی شکل میں دکن اور شمال کی شعری روایات کو ایک ادبی وحدت میں منسلک کردیا۔ یہ وؔلی کا ایک ایسا تاریخ ساز کارنامہ تھا جس کی بدولت ہندوستان کے تمام شعراء میں ان کی حیثیت، ایک ادبی رہنما اور استادِ سخن کے تسلیم کر لی گئی۔ وؔلی کے اردو غزل کو اپنا موضوعِ سخن بنانے سے اس دور کے تمام شعراء میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اردو میں نہ صرف غزل گوئی ممکن ہے، بلکہ اس میں امکانات کا ایک بڑا خزانہ بھی مخفی ہے۔

اُردو غزل میں وؔلی کی پیش قدمی زبان اور خیالات کے اظہار کا ایسا خوش آئند نقطۂ ارتقاء تھا، جسے تاریخ ایک عرصے سے طے کر رہی تھی۔ وؔلی نے اس زمانے میں نہایت دیدہ زیب اور پُرکشش انداز میں عوام وخواص میں اپنی غزلیں سنائیں، جس کی سبب ان کی قادر الکلامی اور لطافتِ زبان کا چرچا عام ہوگیا، اور فارسی کے گرویدہ شعراء بھی وؔلی کی شاعری اور ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لہٰذا ایسے شعراء جو فارسی زبان میں اشعار کہنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے وہ شعراء بھی اس زبان کی طرف مائل ہوئے اور اپنی موزوں طبیعتوں سے نغمہ سنجی کرنے لگے۔ چنانچہ ہندوستان گیر پیمانے پر وؔلی کی تقلید باعثِ فخر بن گئی۔ گویا یہ کہ وؔلی کے زمانے اور بعد میں بھی وؔلی کا کلام تمام شعراء کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ اور آج ہم اردو غزل کو جن بلندیوں پر دیکھ رہے ہیں اس کا سہرا وؔلی کے ہی سر ہے۔

اردو غزل میں وؔلی کو جو ممتاز مقام حاصل ہوا اور جو شہرت ان کے حصّے میں آئی اس کی بنیادی وجہ عشقیہ شاعری میں ان کا خاص طرزِ احساس تھا۔ انھوں نے اپنے اسلوبِ بیان اور طرزِ فکر میں اُن پامال راستوں سے کنارہ کشی اختیار کی جو اُس دور کے شعراء کا مطمعِ نظر تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے نئی نئی جہتوں، نئی طرزِ خاص اور اسلوب کی جانب اپنے افکار کو گامزن کیا اور نئے تجربات کی جانب اپنا رویّہ برقرار رکھتے ہوئے، الفاظ کے انتخاب اور معنی خیز تراکیب کے استعمال میں انھوں نے روایتی شاعری کے حصار کو توڑ کر اپنی الگ ڈگر بنائی اور اپنا منفرد رنگ قائم کیا۔ یوں غزل کے اس ابتدائی دور میں بھی انھوں نے اپنے فن کی وہ جولانی دکھائی جو ان کی شہرت اور ناموری کا سبب

بنی۔ ان کی غزل کی یہی امتیازی شان ان کا امتیازی نشان بھی بن گئی۔ کیوں کہ غزل ولیؔ کی محبوب ترین صنفِ سخن تھی، جس میں انھوں نے اپنی جدّتِ طبع، زورِ کلام، لطفِ ادا، حُسنِ بیان اور شیرینیٔ زبان کے جوہر دکھائے۔ اس طرح غزل کو آب و تاب اور توانائی بخشنے میں ولیؔ کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ولیؔ کو اردو غزل کا مخترع اور موجّد کہا جانا غلط نہ ہوگا۔

یہاں اس بات کا انکشاف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف ولیؔ کی غزل گوئی کے چرچے ہوئے وہیں دوسری جانب ان کی نجی زندگی اور ذاتی شخصیت پُراسراریت کے پردوں میں پوشیدہ رہی، اور ولیؔ جیسے بلند پایہ شاعر کے حالاتِ زندگی تفصیل سے تو کیا، اجمال کے ساتھ بھی نہیں معلوم ہوسکے۔ مزید برآں کہ ان کی زندگی کے بعض اہم پہلو مثلاً: تعلیم، تصانیف اور مسافرت کے علاوہ شخصی اوصاف، ازدواجی زندگی، خاندان اور ان کے متعلقین سبھی کچھ ہماری نظروں سے پوشیدہ رہے۔ افسوس یہ بھی کہ اِن حقائق سے چشم پوشی بھی کی گئی اور کوئی ایسی تحقیق جس سے یہ تمام پہلو روشن ہوجائیں پردۂ خفا میں ہی رہی تو کیا یہ مان لیا جائے کہ ان کی شہرت ان کی شخصی زندگی پر اثرانداز ہوگئی؟ اور ان کی غزلوں کی ہردل عزیز اور اثر آفرینی، اُن کی سوانحی زندگی اور ان کے احوال وکوائف پر حاوی ہوگئی اور ماسوا ان کے تخلص کے بقیہ تمام شخصی متعلقات نظروں سے اوجھل ہوگئے؟ یہ اور اِس طرح کے متنوع سوالات ہنوز ذہن کو کچوکے لگاتے ہیں، اس پر ستم ظریفی یہ بھی کہ ولیؔ کے تعلق سے تذکرہ نویسوں نے بھی ولیؔ کے نام، حیات، وطنیت اور مدفن کو اتنا خلط ملط کر دیا کہ جب ولیؔ کے شخصی حالات کی تلاش وجستجو ہوئی تو ان تذکرہ نگاروں کے متضاد بیانات نے ان کو ایک متنازع فیہ شخصیت بنادیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو ہستیاں آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکتی ہیں، ان کے حالات وواقعاتِ زندگی کے متعلق مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں سخت اختلافِ رائے نظر آتے رہے ہیں۔ اور بعض وقت ان اختلافات کی کثرت کی وجہ سے اصل حقیقت کا سراغ مشکل ہوجاتا ہے۔ اردو ادب میں ولیؔ بھی انہی اختلافات کا شکار ہوئے ہیں۔ اب اسے تذکرہ نویسوں کی غفلتوں پر محمول کیجئے یا ان کی تساہل پسندی پر، کہ یہ تمام تذکرہ نویس ولیؔ کے صحیح نام تک کی تحقیق کرنے سے بھی

قاصر رہے ہیں۔ یوں اردو اور بعض فارسی کے تذکروں میں ولیؔ کے نام بھی مختلف پائے جاتے ہیں۔ جیسے محمد ولی، ولی اللہ، ولی محمد، شاہ ولی اللہ یا شمس ولی اللہ، اسی طرح ولیؔ کی وطنیت بھی عرصۂ دراز سے موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے اور ان کے نام کی طرح ان کے وطن کے بارے میں بھی محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض تذکرہ نویس ولیؔ کو ''اورنگ آباد'' (دکن) کا باشندہ قرار دیتے ہیں اور بعض انھیں ''گجرات'' کا ساکن بتاتے ہیں۔

گویا یہ کہ مذکورہ اختلافات کو لے کر ولیؔ کے نام، وطنیت، مدفن، جائے پیدائش اور جائے وفات کے متعلق بڑی ہی گمراہ کن باتیں مشہور رہی ہیں۔ اور ان متنازعات کا قطعی اور مثبت حل تلاش کرنے کے بجائے ولیؔ کی وطنیت کو بطورِ خاص اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا گیا اور اُن کی زندگی کے دیگر پوشدہ اوراق سے پردہ ہٹانے اور تلاش و تحقیق کرنے کے بجائے ولیؔ کی وطنیت کو ہی حل کرنے میں پوری تحقیقی صلاحیت کام میں لائی جاتی رہی۔ اور ولیؔ کی شہرت اور مقبولیت کے پیشِ نظر اُسے ''اورنگ آبادی'' (دکنی) یا ''گجراتی'' ثابت کرنے کی ادبی جنگ جاری رہی۔ اس ضمن میں دکن میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، نورالحسن ہاشمی، علی احسن مارہرویؔ اور مولوی عبدالحق نے اپنی نادر تحقیقات پیش کیں اور ولیؔ پر ان کے اس تحقیقی کام کے عوض انھیں ''ماہرِ ولیات'' کے نام سے موسوم بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح ان کے بعد بھی ولیؔ پر مقالات لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس کے برعکس گجرات اور خصوصاً احمد آباد کے معدودے چند ہی محققین ہیں، جنھوں نے ولیؔ کو اپنے تحقیقی کام کی خاص جولان گاہ بنایا ہے۔ جن میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، سیّد منظور حسین علوی المعروف بر حسینی پیر (نامور نقاد وارث علوی کے والد ماجد) اور ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنیؔ قابلِ ذکر ہیں۔ گجرات کے ان تینوں محققین کے بعد ولیؔ پر تلاش و تحقیق کرنے والا کوئی محبِ ولیؔ نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود تقریباً تمام ساکنِ گجرات ولیؔ کو ''گجراتی'' ہی تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسری طرف اورنگ آباد (دکن) کے علمائے ادب انھیں ''دکنی'' کہنے پر بضد ہیں۔

یوں گجرات اور دکن کے فریقین کے مابین زمانۂ قدیم سے ہی اس تنازعہ پر بحثیں ہوتی رہی ہیں، اور موجودہ دور تک کوئی تحقیقی کاوش سنجیدگی کے ساتھ عمل میں نہیں آئی۔ شاید اس کی بنیادی وجہ

تذکروں میں مرقوم متضاد بیانات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسا تو بالکل بھی نہیں ہے کہ کوئی تحقیق حرفِ آخر ہو، یا جسے قولِ فصیل کا درجہ دے دیا گیا ہو، یا اُس میں مزید تحقیق کی گنجائش باقی نہ ہو۔ تحقیق میں نئے نئے انکشافات اور نئے نکات پیش ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا ولؔی پر بھی تحقیق جاری رہنی چاہیئے، تا کہ ولؔی سے منسلک ان متنازعات کا کوئی مثبت اور قطعی حل منظرِعام پر آسکے۔ جو کہ ولؔی کے متعلق تذکرہ نویسوں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور ان کی زندگی کے عام حالات اتنی وضاحت سے نہیں لکھے کہ ایک محقق ان سے بآسانی کوئی نتیجہ اخذ کر سکے، تاہم ولؔی کی سوانح حیات اور ان کی نجی اور شخصی زندگی کے متعلق بہت کچھ معلومات ان کے کلام کی روشنی میں نمایاں ہونے کے امکان باقی رہتے ہیں۔

ولؔی کی شخصیت کے تاریک پردوں میں پڑے رہنے اور ان کی شخصیت کو متنازع فیہ بنانے میں مرکزی کردار تذکرہ نویسوں کا رہا ہے، کیوں کہ یہی تذکرے شعرائے قدیم کی معلومات دریافت کرنے کا سب سے اہم مآخذ ہیں۔ لہذا اگر وہیں متضاد بیان اور اختلافِ رائے ہو تو ثانی مآخذ کی قدر و قیمت یوں بھی کمتر ہی ٹھہرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حالات کے تناظر میں ان کا جائزہ لے کر کوئی مثبت رائے ضرور دی جاسکتی ہے۔ جو کہ تذکرہ نگاروں کے ان متضاد بیان اور اختلافِ رائے کا منبع تو خود ولؔی کی ہی ذات دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس لیے کہ ولؔی نے احمد آباد (گجرات) کے اُس زمانے کے مشہور دارالعلوم ''مدرسۂ علویہ'' ۔ شاہ وجیہ الدین علویؒ'' (۱۵۰۱ء تا ۱۵۸۹ء) میں قیام کر کے یہاں تحصیلِ علم کیا تھا۔ گویا یہ کہ یہاں اپنے طویل قیام کے دوران ان کی آمدورفت بلادِ دکن سے بھی بخوبی وابستہ رہی، اسی طرح گجرات کے ساتھ ساتھ ولؔی نے دہلی کا بھی سفر کیا تھا۔ لہذا اس سفر کو خصوصی طور پر ولؔی کی شاعری میں پیدا ہوئی تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے اور یہ کہہ کر بات پوری کر دی جاتی ہے کہ ولؔی ۱۷۰۰ء میں دہلی گئے، اور وہاں شاہ سعد اللہ گلشنؔ سے ملاقات کی اور انھوں نے ولؔی کو مشورہ دیا کہ۔۔۔

''فارسی کے بیکار مضامین کو اپنے ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کرے گا''

(''نکات الشعراء'' (میر تقی میرؔ) مرتب : ڈاکٹر مولوی عبد الحق صفحہ : ۸۷

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی نمبر۔۱ ۱۹۷۹ء)

ولی کے سفرِ دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کو بھی صرف اسی تناظر میں دیکھا جاتا رہا ہے کہ شاہ گلشن کے مشورے کی بدولت ہی ولی نے اپنی شاعری میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ کیوں کہ بعض تذکرہ نویسوں نے ولی کے شاہ گلشن سے ملاقات اور مشورت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو کے اس اوّلین غزل گو کی اختراعاتِ شاعری اور لسانی تجربات کو اس مبینہ مشورے کے پس منظر میں ہی دیکھا جاتا رہا ہے۔ اور اس ضمن میں اُن کی تمام فنی کاوشوں کو شاہ گلشن کے مشورے سے جوڑ کر مطعون کیا گیا۔ ولی کے متعلق متنازعات کے اس باب میں بھی تذکرہ نویسوں کی چند سطروں میں مرقوم تحریروں کا ہی اعادہ کیا جاتا رہا ہے اور بغیر تلاش و تحقیق کے خاموشی سے اس مبینہ مشورے کا اعترافِ کیا گیا۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ولی جیسی تاریخ ساز شخصیت، جس نے اردو شاعری کی روایتی طرز سے انحراف کر کے اردو غزل کو نئے رنگ وروپ میں ہمارے سامنے پیش کیا تھا، اس کی زندگی کے تمام پوشیدہ شعبوں پر کثرت سے تحقیق کی جاتی، تاکہ ان کی زندگی کا ہر باب ولی کی تصویر کے خدوخال تک کو روشن اور اجاگر کر دیتا۔ لیکن حال یہ رہا کہ ولی کا صحیح نام تک تحقیق نہ کیا جاسکا۔

ولی کے انتقال کو تین صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی کے تمام گوشے پردۂ خفا میں پڑے ہوئے ہیں۔ مذکورہ متنازعات پر بہ نظر غائر غور کیا جائے تو مجموعی حیثیت سے ان کی حیات اور شخصیت نیز کلام پر سیر حاصل تحقیقی کام کی ہنوز کمی شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ صحیح معنوں میں ولی پر تحقیقی کام ہوا ہی نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیوں کہ ولی کے فوراً بعد کے شعراء میں میر تقی میر، سودا اور ذوق وغیرہ پر اتنا تحقیقی کام ہوا ہے کہ ان کے فن اور حیات پر درجنوں کتابیں مِل جائیں گی، لیکن اس کے برعکس ولی پر چند تصانیف کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا، اور ان کتابوں میں بھی ولی کی شخصیت اور کلام کا سرسری جائزہ ہی لیا گیا ہے، جس سے ولی کے متعلق ہماری تشنگی کو تشفی نہیں ہوتی۔ کیا اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ولی جیسی متنازع فیہ شخصیت پر قلم اُٹھانے کی ہمت پیدا کرنے سے محققین قاصر رہے؟ یا یہ کہ وہ اپنی ادبی شخصیت کو ولی کے متنازعات کے خارزار میں الجھا کر مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے؟ یا اُنھیں ولی کے متنازعات کی فہرست اتنی طویل

دکھائی دیتی رہی کہ دانستہ اور شعوری طور پر ان متنازعات کی تحقیق سے چشم پوشی اختیار کیے رہے۔ کیوں کہ وؔلی کی شخصیت بلاشبہ ایک ایسا دشتِ بیابان ثابت ہوئی ہے، جس کی سیّاحی میں راستے کی صعوبتیں اور کھٹن مراحل اور بھی زیادہ درپیش ہوتے رہے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ وؔلی کی شخصیت کے متنازع فیہ طوفانی سمندر میں غواصی کر کے درِ نایاب مَنظرِ عام پر لانا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔

اس ضمن میں واقعہ یہ رہا ہے کہ وؔلی نے آنے والے زمانے میں اردو شعروسخن کے دھارے کو موڑنے میں جو اہم کردار انجام دیا اس کی وجہ سے اردو زبان وادب کے بعض عالموں نے ان کو اپنے مخصوص صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی، اس کوشش کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ ''اہلِ گجرات'' اور ''اہلِ دکن'' نے کچھ تحقیقی تحریریں وؔلی پر سُپردِ قلم کیں، اور انھیں اپنے اپنے قوتِ دلائل سے ''گجراتی'' یا ''دکنی'' ثابت کرنے کی کوششیں کیں، اور شاید وؔلی کو اپنے اپنے صوبوں سے منسوب کرنے کی ہوڑ میں احمد آباد (جہاں وؔلی نے ''مدرسۂ علویہ۔ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ'' میں تعلیم حاصل کی تھی۔) میں بھی وؔلی کے مزار کی نشاندہی کی گئی اور اورنگ آباد (دکن) میں بھی وؔلی کے مزار ہونے کا ثبوت دیا گیا۔

گویا یہ کہ وؔلی کی وطنیت، نام، جائے پیدائش، جائے وفات، مدفن وغیرہ سب ہی کچھ متنازعات میں گھرے رہے۔ لیکن ان موضوعات پر تحقیق کی مثبت کوشش نہیں ہوئی، اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو محض اس حدتک کہ ان تذکرہ نگاروں کے بیانات کو ہی روشن کیا گیا۔ اور ان متنازعات سے بچ کر نکلنے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن وؔلی کے ان متنازعات کو پورے انہماک اور ذمّے داری سے انجام دینے کی سعی نہیں کی گئی۔ البتہ اتنا ضرور ہوتا رہا ہے کہ، اردو غزل کو فروغ دینے میں اپنی اوّلیت کی وجہ سے وقتاً فوقتاً ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ اور بعض مرتبہ وؔلی پر کچھ کتابیں بھی منظرِ عام پر آتی رہی ہیں، لیکن آج بھی ان کی تعداد اکائی سے آگے نہیں بڑھی۔ یہ عجب ستم ظریفی رہی ہے۔ اس ضمن میں اگر وؔلی پر قلم اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے تو صرف اس حدتک کہ چند اوراق پر مشتمل ایک مضمون یا مقالے کی شکل میں وہی سرسری باتوں کا اعادہ کیا گیا، اور وؔلی کے ان متنازعات کو شعوری طور پر نظر انداز کیا گیا۔ تاکہ علماء وناقدین کے وار سے محفوظ رہا جاسکے۔ وؔلی

پر جستہ جستہ لکھے گئے یہ مقالات مختلف اخباروں اور جریدوں کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اسی طرح گاہِ بگاہِ بعض ادبی انجمنیں بھی وؔلی پر ادبی پروگرام کے تحت سیمینار اور اجلاس کا اہتمام کرتی رہی ہیں، اور ان اجلاس میں پیش کردہ مضامین کو کتابی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان میں بھی وؔلی کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی شعری خصوصیات کے ساتھ ساتھ وؔلی کے متنازعات کے تمام نکات ان کی مثبت توجہ سے محروم رہے ہیں۔ چنانچہ وؔلی کے فکر وفن اور ان کی زندگی کے حالات عیاں کرنے میں باضابطہ اور باقاعدگی کے ساتھ جو کام تحقیقی دروں بینی اور وسعتِ مطالعہ کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا اس کے لئے منظم تحقیقی کوشش نہیں کی گئی۔

نفسِ مضمون یہ کہ وؔلی کی شخصیت اور ان سے وابستہ متنازعات ابتداء سے ہی ادبی سیاست کا حصہّ بنے رہے اور ان کی زندگی پُر اسراریت کے پردوں میں پوشیدہ رہی اور ان پر لکھی گئی کتابیں بھی ان متنازعات کے حل میں ناکام ثابت ہوئیں۔ **اوّل** تو اس بات سے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ وؔلی پر تلاش وتحقیق کی رفتار اس قدر سست کیوں رہی ہے؟ **دوم** یہ بھی کہ وؔلی پر لکھے گئے مضامین بھی اوراقِ پارینہ بن گئے اور اہلِ قلم حضرات نے وؔلی پر اپنی نگارشات پیش کرنے میں غفلت اور بے نیازی سے کام لیا۔ لہٰذا مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وؔلی اردو کے نامور علماء، ادباء اور محققین کے تغافل کا شکار ہوئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر وؔلی پر کچھ مواد ملتا بھی ہے تو وہ مضامین، اور مقالات کی شکل میں متفرق کتبِ اردو میں بکھرا پڑا ہے اور پھر ان تک رسائی بھی مشکل ہوگئی ہے۔

وؔلی کے شاعرنہ کمال اور ان کی شخص زندگی سے وابستہ ان متنازعات نے وؔلی کو تجسس آفرین شخصیت بناکر رکھ دیا ہے۔ گویا وؔلی کے متعلق مذکورہ بالا مسائل نے راقم کی توجہ اس جانب مبذول کی کہ وؔلی کو اپنی تحقیقی کاوش کا موضوع بنایا جائے اور اُن سے متعلق اختلافات کا ازسر نو جائزہ لیا جائے، اور یہی وجہ ہے کہ راقم نے وؔلی کی متنازع فیہ شخصیت کو اپنی تحقیق کا موضوع بناکر وؔلی پر تحقیقی فقدان کے خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں زیادہ تر ابواب وؔلی کے متنازع فیہ معاملات کے تحت زیرِ بحث آئے ہیں۔ جن میں وؔلی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیق کی روشنی میں مبسوط جائزہ لیا گیا ہے۔ وؔلی کی پہلودار لیکن متنازع فیہ شخصیت پر قلم اُٹھانا اور اُسے فنکارانہ

حُسن کے ساتھ لفظوں کا جامہ پہنانا مجھ جیسے طالبِ علم کے لیے آسان کام نہیں تھا، تاہم ولؔی کی حیات اور شخصیت کے متنازع فیہ نکات کے جن موضوعات کا خاص طور پر احاطہ کیا گیا ہے، ان کے پیشِ نظر مجھے امید ہے کہ یہ مقالہ ولؔی کے متعلق رائج ہوچکی بہت سی گمراہ کن باتوں کو خارج کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں بعض پرانی تحقیقات کو زیرِ بحث لاکر نئی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے موضوع کا پورا حق ادا کرنے میں مجھ سے چوک ہوگئی ہو، تاہم راقم نے اپنی بساط کے مطابق یہ قلمی مرقع تیار کیا ہے اور اس ضمن میں تمام ممکن الحصول مآخذات کی روشنی میں ولؔی کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا گیا ہے، اورحتی المقدور ولؔی کے متعلق غیر متعصب اور غیر جانب دار رہ کر مخالف اور موافق آراء کا جائزہ لے کر اس تحقیقی مقالے کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ **چھے (۶)** ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفاصیل کی **''تلخیص''** مندرجۂ ذیل ہے۔

بابِ اوّل :- ولؔی کے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور یہاں کی قدیم تہذیبوں کے ساتھ اختلاط کے باعث ایک ایسی مشترکہ تہذیب نے جنم لیا جسے ہند ایرانی تہذیب بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا دکن کے تمدن کی تعمیر میں پہلا تاریخ ساز واقعہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب سلطان علاؤ الدین خلجی نے پہلی بار اسے فتح کرکے دہلی کی مرکزی حکومت کے ماتحت کردیا۔ لیکن دکنی تہذیب پر شمالی ہند کی تہذیب کے زیادہ واضح اثرات اس وقت مرتب ہوئے جب محمد بن تغلق نے دہلی کے بجائے ''دولت آباد'' (دیوگیری) کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اس کے اس فیصلے کو تاریخ میں چاہے بھلے ہی احمقانہ کہا گیا ہو، لیکن اس کے نقل آبادی کے احکامات صادر کرنے اور اس پر سختی سے عمل درآمد ہونے سے دکن میں دوسرا شمالی ہند آباد ہوگیا، اور یہیں تاریخِ ادب کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس میل جول کے نتیجے میں کسی نوزائیدہ زبان کے پرورش پانے کے امکانات روشن ہوگئے، گویا یہ کہ مقامی اور بیرونی بولیوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو ''دکنی'' کہلائی ہے۔

اس علاقے میں قائم مختلف خود مختار حکومتوں کو ایک ہی سیاست اور حکومت کے تحت متحد

کرنے میں سلاطینِ بہمنیہ کا اہم حصّہ رہا ہے جس نے ۱۳۵۰ء سے ۱۵۲۵ء تک سیاست کی رہنمائی کی۔ سر زمین دکن پر یہ دور اپنی تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے اہم گزرا ہے۔ اس دور کے تمام سلاطین نے علمی و ادبی سرپرستی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں ابن نشاطیؔ، ہاشمیؔ، میراںؔ جی اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز وغیرہ کے ساتھ شعراء کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے، جنھوں نے مقامی اور غیر مقامی لفظوں کی آمیزہ زبان میں شاعری کی ہے۔ بہمنیہ سلطنت کے زوال کے بعد پانچ خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں، جن میں گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ سلطنتیں انتہائی طمطراق سے ۱۴۹۰ء میں قائم ہوئیں اور ۱۶۹۹ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی اطاعت پر ختم ہوگئیں۔ قطب شاہی دور ادبی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں مشہور شاعر محمد قلی قطبؔ شاہ، عبد اللہ قطب شاہ، ابراہیم شاہ، میراںؔ، ہاشمیؔ، نصرتیؔ، وجہیؔ، مقیمیؔ، جنیدیؔ، شوقیؔ، رستمیؔ اور ابن نشاطیؔ وغیرہ ہیں۔

اس زمانے میں ابراہیم عادل شاہ نے سرکاری زبان فارسی کے بجائے دکنی کردی۔ اسی سبب سے دکن میں اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہونے کے مواقع بڑھ گئے۔ اس زمانے میں صوفیاء کا بھی پورا ایک طبقہ تھا جنھوں نے مذہب وملّت کی تفریق سے بے نیاز خدمت خلق کو اپنا مسلک بنائے رکھا، اور مساوات، خلوص ومحبت، صلح و آشتی کا عملی درس دینے میں اسی مخلوط زبان کا استعمال کیا۔ دکن میں اردو شاعری جس ماحول اور فضاء میں پروان چڑھی اس میں اگر چہ مقامی اثرات بہت گہرے تھے، لیکن درباری زندگی پر ایرانی تہذیب کی چھاپ بہت نمایاں نظر آتی ہے، اور ان بادشاہوں نے اُنھی درباری روایتوں کو قائم رکھنے کی کوشش کی جو ایرانی تہذیب کے لئے مایۂ افتخار تھیں۔ ان حکمرانوں کی علمی سرپرستی نے ہندوستانی مذاق وتمدن کو ہمہ گیر بنانے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ اور نہ صرف شعروادب کی توسیع واشاعت میں حصّہ لیا بلکہ خود بھی شعروسخن کی تعمیر وتشکیل میں لگے رہے۔ اسی طرح ان سلطنتوں نے آخری دم تک علمی اور تمدنی شمع کو جلائے رکھا۔

دکنی سلطنتوں کے زوال کے آثار اُس وقت شروع ہوئے جب اورنگ زیب عالمگیر نے دکن میں پیش قدمی کی۔ حالانکہ ان سلطنتوں نے آخری دم تک مدافعت کی، لیکن مغل افواج کے سامنے

بونے ثابت ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مغلوں کے سیلاب سے نہ صرف دکنی سلطنتوں کی تمام دیواریں منہدم ہورہی تھیں، بلکہ تمدن کی تمام شمعیں بھی خاموش ہورہی تھیں اور وہ علمی صحبتیں بھی جن کے پُر کیف نغمے ہندوستان کو گرویدہ کئے ہوئے تھے، سونی ہونے لگیں تھیں، اور ہر چند کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن کی تمام ریاستوں کو تسخیر کرلیا، لیکن اس کے باوجود ان سلطنتوں کی پچھلی روایات کا اثر باقی رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرسودہ ماحول میں جہاں صرف توسیع سلطنت اور معرکہ آرائیوں کا بازار گرم تھا، اس انتشار پذیر ماحول میں بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور اچھے شاعر بھی پیدا ہوئے۔ اس دور کے شعراء میں عزلتؔ، داؤدؔ، ایماؔ، ارشدؔ، ایجادؔ، عاجزؔ، ذکاؔ، بحریؔ، آزادؔ، سراجؔ، امینؔ، وجدیؔ اور ولیؔ ہیں۔ ان شکست خوردہ سلطنتوں کی علمی پیداوار اور تمام تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا صحیح اندازہ ہوسکے گا، کہ ان سلطنتوں نے اپنی آخری سانس تک خاطرخواہ عمرانی خدمات انجام دیں۔

اورنگ زیب عالمگیر نے جس نے کہ دکن کی مہمات میں اپنی پوری زندگی بسر کردی اور ہمیشہ سیاسی مصلحتوں کے سبب بر سر پیکار رہا، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دکن کا عہد اضطراب ہے اور ولیؔ اسی مضطرب زمانے کی پیداوار ہیں۔ اور اگرچہ ان کی پیدائش اور موت کی قطعی تاریخیں نہیں معلوم ہوسکیں لیکن اس کی ادبی زندگی کے عام بہاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے آخری اور ابتدائی عرصے میں شعروسخن کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

اورنگ زیب ایک سخت گیر سیاست داں اور مدبّر حکمراں واقع ہوا تھا۔ اسی طرح اس کے مذہبی خیالات بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود صنعت، زراعت، تعمیرات، مدارس اور علوم وفنون کی سرپرستی میں کسی قسم کی کوتاہی اس نے نہیں کی۔ لہٰذا اس کے زمانے میں خصوصًا احمد آباد میں بڑے مدارس قائم ہوئے جہاں ''مدرسہ ہدایت بخش'' اور ''مدرسۂ علویہ'' خاص طور پر ہندوستان بھر میں مشہور رہے۔ اسی زمانے میں ولیؔ نے احمد آباد میں قیام کیا اور ''مدرسۂ علویہ'' میں تعلیم حاصل کی۔ اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت پر قدم جمانے کی اس کے جانشینوں میں لیاقت کے فقدان کے سبب سرکشوں کے حوصلے اور بڑھ گئے جنھوں نے پورے ملک میں بدنظمی اور بدامنی کا دور دورا کردیا۔

باب دوم :- ولی کی سوانح حیات

ولی کی سوانح حیات جو کہ تاریخ کا ایک گم شدہ باب کی سی ہوچکی ہے، لیکن اس کے باوجود گذشتہ چند تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ولی ۱۶۶۸ء میں ''اورنگ آباد'' میں پیدا ہوئے تھے۔ ولی کی غیر معمولی شہرت اور ان کے کلام کی عالمگیر مقبولیت کے ساتھ ان کے حالات کے متعلق ہمارے تذکرہ نویس بہت ہی مختلف الرائے ہیں۔ ولی کے نام، وطن، تعلیم و تربیت، مدفن غرض کہ ہر چیز کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان مختلف بیانات کے کئی اسباب بھی رہے ہیں۔ **اوّل** یہ کہ اُردو کے تمام تذکرے ولی کی وفات ۱۷۴۴ء سے کم وبیش دس تا چالیس برس بعد لکھے گئے۔ اس لیے ان تذکرہ نگار حضرات کے نزدیک حالاتِ زندگی کی تحقیق کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُن تذکروں کی روشنی میں جن کو ولی سے قربِ زمانی حاصل ہے یہ بات تسلیم کی گئی کہ ان کا نام ''ولی محمد'' ہے۔

ولی نے اپنی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہی حاصل کی اور مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے احمد آباد کے اس زمانے کے مشہور مدرسہ ''مدرسۂ علویہ'' جو علامہ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ (۱۵۰۱ء تا ۱۵۸۹ء) کا قائم کردہ تھا، گجرات تشریف لائے اور یہاں ایک طویل عرصے تک قیام پذیر رہ کر اپنے مولد و مسکن لوٹ گئے اور شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ اس زمانے میں دکن بڑی افراتفری کے دور سے گزر رہا تھا۔ لہٰذا ولی احمد آباد اور گجرات کے درمیان سفر کرتے رہے اور ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر بھی کیا۔ اور شاہ سعد اللہ گلشنؒ سے ملاقات کی اور کچھ عرصے (تقریباً ایک تا دو ماہ) قیام کرکے دوبارہ دکن لوٹ آئے اور پھر دوبارہ ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں دہلی کا سفر کیا اور اس سفر میں وہ اپنا دیوان بھی ساتھ لے گئے، یوں ولی نے اپنے انوکھے شاعرانہ کلام سے دہلی والوں کے دلوں کو موہ لیا۔ یہ ولی کا ایسا لسانی کارنامہ تھا جس میں دکنی اور دہلوی زبان کے انضمام سے ایک نئی زبان استعمال کی گئی تھی جسے ریختہ (اردو) کہا جاتا تھا۔ ولی کا اس زبان میں شاعری کرنا اور اس زبان میں ایک کامیاب شعری سرمایہ پیش کرنے سے اہلِ دہلی میں ولی کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا۔

ولی کی اسی مقبولیت کے پیشِ نظران کی شخصی زندگی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور صرف سنی سنائی باتوں پر اکتفا کر کے قیاس آرائیوں کا سہارا لیتے ہوئے بات کی گئی۔ ولی کا شعری کارنامہ جو ان کے لسانی اجتہاد پر مبنی تھا، جس کے عوض انھیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اردو شاعری خصوصاً غزل کو فروغ دینے میں ان کا جو بنیادی کردار رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے ''اہلِ گجرات'' اور ''اہلِ دکن'' نے انھیں ''ولی دکنی'' اور ''ولی گجراتی'' کہہ کر اپنے اپنے صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا ان تنازعات کے حل کے لیے ماٰخذ کے طور پر تذکروں کو اوّلیت دی گئی۔ لیکن وہاں بھی متضاد تحریریں اور اختلافِ رائے کے ہوتے ہوئے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ ولی کو اپنے صوبوں سے جوڑ کر بجا طور پر اُس فخر کو حاصل کرنے کی کوششوں میں متضاد تحریریں دکن اور گجرات میں منظر عام پر آتی رہیں۔ لہٰذا ولی کو ''دکنی'' اور ''گجراتی'' ثابت کرنے کی ہوڑ اس حد تک آگے بڑھی کہ دونوں مقامات پر ولی کے مزارات کی نشاندہی کی گئی۔ اس طرح ولی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر اُسے ''دکنی'' یا ''گجراتی'' ثابت کرنے کی ادبی جنگ جاری رہی، اس طرح ولی کی شخصیت ادبی سیاست کا حصّہ بن گئی۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ جب دکن میں ۱۹۳۷ء میں ولی کی دو صد سالہ برسی منائی گئی، اس اجلاس سے قبل گجرات میں ولی پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ البتہ یہ ایک الگ بات ہے کہ ولی کے ''دکنی'' اور ''گجراتی'' ہونے کے متضاد بیان تذکروں میں اس سے قبل ہی نقل آئے تھے، لیکن اس واقعہ (۱۹۳۷ء میں دکن میں ولی کی دو صد سالہ برسی کے اجلاس منانے) کے بعد گجرات میں تحقیقی کام کا آغاز ہوا، اور قاضی اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی اور سید حسینی پیر علوی (المعروف بر حسینی پیر) وغیرہ نے اپنی تالیفات پیش کیں اور چند مبینہ دستاویز کے عوض جو سید منظور حسین علوی کی مملکہ میں بتائی گئی تھی، ولی کے ''گجراتی الاصل'' ہونے کا صور بلند و بانگ طریقے سے پھونکا گیا۔ اسی طرح دکن میں بھی نورالحسن ہاشمی، محی الدین قادری زور، مولوی عبدالحق اور علی احسن مارہروی نے ولی کی وطنیت کے باب میں نئے انکشافات پیش کیے۔

لیکن گجرات کے محققین کی تحقیقات اور ان کی طرف سے پیش کردہ دستاویزات صرف تحریری شکل میں ہی منظرعام پر آئیں، لیکن ان کے حقیقت الوجود ہونے کا قطعی ثبوت فراہم نہ کیا گیا، اور
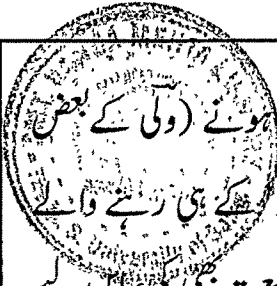
اسی طرح ان کی دیگر باتیں بھی مشکوک ہوگئیں۔ لہذا ولؔی کے ''دکنی الاصل'' ہونے (ولؔی کے بعض اشعار اور دیگر مآخذات کی روشنی میں) کو تسلیم کرلیا گیا، کہ ولؔی ''اورنگ آباد'' کے ہی رہنے والے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی تعلیم و تربیت احمد آباد (گجرات) میں ہوئی اور وہیں بیعت بھی کی، اس لیے بعض حضرات (تذکرہ نویسوں) نے ان کو ''گجرات'' کا باشندہ سمجھ لیا۔ اس ضمن میں کسی کا کلام جس میں وہ خود اپنے وطن کی گواہی دیتا ہو، انکار کرنے میں کسی طرح کی قباحت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود ولؔی کے نام، وطنیت، اور تاریخ پیدائش و وفات کے متعلق ہمیشہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

بابِ سوم :- ولؔی سے قبل صنفِ غزل کا فروغ

ولؔی سے قبل قدیم دکنی ادب میں زیادہ تر حصہّ مثنوی کا ہے، لیکن صنفِ غزل میں ولؔی سے قبل کے شعراء کی ایک پوری صف موجود ہے۔ جن میں دکن میں قطب شاہی سلطنت کا فرمانروا محمد قلی قطبؔ شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) ایک صاحبِ دیوان شاعر گزرا ہے۔ مگر ولؔی سے قبل کے ان شعراء کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کے سبب اُردو شعر و شاعری کے نقطۂ نظر سے ان کے کلام کو صاف اور شیرین نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ ان کے کلام پر سنسکرت اور مقامی دکنی زبان کا بہت زیادہ اثر پڑ رہا تھا، وہ اس لیے کہ دکن میں جب ۱۳۴۷ء میں بہمنیہ سلطنت قائم ہوئی تو اس وقت تک فارسی شاعری نے ترقی کے سب مدارج طے کرلیے تھے۔ لہذا سلطنتِ بہمنیہ سے لے کر اُس کے زوال کے بعد منظرِ عام پر آنے والی پانچ خود مختار سلطنتوں جن میں عادل شاہی اور قطب شاہی کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان تمام سلطنتوں کی تاریخِ ادبیات میں جتنی بھی شاہکار تصنیفات وجود میں آئیں ان کے اکثر پہلو ایران و وسط ایشیاء کی تاریخِ ادبیات سے مربوط ہیں۔ اس لحاظ سے جب دکنی اربابِ ادب نے فکر و تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہا تو ان کے سامنے فارسی شاعری کا پیکر موزوں موجود تھا، لہذا دکنی شاعروں نے بھی فارسی مثنوی، فارسی قصیدہ اور فارسی غزل کا چربہ اتارنا شروع کردیا۔

فارسی شاعری کا اعلیٰ نمونہ دکنی شعراء کے لیے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوا۔ لہذا خصوصی طور پر دکنی مثنویاں اردو ادب کے لیے ایک گراں بہا سرمایہ ثابت ہوئیں۔ لہٰذا دکنی شاعروں نے زیادہ تر اسی صنف

سخن میں اپنے فکر وتخیّل کی روئدادیں قلم بند کیں ہیں، اور پھر ان شاعروں کا فکروتخیل مثنوی کی بے پناہ وسعت کی وجہ سے عشق اور تصوّف کے دائرے سے نکل کر رزمیہ، تاریخی، نیچرل اور دوسری تمام اصنافِ سخن میں پرواز کرنے لگا۔ حالانکہ مثنوی کے علاوہ غزل قصیدہ وغیرہ کا دامن انتہائی تنگ واقع ہوا تھا، جبکہ اس کے برخلاف مثنوی کے اندر اپنے زورِ تخیل کی نمائش اور جولانی طبع کے اظہار کا نہایت عمدہ موقع میسّر ہوتا تھا۔ اسی سبب سے دکن میں شاہکار مثنویوں کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے۔ ان مثنویوں میں ''قطب مشتری'' جو خود بادشاہِ وقت سلطان قلی قطبؔ شاہ کی روئدادِ محبت ہے، شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اسی طرح غواصؔی کی ''سیف الملک وبدیع الجمال'' ابن نشاطؔی کی ''پھول بن'' اور نصرتؔی کی ''گلشنِ عشق'' وغیرہ، ان شعراء کے سحرنگار قلم کی ایک دائمی یادگار ہیں۔

عاشقانہ جذبات کے یہ اثرات صرف مثنویوں تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس کا اثر غزل کی لطیف ترین صنف پر بھی بہت جلد پڑ گیا۔ ولؔی سے پہلے اس میدان میں دکنی شعراء نے اپنی یادگاریں بہت کم چھوڑی ہیں۔ مثنوی نگار شعراء کا زیادہ تر کلام تو مثنوی اور مرثیے کی شکل میں ہی دستیاب ہوا ہے اور ان میں غزلوں کی مقدار بہت کم ہے۔ یوں تو اردو غزل کا تاریخی دور امیر خسؔرو سے شروع ہوتا ہے اور چوں کہ دکن کے تمام سلاطین شیعہ واقع ہوئے تھے۔ لہذا مرثیے اور قصائد کے اثرات غزلوں پر حاوی رہے۔ لیکن اورنگ زیب کی فتح دکن کے ساتھ دکن میں مرثیہ اور شیعہ عقائد کے فروغ کے امکانات تاریک ہوگئے اور دکنی تمام ریاستیں براہِ راست دہلی کی مرکزی سلطنت کے زیرِ نگاہ آ گئیں، لہذا اس بناء پر قصائد کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔

دکن کی تمام سلطنتوں کے حکمراں چونکہ بنیادی طور پر ایرانی نژاد تھے۔ لہذا ان کے تہذیبی اثرات بھی یہاں کے تمدن پر اثر انداز ہوئے۔ لہذا دکن میں ایرانی اور دکنی ثقافت کا ایک دلکش امتزاج بن گیا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب اور زبان کی سطح پر بھی یہ مشترکہ تہذیب نمایاں ہوئی اور ہند ایرانی تہذیب سے تربیت یافتہ نئی ہندوستانی زبان اور اس کا ادب مقبول ہوا اور اسی تہذیبی سنگم نے دکن میں اردو ادب میں خصوصًا غزل کو فروغ دیا۔ غزل چونکہ فارسی زبان کی ساختہ پرداختہ تھی اور دکنی غزل گو شعراء کے سامنے فارسی شاعروں کی غزلوں کا نمونہ موجود تھا۔ لہذا

انھوں نے اسے معیار بنا کر فارسی الفاظ، تراکیب اور محاورے وغیرہ کا بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا۔لیکن اس تقلید میں انھوں نے اردو غزل کی بنیاد ہندوستانی روایات پر رکھیں۔ اس لیے فارسی کے محبوب، معشوق، صنم اور دلربا جیسے الفاظ کے بجائے ان دکنی شعراء نے اپنے ارضی محبوب کو پیو، سجن، موہنی، سندری، پدمنی جیسی ہندوستانی اصطلاح دے دیں۔ یوں کہنے کوتو دکن کے تمام شعراء نے غزلیں کہی ہیں، لیکن تبرّکاً تا کہ انھیں کوئی ''یک فنا'' نہ کہے۔ لہٰذا اپنی مکمل استادی کو ثابت کرنے یا تفنن طبع کی خاطر ہی غزلیں کہی گئیں۔ اس لیے اردو غزل کو اپنے ابتدائی دور میں وہ بھرپور اور مکمّل زرِدراہ میسّر نہیں ہوا، جس کی اسے ضرورت تھی۔اس لیے اپنے اس ابتدائی زمانے میں غزل ایک طفلانہ اور معصومانہ سادگی کے سوا کوئی دوسری اعلیٰ ادبی خصوصیت اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہی۔

باب چہارم (الف) :- ولؔی کی شعری وسعتیں

ولؔی کی شاعری بنیادی طور پر حُسن پرستی پر مبنی ہے۔ انھوں نے اسی حُسن کی رنگارنگ تصویریں پیش کی ہیں۔ اور اتنے دلکش اور محرک انداز میں پیش کی ہیں کہ ولؔی کے معشوق کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے۔ گویا مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ولؔی کی شاعری میں حُسن کے چرچے، وصل کی آرزو اور ہجر کی تڑپ نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری میں حُسن کی بہتات کے ساتھ ساتھ عشق کی تکرار سے معمور نظر آتی ہے۔ لیکن اس تکرار کا بیان انھوں نے اتنے مختلف النوع طریقوں سے کیا ہے کہ اُکتاہٹ کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کا لطیف احساس ہوتا ہے۔ ولؔی نے اپنے ان عاشقانہ خیالات کا اظہار ایسے فصیح اور مترنم الفاظ میں کیا ہے کہ ہر مسلم الثبوت شاعر نے اُن کی استادی کا لوہا مانا ہے۔ اسی طرح فارسی تراکیب اور ہندی الفاظ کی برمحل دروبست سے ان کا کلام حسن کاری کا بہترین نمونہ بن گیا ہے۔ جس طرح اُن کے خیالات میں رنگینی اور شگفتگی ہے اسی طرح ان کے اشعار کا ہر ہر لفظ مسرت بخش ہے اور ان کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ ان پر موجودہ زمانے کا کلام ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

ولؔی کے کلام کی حیرت انگیز مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا **پہلا سبب** تو یہ ہے کہ ان کی زبان

شستہ، دلکش و دل آویز ہے۔ لہٰذا ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی، لطافت اور وسعت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ **دوسرا سبب** یہ رہا کہ جدید مضامین و خیالات جواب تک نظم اُردو میں داخل نہیں ہوئے تھے، لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ اس اعتبار سے غزلوں میں خصوصًا وؔلی نے ہر قسم کے مضامین پیش کئے ہیں۔ آلام محبت، معشوق کے بے پناہ حسن کی تعریف، عشقیہ واردات و کیفیات ایسے مضامین وؔلی کی شاعری کی جامعیت اور وسعت کا پتہ دیتے ہیں۔ وؔلی کی شاعری کی **تیسری خصوصیت** یہ بھی ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا فارسی اوزان اور بحور نیز ردیف وقافیہ کے التزام کے ساتھ کہا۔ ان کے مضامینِ عالیہ تنگنائے عروضِ فارسی میں آکر ایک خاص موزونیت، کشش اور تاثیر کے مالک بن گئے ہیں۔ مزید برآں مروجہ اصنافِ سخن میں بھی وؔلی نے طبع آزمائی کی، گو ان کی تعداد قابلِ شمار نہیں تاہم ان میں قصیدہ اور مثنوی کے علاوہ مستزاد، ترجیع بند، رباعیاں اور قطعات بھی موجود ہیں۔ اور یہی تمام چیزیں شعرائے مابعد کے لئے شمع راہ بنیں اور انھیں کی بنیادوں پر اُنھوں نے اپنی شاعری کی عالیشان عمارت تعمیر کردی۔

یہی صورتِ حال وؔلی کے یہاں تشبیہ کی خصوصیات اور برمحل استعمال سے ابھری ہے۔ لہٰذا وؔلی کو بلامبالغہ تشبیہات کا بادشاہ کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ایسی اچھوتی اور نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ قارئین ان کی ندرت اور لطافت سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وؔلی کے کلام میں اس قسم کے سیکڑوں اشعار ملیں گے جو فصاحت کی جان ہیں اور انسان کے لیے مسرت کا ایک وافر ذخیرہ اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔ وؔلی کا دلکش طرزِ نگارش، جدّتِ اسلوب، سلاستِ بیان غرض فنی نقطۂ نظر سے وہ تمام محاسن جو ادب کو ادب کہلانے کا مستحق کرتے ہیں وؔلی کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کا کلام ترنم اور موسیقی کی سحر آمیز کیفیت پیدا کرتا ہے، وہیں اس امر کا احساس بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے آلام ومصائب کے واضح اشارے بھی اُن کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم ان کو غزلوں میں خالص عشقیہ جذبات کا شور سنائی دیتا ہے، اور ان کے کلام کے ہر ہر لفظ سے ترنم ٹپکتا ہے تو وہیں انسانی زندگی کو لاحق روز مرّہ کے معاملات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض مرتبہ ایسے الفاظ جو ہماری سماعت کو بھلے ہی، بھلے معلوم نہیں ہوتے، لیکن وؔلی کے کلام میں وہی ایک خاص انبساط پیدا کرتے

ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزل کے میدان میں حُسن کے بیان میں ولؔی کی یکتائی مسلّمہ ہے۔ اور اس پر لطف یہ کہ حُسن کے بیان میں ان کا تخیل بھی ابتذال کی طرف مائل نہیں ہوا، جس سے ہمارا ذوقِ سلیم مجروح ہو۔

باب چہارم (ب) :- ولؔی کی شاعری میں تصوّف

ولؔی کی شاعری کا بنیادی موضوع تو حُسن پرستی ہے۔ لیکن اسی مجازی عشق سے ہوکر ہی اس کی سرحدیں حقیقت کو ملتی ہیں۔ کیوں کہ ولؔی جیسا لفظ و معنی کا یہ تاجدار حُسن کا بیان لفظوں میں جس جامعیت اور جس بلاغت کے ساتھ کرتا ہے تو بلاشبہ اس پر ''بت پرستی'' کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل ولؔی کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں اس قدر ہم آہنگ نظر آتے ہیں کہ ولؔی کے صوفی ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن بعض ناقدین نے ولؔی کی ''صنم پرستی'' کے طفیل اُنھیں صوفی کی صف سے خارج بھی کیا ہے۔ اس لئے اور بھی کہ ولؔی نے حُسن کے بیان میں بڑی فیّاضی دکھائی ہے۔ اور چونکہ یہ عشق مجاز کی منزلوں سے ہوکر حقیقت کی بلندیوں تک چلا گیا ہے۔ لہذا ان کے جذبۂ محبت کی یہ بوقلمونی وسیع تر ہوکر تصوّف کی روایت سے جا ملی ہے۔ گویا یہ کہ ولؔی کا یہ جذبۂ محبت وسعت اختیار کر کے مسلکِ تصوّف کا عشق بن گیا ہے۔

ولؔی کے یہاں عشق حقیقی اگر ایک فلسفے کی صورت اختیار کر گیا ہے تو اِس کی ابتدائی شکل عشقِ مجازی ہی سے تیار ہوئی ہے۔ کیوں کہ مجاز ہی عشق کی پہلی منزل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں مجاز کا پَرتَو حقیقت پر غالب نظر آتا ہے۔ یوں بھی مجازی پہلو میں ولؔی کا محبوب کوئی فردِ واحد نہیں بلکہ ہر وہ انسان ہے جو ولؔی کے محبوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس میں اُنھیں حُسنِ ازل کا پرتو نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اگر ایک طرف محبوب کی بھویں مسجد کی محراب اور قبلہ گاہیں نظر آتی ہیں تو دوسری جانب محبوب کا خوبصورت چہرہ مسجد اور اس کے چہرے پر نظروں کا طواف عشق کی نماز تصوّر کرتے ہیں۔ یوں ولؔی کے کلام کے عاشقانہ مضامین اپنی جو تڑپ دکھلاتے ہیں دراصل وہ اسی ''جزو'' (محبوب) سے متصل ہوکر یا اس کے عشق میں خود فراموش ہوکر اپنے معبودِ حقیقی ''کُل''

یعنی خدا کی ذات میں متصل ہوجانا متصور کرتے ہیں۔ وؔلی کے اشعار کے باطن میں مجاز کا پردہ اُٹھاکر دیکھیں تو تمام اصطلاحات، تلمیحات، مضامین، واردات، جذبات وغیرہ عشقِ الٰہی میں شدت کا ہی اشاریہ ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جہاں اُنھوں نے تصوّف کو تغزل کے رنگ میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ مجاز و حقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مجاز و حقیقت کی دوئی بھی ختم ہوئی ہے۔

باب پنجم (الف) :- وؔلی کا سفرِ دہلی

وؔلی نے اپنی زندگی میں مختلف مقامات کے سیر کی ہے۔ لیکن ان کے سفر دہلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اسی سفر میں شاہ سعداللہ گلشؔن سے ملاقات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اور ان کی شاعری میں تغیر اور لسانی تبدیلیوں کی وجہ بھی یہی سفر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق یہ حقیقت ضمنی ہے۔ کیوں کہ سولہویں صدی کا آخری حصّہ سرزمین دکن کے لیے نہایت پُر آشوب رہا ہے۔ انتشار، بدامنی اور افراتفری کے اس دور میں دکن کے تقریباً تمام حکمراں جو شیعہ مسلک سے متعلق تھے، اپنی اپنی حکومتوں کی بقا کے لئے سرگرم تھے۔ لہٰذا بے سکونی عام تھی جب کہ شمالی ہند (دہلی) میں قدرِ اطمینان کا ماحول تھا۔ وؔلی کے سنی العقیدہ ہونے کے سبب دکن کی ان شیعہ حکومتوں کے درباروں تک رسائی حاصل کرنا بھی اُن کے لیے مشکل تھا، نیز ان حکومتوں کے سلاطین، مقامی رؤسا اور امراء وغیرہ نے بھی شعوری طور پر وؔلی کی شاعرانہ لیاقتوں کو نظر انداز کیا۔ اور چونکہ دستور کے مطابق شاعری کے لیے موزوں طبیعت رکھنے والے لوگوں کے لئے شعروسخن ہی ذریعۂ معاش تھا۔ لہٰذا کوئی دوسرا کام کرنا گویا اپنے مرتبے سے گری ہوئی بات تصوّر کی جاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ہر زمانے میں ''ملک الشعراء'' کا عہدہ درباروں میں قائم رہا اور باقاعدہ طور پر شعراء کا تقرر کرکے انھیں خطابات سے نوازا جاتا رہا۔ اسی طرح بعض امراء، رؤسا اور جاگیرداروں کے یہاں بھی شعراء کی سرپرستی ہوتی رہی اور ماہانہ وضائف کے ساتھ ان شعراء کی کفالت کی ذمّہ داریاں بھی اُٹھائی جاتی رہی ہیں۔

گویا اس زمانے کے چلن کے مطابق فنِ شاعری کسبِ معاش کا ایک ذریعہ تھی اور جب تک کسی باصلاحیت شاعر کو اپنے شاعرانہ مرتبے کے اعتبار سے کوئی اعلیٰ منصب یا کسی امراء، رؤسا یا جاگیردار کی سرپرستی میسّر نہ ہوتی وہ اسی کوشش میں سرگرداں رہتا تھا۔ وؔلی کو چوں کہ اپنے دور میں ایسا کوئی منصب یا عہدہ نہیں ملاتھا اور شاہانِ دکن شیعہ واقع ہوئے تھے۔ لہٰذا وؔلی کی طرف ان کا تغافل ہی ان کے دیگر مقامات کی طرف رجوع ہونے کا جواز بنا، اور انھوں نے اپنی نگاہیں بادلِ ناخواستہ شمالی ہند (دہلی) کی طرف مرکوز کیں۔ اور دکن میں اپنی کس مپرسی سے عاجز آکر وؔلی نے ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا۔

اس سفر کے آغاز میں وہ اپنے وطن اورنگ آباد سے نکل کر احمد آباد آئے اور اپنے دیرینہ دوست اور رفیق سفر سیّد ابو المعالی کے ہمراہ دہلی کی راہ لی۔ حالانکہ دہلی میں وؔلی کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ لیکن سیّدابوالمعالی کے بہت سارے اقرباء دہلی میں موجود تھے۔ لہٰذا ان کو ساتھ لے کر آنے کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ یہاں پہنچ کر سیّد ابو المعالی کے طفیل فارسی کے مشہور شاعر ''شاہ سعد اللہ گلشنؔ'' سے ملاقات کی۔ تاہم ان کا یہ سفر دہلی اپنی فنِ شاعری کے ذریعہ معاش کی تلاش پر ہی مبنی تھا۔ لہٰذا اُسے کسی طرح بھی محض صرف وؔلی کی سیاحی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ اور چوں کہ شاہ گلشنؔ دہلی میں فارسی کے معتبر شعراء میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے توسط سے کسی اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے کی وؔلی کو خاطر خواہ امید تھی۔ گویا اپنے اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے وؔلی نے سفرِ دہلی کی صعوبتیں برداشت کیں اور شاہ گلشنؔ تک رسائی بھی انہی مقاصد کی تکمیل تھی۔

بابِ پنجم (ب) :- وؔلی اور شاہ سعد اللہ گلشنؔ

وؔلی کی شعر گوئی کی بے پناہ مقبولیت اور ہمہ گیر اثرات کے پیدا ہونے کی بنیادوں میں شاہ سعداللہ گلشنؔ کی ملاقات اور مبینہ مشورت کا خصوصی طور پر ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے اردو ادب میں شاہ گلشنؔ کی خصوصی اہمیت رہی ہے کہ ''انھوں نے وؔلی کو اردو (ریختہ) میں شعر گوئی کا مشورہ دیا'' اور اُس مبینہ مشورے پر عمل پیرا ہونے کے بعد وؔلی کی شاعری کا رنگ، لب ولہجہ اور طرزِ ادا تبدیل

ہوا۔ ولؔی اور شاہ گلشن کے اس مبینہ مشورے کا خیال اردو ادب میں بہت عام ہو چکا ہے۔ لہذا ولؔی کی شاعری میں پیدا ہوئی لسانی تبدیلیوں اور ولؔی کی روشِ خاص اور اختراعاتِ شعری کو اسی مبینہ مشورے کے تناظر میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔

اس زمانے میں فارسی کے بلند پایہ شاعر اردو میں کم دلچسپی لیتے تھے خصوصاً اردو ادب اور شاعری کی طرف اُن کا رجحان بہت کم تھا۔ گویا اردو میں شعر گوئی کا تو کوئی تصوّر ہی نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال بھی معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا یہ تسلیم کر لینے کے لئے ذہن آمادہ نہیں کہ کسی فارسی استاد کے سامنے کسی اردو شاعر (نو مشق سخن) نے زانوئے تلمذ طے کیا ہو، اور صرف ایک واحد ملاقات کسی شاعرانہ خیالات کو بدلنے کے لئے کافی نہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کہ ولؔی نے شاہ گلشن سے دہلی میں ملاقات کی اور کچھ وقت ان کے یہاں قیام بھی کیا۔

دراصل ولؔی کی شاعری میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کی وجوہات یہ رہی ہیں کہ اورنگ زیب کی مستقل معرکہ آرائیوں کے پیشِ نظر جو اس نے مہماتِ دکن میں صرف کیے، اس کی بدولت کثیر تعداد میں افواج شمالی ہند سے دکن کو روانہ ہوتی رہیں۔ لہذا شمالی ہند کی تہذیب ان افواج کے ذریعے مفتوحہ علاقوں تک پہنچیں اور لوگوں سے ہم رشتگی نے دکنی زبان اور تہذیب کو شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر کیا۔ شمالی ہند میں اگر فارسی کا دور دورہ تھا تو وہیں دکن میں اردو پروان چڑھ رہی تھی۔ لیکن جب یہ فاتح اور ظفر یاب فوجیں دہلی واپس ہوئیں تو یہ زبان اردو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ گویا اس ربع صدی میں شمالی ہند اور دکن کے بیچ جو تہذیبی، تمدنی اور لسانی رشتہ قائم ہوا اس نے اردو زبان کو پروان چڑھانے میں گراں بہا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن سترہویں صدی کے ابتداء میں دہلی کی مرکزی مغلیہ سلطنت کے کمزور ہوجانے سے فارسی کے اثر و رفتار میں بھی کمی واقع ہوتی گئی۔ دوسری طرف شمالی ہند اور دکن میں تمام مروجہ اصنافِ شاعری مثلاً : مثنوی، مرثیہ، قصائد وغیرہ ترقی کے بام عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ لہذا ولؔی کے پیشِ نظر وہ سیاسی وسماجی حالات تھے جن کیے زیرِ اثر وہ اردو میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ لہذا ان کی شاعری میں لسانی تغیر اور زبان کی صفائی بھی انہی سیاسی محرکات کا نتیجہ قرار پائے گا۔

شمالی ہند میں فارسی کے بڑے بڑے استاد شعراء کی بدولت جہاں تمام مروجہ اصنافِ سخن ترقی کے مدارج طے کررہی تھیں۔ وہیں دہلی میں اپنی قدر و منزلت بنانے اور یہاں تلاشِ معاش میں آنے کے اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں اگر کوئی چیز معاون ثابت ہوسکتی تھی تو یہ اردو زبان اور اردو غزل تھی جو اُس وقت بطورِ صنفِ شاعری دہلی والوں کے لیے بالکل نئی چیز تھی، لہذا اس پر پیش قدمی کر کے اپنی پہچان بنانے کے مواقع زیادہ روشن تھے۔ انہی اسباب نے ولی کو اردو شعر گوئی کی طرف مائل کیا اور ولی چونکہ گجرات اور دکن کے پروردہ تھے۔ لہٰذا ہر دو تہذیبی اور لسانی ارتباط وانضمام سے ایک الگ راہ بنانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس ضمن میں شاہ گلشن کا مبینہ مشورہ کہ۔۔۔

''فارسی کے بیکار مضامین کو اپنے ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کرے گا''

گمرہ کن طریقے سے رائج ہوگیا، اور تذکرہ نویسوں میں سب سے پہلے میر تقی میر کا ''نکات الشعراء'' (۱۷۵۲ء) منظرِ عام پر آیا۔ جس میں غالباً کسی سمعی روایت کی بناء پر مفروضہ مشورہ کو ضابطۂ تحریر میں لایا گیا۔ حالانکہ ولی کے کلام میں فارسی زبان کی آمیزش، طرزِ ادا اور اسلوب وغیرہ بھی ان کی اپنی فارسی دانی کا نتیجہ تھیں۔ کیوں کہ ولی کے ایک طویل عرصے تک ''مدرسۂ علویہ'' احمد آباد (گجرات) میں تحصیل علم حاصل کیا تھا اور چونکہ اس زمانے میں ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم فارسی اور عربی زبانیں ہی ہوا کرتی تھیں، اور ولی نے انہی زبانوں میں علم حاصل کیا تھا۔ لہذا ولی کی فارسی دانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ان تمام بیانات کے مدِ نظر ولی کے متعلق مذکورہ مشورہ کسی مخصوص تغیراتی اہمیت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بابِ ششم :- ماحصل

اس تحقیقی مقالے میں ولی کی سوانح اور شخصیت اور ان کے کئی کارناموں سے متعلق جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ولی نے صنفِ غزل کو خصوصی طور پر اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور اس اظہار میں انھوں نے اپنی جدّت طبع اور اختراعاتِ نو سے غزل کے تنگ دامن کو اتنا وسیع اور ہمہ گیر کردیا کہ ہر طرح کے خیالات پیش کرنے کی اس میں گنجائش پیدا

ہوگئی، اور اتنا ہی نہیں انھوں نے غزل کو فارسی کے سحر سے آزاد کر کے دکنی اور عجمی روایات کو ملا کر زبان کا ایسا خوبصورت امتزاج پیش کیا کہ اس انضمام سے اردو ادب کی ایک نئی روایت وجود پذیر ہوئی۔ چنانچہ اس دور کے دیگر شعراء بھی جو غزلیہ شاعری سے خاص شغف نہیں رکھتے تھے، وہ بھی اردو غزل گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔ یہی بنیادی وجہ تھی جس نے ولیؔ کی شہرت کو فلک پیا بنادیا۔

ولیؔ کا دورنہایت انتشار پذیر اور بدامنی کا شکار رہا تھا، لیکن اس کے باوجودیکہ شعروسخن کی محفلیں آباد رہیں۔ اس دور میں گجرات علم و ادب کا گہوارہ کہا جاتا تھا، اور یہاں کے دو مدارس ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ ان میں سے ایک جو ''مدرسۂ علویہ'' کے نام سے معروف تھا، اِس مدرسہ کی بنیاد حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علویؒ (۱۵۰۱ء تا ۱۵۸۹ء) نے ۱۵۲۶ء میں رکھی تھی۔ اِس مدرسہ میں دار الاقامت کا بھی انتظام تھا، یہی ولیؔ کی قیام گاہ قرار پایا۔ یہیں ولیؔ نے ایک طویل عرصے تک تحصیل علم کیا۔ بعد ازاں اپنے مولدومسکن اورنگ آباد لوٹ گئے۔ باوجودیکہ ولیؔ کی ذہنی تربیت میں گجرات کا اہم رول رہا، لہذا یہاں کی زبان وتہذیب سے محبت اور عقیدت فطری بات تھی۔ لہٰذا جب ولیؔ نے شعر گوئی کا آغاز کیا اور'' قطعہ درفراقِ گجرات'' اور'' مثنوی درتعریف سورت'' کے تانے بانے بُنے، نیز یہاں کے اپنے مرشد کی شان میں قصائد بھی پیش کیے تو اس کے درپردہ محبت وعقیدت کا یہی جذبہ موجزن تھا۔

ولیؔ جب سنِ شعور کو پہنچے تو اپنی سخن گوئی کو ذریعۂ معاش بنانے کی خاطر دہلی روانہ ہوئے۔ کیوں کہ دکن میں اُس زمانے میں تمام حکمراں شیعہ واقع ہوئے تھے، اور چوں کہ ولیؔ سنی العقیدہ تھے۔ اس لیے ان درباروں اور حکمرانوں نے ولیؔ کی جانب سے شعوری طور پر تغافل برتا، اس لیے ولیؔ نے لامحالہ دہلی کی طرف رجوع کیا۔ جہاں سنی العقیدہ حکمراں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ یہاں شاہ گلشنؔ سے ملاقات ہوئی اور کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ولیؔ اپنے دیار لوٹ آئے۔ لیکن دہلی کے سفر سے جو تجربہ لے کر لوٹے تھے ان تجربوں کو بروئے کار لاکر اپنی شاعری میں بڑی تبدیلیاں پیدا کیں، جو اُس وقت کے سیاسی حالات اور ماحول کا نتیجہ تھی۔ اور جب ۱۷۱۹ء میں ان کا دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے شعراء میں اپنی زبان کی تئیں محبت کا جذبہ بیدار ہوا، اور ہر شخص نہ صرف اردو شاعری

کا بلکہ ولی کا بھی دلدادہ ہوگیا۔ حتی کہ محفلِ سماع، قوالوں کی محفلوں اور فقیروں کی صداؤں میں بھی ولی کا کلام گونجنے لگا۔ گویا ولی کی اس مقبولیت کا ابر ایسا چھایا کہ اس کے بعد کی کئی دہائیوں تک صرف ولی کے نام کا تخلص ہی لوگوں کی زبان پر ورد کرتا رہا۔ لیکن اس کا منفی اثر یہ ہوا کہ شہرت کے اس شور میں ولی کی شخصی اور خانگی زندگی پسِ پُشت جا پڑی۔

یہی سبب ہے کہ ولی کی وفات کے پندرہ تا چالیس برس بعد جب تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا تو اردو غزل میں ولی کو بنیاد گزار کی حیثیت سے تو ضرور پیش کیا گیا، لیکن ولی کے سفرِ گجرات اور دکن کے متعلق ولی کے بعض اشعار کو بنیاد بنا کر بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں ''ولی دکنی'' اور بعض نے ''ولی گجراتی'' لکھا۔ اور ولی کی شخصی زندگی کی تلاش و تحقیق میں چوں کہ یہ تذکرے اوّلین مآخذ تھے، لہذا ان کے متضاد بیانات نے ولی کو ''گجرات'' اور ''دکن'' کی سرحدوں میں منقسم کردیا۔ یہ انقسام اگر کسی معمولی شخص کا ہوتا تو اور بات تھی، لیکن ولی جیسی عظیم ادبی شخصیت کا تھا۔ لہٰذا محض علاقائی برتری کا بھرم قائم کرنے کے لئے ولی کو اُن کی شاعرانہ عظمت کے پیشِ نظر اپنے اپنے صوبوں سے منسوب کر دیا گیا۔ چنانچہ **''ولی ہمارا شاعر ہے''** کے دعوؤں کو سچ ثابت کرنے کے لئے ایک تحریری ادبی معرکہ آرائی شروع ہوگئی، اور محققن کی تمام توجہ ولی کی وطنیت کے باب میں الجھ کر رہ گئی، اور وہ ادبی کام جو ولی کی دیگر شعری اور فنی صلاحیتوں پر ہونا چاہیئے تھا، التوا میں پڑ گیا۔ اس طرح گویا ولی کی شخصیت ادبی سیاست میں الجھ کررہ گئی۔

ولی کی شخصیت کو مجروح کرنے میں سب سے اہم کردار تذکرہ نویسوں کا رہا ہے چوں کہ انھوں نے بغیر تحقیق کے ان کے نام اور وطنیت کو خلط ملط کر کے پیش کیا ہے۔ ولی کا گجرات کے شہر ''احمد آباد'' میں تعلیم حاصل کرنا اور پھر ''قطعہ درفراقِ گجرات'' اور ''مثنوی در تعریفِ سورت'' کی تخلیق کے باعث گجرات کے دانشوران انھیں ''گجراتی'' مانتے رہے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف ولی نے اپنے کلام میں بعض اشعار ایسے کہے ہیں جس کے ذریعہ اُنھوں نے خود اپنے حقیقی وطن ''دکن'' کی گواہی دی ہے۔ ایسی حالت میں تذکرہ نویسوں کو جو باتیں زیادہ صحیح معلوم ہوئیں انھوں نے نقل کردیں۔ اسی طرح ''ولی کا سفرِ دہلی'' اور شاہ گلشن سے ملاقات کے متعلق بھی بہت سی غلط فہمیاں راہ پا گئیں۔

اس اعتبار سے کہ ولیؔ جہاں بحیثیت شاعر ایک اہم شخصیت کے حامل ہیں، وہیں ان کی شخصی زندگی مختلف متنازعات میں گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس تنازعہ کی بنیادی وجوہات بھی کچھ ایسی ہی رہی ہیں کہ قاری ان کو پڑھ کر مشکوک ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ اوّل تو ولیؔ کی متنازع فیہ شخصیت میں سب سے تشنہ نقطہ ان کی وطنیت کا ہی ہے۔ اس لیے اور بھی کہ ولیؔ پر قلم اٹھانے کی کوشش کرنے والے بعض حضرات نے شعوری طور پر ولیؔ کو نظرانداز کیا اور ان پر قلم اُٹھانے سے احتراز کیا، کہ ان کی اپنی شخصیت اس خارزار میں الجھ کر نہ رہ جائے، اور وہ ناحق تنقیدوں کا شکار نہ ہوں، اور دوسری لیکن سب سے اہم بات یہ رہی کہ میرتقی میرؔ نے اپنے تذکرے ''نکات الشعراء'' میں جو شمالی ہند کے تذکروں میں اوّلیت رکھتا ہے، ولیؔ کے متعلق شاہ گلشنؔ کے مبینہ مشورے کو پہلی بار تحریری شکل دی ہے۔ جس سے ولیؔ کے مرتبہ کو یقینی طور پر ٹھیس لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کے بعد کے شعراء مثلاً : حاتمؔ، آبروؔ، ناجیؔ، وغیرہ نے ولیؔ کی استادی کا اعتراف تو ضرور کیا لیکن عجب طرح کی گومگو کی کیفیت کے ساتھ۔ یہ دو نکات ایسے رہے ہیں جس نے ولیؔ کی شاعرانہ عظمت کو مجروح کیا اور اس کے باوجود کہ اردو شاعری میں ولیؔ کی گراں مایہ خدمات کے عوض اُنھیں ہمیشہ یاد کیا گیا۔ میرؔ کا یہ کارنامہ اِس لحاظ سے اہم ہے کہ اُس نے اِس مسئلہ کو ادبی مسئلہ بنادیا اور غور وفکر کی راہیں بھی کھل گئیں۔

راقم الحروف نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ولیؔ کی شخصی زندگی اور ان سے وابستہ متنازعات نیز شعری وفنی خصوصیات کے عوض ان کی شاعرانہ حیثیت کے تعین میں اپنے جذبات کو نہ آنے دوں، اس لیے ان سے منسلک مخالف اور موافق بیانات کو مدِ نظر رکھ کر جو بھی نتائج سامنے آئے ہیں ان کو بے کم وکاست پیش کردیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ موضوع کا پورا حق ادا کرنے میں مجھ سے بھی چوک ہوگئی ہو، تاہم مجھے یقین ہے کہ اس مقالے کے ذریعے ولیؔ کی شخصیت اور شاعری سے متعلق غور وفکر کی نئی راہیں کھل سکیں گی۔ انشاء اللہ۔

مسیح الزماں انصاری

تاریخ : ۲۲/ستمبر ۲۰۰۶ء